ناظورۂ اردو

مجموعۂ مضامین اردو

آقائے اردو

ایم فرمان علی بک سیلر لاہور

ناظورۂ اردو

امیدواران امتحانات ادیب، ادیب عالم،
وادیب فاضل کے لئے
مرتبہ

آقائے رازی

"ناشر"

م فرمان علی بک سیلر پبلشر موہن لال روڈ لاہور

قیمت -/8/2

(ایم فرمان علی پبلشر نے انڈین پرنٹنگ ورکس کچہری روڈ لاہور سے چھپوا کر شائع کیا)

فہرست مندرجات

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ
۱	سفر وسیلۂ ظفر	مولینا عبدالحلیم شرر	۳
۲	تعلیم نسواں	رشید احمد ایم اے	۱۰
۳	برسات	مولینا شرر	۱۵
۴	اُمید	" "	۲۲
۵	فنون لطیفہ	مرزا سلطان احمد	۲۷
۶	حالی کی شاعری	پروفیسر حسرت نعمانی	۳۳
۷	خموشی گفتگو ہے بیزبانی ہے زباں میری	مولینا شرر	۵۵
۸	تہذیب اخلاق	.. ..	۶۱
۹	رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات	سر سیّد	۷۴
۱۰	جوش ملیح آبادی کی شاعری		۸۸
۱۱	اردو، ہندی	مولینا شرر	۱۰۷
۱۲	فلسفۂ حسن	مرزا سلطان احمد	۱۱۴
۱۳	ہندو مسلم اتحاد	مولینا عبدالماجد دریابادی	۱۲۶

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ
۱۴	اردو افسانوں کا مستقبل	پروفیسر عبدالقادر سروری	۱۳۶
۱۵	گوشۂ عافیت	مولانا شرر	۱۴۷
۱۶	ادبیات اردو اور تنقید نگاری	پروفیسر محی الدین زور	۱۵۹
۱۷	علامہ راشد الخیری کی ناول نگاری	اویس احمد ادیب ایم اے	۱۷۱
۱۸	علامہ راشد الخیری کی انشاپردازی پر ایک نظر	حامد علی خاں بی اے	۱۹۵
۱۹	ہماری علمی درسگاہوں کا غلط نقطۂ نظر	نامعلوم	۲۱۱
۲۰	جنگ کے فوائد اور نقصانات	مولانا ذکاء اللہ	۲۲۷
۲۱	قومی زبان	علامہ مودودی	۲۴۴
۲۲	حفیظ جالندھری کی شاعری	پروفیسر عبدالقادر سروری	۲۵۵
۲۳	محبت پر ایک اجمالی تبصرہ	عبدالباقی جیراجپوری	۲۶۱
۲۴	اپنی مدد آپ	سرسید	۲۷۱
۲۵	اکبر الہ آبادی کا رتبۂ شاعری	" " "	۲۸۴
۲۶	یاران وطن	محمد نواب علی برق سندیلوی	۲۹۴
۲۷	ہماری زبان کے نام	" "	۳۰۴
۲۸	فلسفۂ تصوف	علامہ شبلی نعمانی	۳۱۵
۲۹	اشتراکی زندگی	" " "	۳۳۶

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ
۳۰	منظر گورستان	〃 〃 〃	۳۴۳
۳۱	حیات اور موت	شاہ محمد نذیر ہاشمی	۳۴۹
۳۲	اخوّت و مساوات	مولانا عبدالحامد قادری	۳۶۱
۳۳	اقبال کی شاعری پر قیام یورپ کا اثر	مسٹر ممتاز حسن ایم اے	۳۶۹
۳۴	کلام اقبال کی ادبی خوبیاں	محمد اکبر خان بی اے	۳۷۹
۳۵	جہد حرّیت	مترجمہ اشرف صبوحی	۳۹۲
۳۶	حقیقت وطنیّت	〃 〃 〃	۳۹۷

پیش لفظ

فن مضمون نگاری کی اہمیّت سے انکار نہیں ہو سکتا بیکن کا قول ہے :-
" مطالعہ انسان کی تکمیل کرتا ہے، مباحثہ مستعدی بخشتا ہے اور تحریر حقیقی معنوں میں انسان بناتی ہے "۔

لیکن یہ فن جس قدر اہم اور ناگزیر ہے اس سے زیادہ مشکل اور عسیر الحصول بھی ہے یہی وجہ ہے کہ امتحانات السنہ میں مضمون نگاری کو ہمیشہ نمایاں درجہ حاصل رہا ہے۔

زبان اُردو کے اعلیٰ امتحانات کے لیے مضمون نگاری کے متعلق اس وقت تک صرف چند کتابیں معرضِ تحریر میں آئی ہیں۔ اور اگر دقّتِ نظر سے کام لیا جائے تو ہم ان کے وجود پر عدم کو ترجیح دے سکتے ہیں کیونکہ ان میں طلبار کی حقیقی ضروریات کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ انہی خیالات سے متاثر ہو کر ہمیں "ناظورۂ اُردو" کی اشاعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"ناظورۂ اردو" اگر منتخب مضامین کا مجموعہ ہے مگر اس میں طلبہ کے معیار اور ان کی امتحانی ضروریات کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

۱۔ مضامین میں پورا پورا تنوع پایا جاتا ہے۔ سلاست زبان اور پاکیزگی خیالات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔

۲۔ تمام مضامین مستند اہل قلم حضرات کی کاوش فکری کا نتیجہ ہیں۔

۳۔ طلباء کے امتحانی معیار کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

۴۔ اکثر مضامین امتحانات میں بارہا آچکے ہیں۔ اور باقیوں کے آنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔

غرض یہ کتاب ہر اعتبار سے طلباء کے لئے مفید ثابت ہوگی اور امتحان میں ان کی کامیابی کی ضامن۔

آخر میں ان حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے رشحات افکار سے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں استفادہ کیا گیا ہے۔

مضامین

پنجاب آرٹ پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوردھن داس کپور ایم اے پرنٹر و
ایم فرمان علی پبلشرز نے چھپوا کر شائع کیا ۔

سفر وسیلہ ظفر

ہم کسی الوالعزم دنیا کے نیک نام مسافر کی لائف (سوانحعمری)
دیکھ کر حیرت میں آجاتے ہیں جو ایک نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوا
تھا۔ اس کے خاندان کے تذکرے دلچسپی اور سربرآوردگی سے بالکل خالی
تھے بلکہ خود وہ ایک ایسا شخص ہو گیا کہ اس کی حالت کسی خاص خاندانی پارٹی
کو وقعت و عزت حاصل کرانے کی حد سے اس درجہ تک بڑھ گئی کہ تمام روئے
زمین کی آبادی ایک اعلیٰ درجے کی قوت بشری کو اس کی مضبوط ہمت اور
اس کے بشاش چہرے سے ظاہر ہوتے دیکھ کر اسے سرمایہ افتخار سمجھنے
لگی۔ اس کی کامیابیاں زمانے کو چونکا کر بتانے لگیں کہ انسان کا بھروسہ
ان چھوٹے اور کمزور ہاتھ پیروں پر ترقی دینے سے کس درجے وسیع ہو
سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ نیک نامی اور ساری دنیا کی عزت اور بزرگی کو
اس کے قدموں سے بہت کچھ مدد ملی ہوگی۔ اور یہ بھی دعویٰ کر کے ہم کہہ
سکتے ہیں۔ کہ جن استدلالات سے انسان تمام مافی الکون پر شریف اور
واجب التعظیم ثابت کیا جاتا ہے انہی سے ایک اعلیٰ درجہ کی مضبوط دلیل

وہ بھی ہو گی جو اس حوصلہ مند مسافر کی سوانحعمری سے استخراج کی گئی ہے گو اس کے نقش قدم بھی بعد میں آنے والے ہجوم خلائق کے پیروں نے مٹا کر رکھ دیئے مگر نہیں، اس نے اپنا نقش قدم تواریخ کے ان مبارک صفحوں پر جما دیا ہے جن پر زمانے کی عمر کا پورا حال لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا ہے، اور ہمیشہ تک لکھا جائے گا - اور جو شہیدان قوم کے ایسے گنج شہیداں ہیں جس میں وہ ہمیشہ زندہ موجود رہیں گے - اور نسل انسان کے عام لائق لوگ ان سے اپنی طبع آزمائی کی نظریں چراتے رہیں گے۔ اس اولعزم مسافر سے ہماری مراد کولمبس ہے جس نے پہلے پہل امریکا کا پتہ لگایا تھا -

یہ حوصلہ مند عالی ہمت شخص جس کی نسبت ہماری ہندوستانی اصطلاح کے موافق کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے تئیں زمین کا گز بنا دیا تھا بچپن ہی سے سفر کا ایک شائق نہیں عاشق تھا۔ جب اس کا جہاز سمندر میں چلا جاتا تھا اور لوگ راہ کے پانی اور خشکی کا سراغ نہ لگنے سے مایوس ہو کر بدحواس ہو رہے تھے اس وقت یہ مارے خوشی کے پھولا نہیں سماتا تھا - یہ دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آج اس کی آرزو پوری ہوئی -

ایشیا کے مغربی حصہ ملک عرب کی یہ مثل مشہور ہے کہ وہ کہا کرتے تھے "السفر وسیلۃ الظفر" ان کا یہ مقولہ گو کہ نہایت درجہ صحیح تھا۔ مگر اور کسی قوم نے سفر کے ذریعے سے ایسی کامیابی حاصل نہ کی ہو گی جیسی کہ ان

لوگوں نے حاصل کی۔ ان کے سفر عالم میں اس امر کی بہت بڑی نظیر ہو گئے کہ انسان خواہ کیسی ہی افلاس اور ذلت کی حالت میں ہو مگر جب وہ اولوالعزمی کے ساتھ سفر شروع کر دیتا ہے اور غریب الوطنی کے تمام مصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل جاتا ہے تو وہ نہایت بیش بہا کامیابی حاصل کرتا ہے۔

اہل عرب کے سفر جس پریشانی کے ساتھ ہوئے ان کی مثل دنیا میں ہرگز نہ واقع ہوئے ہونگے پہلے پہل جب وہ سواحل عرب کو طے کرنے نکلے تھے اس وقت ان کو دو دو روز میں ایک ایک خرما نصیب ہوتا تھا جو ان کا قوت تھا۔ جب بلاد شام پر وہ پہنچے تھے ان کے پاس خیمے ڈیرے کی قسم سے کوئی سامان نہ تھا تمام مصیبتیں انہوں نے اپنے سر پر لیں برف کو وہ اپنے سروں پر روکتے تھے جن قوموں کا مقابلہ تھا ان کو ابتدا ہی میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ لوگ مصائب سفر کو اس بے سروسامانی کے ساتھ ہرگز نہ برداشت کر سکیں گے بالخصوص برف کے بالکل نہ متحمل ہو سکیں گے ہم کو ان سے مقابلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آسمانی بلائیں جو ہماری مددگار بن کر ان کے سروں پر نازل ہونگی۔ وہ جلد ان کے قدم اکھاڑ دیں گی یہ خود بخود بھاگ جائینگے۔ مگر اس جفاکش قوم نے ہرگز اس کا خیال نہیں کیا بلکہ نہایت استقلال اور محنت کے ساتھ چھ چھ مہینے تک ان لوگوں کو گھیرے رہی کچھلی

لڑائی جو پاک شہر بیت المقدس کے واپس لینے کے لئے تمام اہل یورپ اور مسلمانوں سے ارض فلسطین پر ہوئی تھی۔ گو اس میں یورپینوں کو کامیابی نہیں ہوئی مگر ان کی ترقی کا پہلا زینہ وہی واقعہ تھا، کیونکہ یورپین مؤرخین خود معترف ہیں کہ اس لڑائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اہل یورپ ایشیا والوں سے ملے اور ان کو سفر کی عادت پڑی اور تجارت کا سلسلہ بھی ان لوگوں میں شروع ہو گیا۔

ہمارا خیال ہے کہ سفر کی خوبیاں اس سے بڑھ کر اور کسی طریقے پر ہرگز نہیں بیان کی جا سکتیں کیونکہ یہاں یہ بات وضاحت کے ساتھ ثابت ہو گئی کہ سفر ایسی چیز ہے جس میں اگر ناکامی حاصل ہو تو بھی کوئی نہ کوئی دلچسپ فائدہ ضرور ہاتھ لگتا ہے۔

ہم اپنے ملک کو (جو ہم وطنوں کو ایسی بیجا محبت کے ساتھ پسند ہے، کہ کبھی اس کو ترک کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور کبھی ان کا جوش الفت سے بھرا ہوا دل اس کی مفارقت کو گوارا نہیں کرتا) ایک بہت بڑی دلگیر دولت فرض کرتے ہیں جو کبھی ہاتھ سے نہ دی جائے مگر اس کے ساتھ ہی یہ کہنا نہایت درجے ضروری ہے کہ یہ دولت کن لوگوں کے ہاتھ میں رہی، یقیناً یہ بیش قیمت اور قابل عزت بلکہ عزت حاصل کرانے والی دولت ہمیشہ چند مسافروں کے ہاتھ میں رہی جو کبھی کبھی فتح کر کے چلے گئے اور اکثر اس کو اقامت گاہ قرار دے

اسی جگہ سکونت پذیر ہو گئے آرین مقدس جماعت نے اس کو فتح کیا اور اس کے حاکم ہو گئے حکومت کے ساتھ انہوں نے اسے اپنا وطن بھی بنا لیا، اور پھر جب دوسرا دور شروع ہوا اسلامی فاتح قوم نے ابتداءً ایک بالکل غیر مانوس ملک کی مسافرت اختیار کر کے اس دولت کو اپنے قبضہ میں کر لیا کچھ دنوں یہ لوگ مسافر ہی بن کر حاکم رہے پھر یہیں سکونت پذیر ہو کر اس ملک کے باشندے قرار پا گئے اب تیسرا دور شروع ہوا اور برٹش فاتحوں نے سب سے بڑا عظیم الشان سفر اختیار کر کے اس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا جو آجتک مسافر ہیں اور جنہوں نے ہندوستان کو ابھی تک اپنا وطن قرار دینے کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔

بہر تقدیر ہندوستان ہمیشہ غیر قوموں ہی کا محکوم رہا بلکہ ہمیشہ بڑی عزت کے ساتھ اولو العزم اور عالی ہمت مسافروں کی میزبانی کرتا رہا۔ سب سے بڑھ کر عجیب وغریب اور حیرت پیدا کرنے والا وہ خیال ہو گا جو اب میں بیان کرونگا۔ اور جو اس وقت ہندوستانیوں کے ذہن نشین نہیں مگر ان کی حالت سے ظاہر ہو رہا ہے یہ لوگ جو سفر کو نہایت ہی برا اور غیر قابل قدر اور بیفائدہ خیال کرتے ہیں جب اس ملک کے باشندے ہیں جو ہمیشہ مسافروں کو عزت کی سند پر جگہ دیتا رہا ہے تو ان سے بڑھ کر کون حیرت انگیز قرار پا سکتا ہے اگر اہل عرب وغیرہ جو سوائے ایک وقت کے ترقی آمیز پھیلاؤ کے ہمیشہ اپنے ملک

ہی میں رہا کیے اور چین کے ملک نے غیر قوموں کو اپنے وہاں بہت کم جگہ دی
تو چنداں بعید نہیں کیونکہ وہ ہمیشہ وطن دوستی اور اقامت وطن کے پابند ہے
اگر نکلے بھی تو دہی نکلے کوئی دوسرا ان کی سرزمین پر عزت کے ساتھ نہ آسکا۔
مگر ہمارے اہل وطن اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہاں ہمیشہ وہی قومیں
جو مسافر بن کر آتی تھیں بڑی عزت کے ساتھ رہیں۔ لیکن اس پر بھی وہ نہیں
سمجھتے کہ سفر کیسی بیش قیمت چیز ہے۔

مسلمان اگر اپنے اس دینی مرکز کی طرف رجوع کریں جو ان کی شریعت کا
مبدا ہے اور جس سے خدا کا مقدس قرآن مجید مراد ہے تو ان کو بخوبی معلوم
ہو جائیگا کہ کیسی نادر اور عمدہ چیز ہے قرآن بتا رہا ہے کہ "سیروا فی الارض"
یعنی زمین کی سیر کرو۔ اصول شریعت پر اگر ہم غور کریں تو شاید یہ آیت فی
نفسہ اپنے ظاہری حکم سے ہم کو سفر کرنے کی اجازت ہی نہیں دیگی بلکہ سفر
کرنے پر مجبور کر دیگی۔ یہ مسئلہ اصول فقہ کا مسلم ہے کہ امر وجوب پر دلالت
کرتا ہے لہذا "سیر کرو" صیغہ امر کا یہی منشا قرار پائے گا۔ کہ سفر کرنا ہم پر
واجب ہے اور بغیر اس کے ہم گنہگار قرار پائیں گے۔

ہم نے یہ پست ہمتی کو ترقی دینے والی بات ملک میں دیکھی ہے جس کا ظہور
اکثر اوقات انہیں لوگوں کی طرف سے ہوا ہے جو سفر کر چکے ہیں اور ملک میں
تجربہ کار کے لقب سے پکارے جاتے ہیں، وہ لوگ اپنی جفاکشی کی داد خواہی

کے لئے نوجوانوں سے اکثر بیان کر چکے ہیں۔ کہ سفر میں بڑی تکلیفیں ہوتی ہیں انسان طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے خرابی یہ ہے کہ وہ لوگ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ نوجوانوں کی جانب اکثر خطاب کر کے یہ بھی کہا کرتے ہیں۔ کہ سفر کی تکلیفیں آپ لوگ ہرگز نہیں اٹھا سکتے اپنی ناتجربہ کاری سے آپ لوگوں کو بڑے بڑے صدمے پہنچیں گے اس قسم کے امور عموماً نہایت زور دے کر بیان کئے جاتے ہیں اور ان قصوں سے جو ہمارے ملک کے تجربہ کاروں سے سنے جاتے ہیں، عام نوجوانوں کے ولولوں اور حوصلوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ بالکل غلط خیالات ہیں انسان جب سیر کرتا ہے، عام اس سے کہ وہ کس رتبے اور درجے کا ہو اس کو ہزار تکلیفیں پہنچیں اور لاکھ مشقتیں اٹھانا پڑیں مگر وہ خواہ مخواہ اس کے برداشت کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے اگر کوئی شخص فخر یہ بیان کرے کہ میں سفر میں ایسی ایسی مصیبتوں کا متحمل ہوا تو اس کی بہت بڑی غلط فہمی ہے ہم دریافت کرتے ہیں کہ اگر وہ شخص متحمل نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ انسان چاہے کوئی ہو جب مسافرت اختیار کرتا ہے اس وقت اس کو تمام محنتیں اور مشقتیں برداشت اٹھانے میں اپنی پوری ہمت اور جرأت صرف کرنا پڑے گی۔ فی نفسہ سفر کرنا انسان کے لئے ایک فخر کی چیز ہے اور سفر کی تکالیف کا متحمل ہونا اس کی کوئی عزت کی علامت نہیں

کیونکہ یہ اتفاقاً اس پر آپڑی تھیں جن کو برداشت کرنے پر مجبور کر دیا گیا، ہم اپنی قوم سے امید کرتے ہیں کہ وہ ایسی ہمت کو پسپا کرنے والی باتوں کا بالکل خیال نہ کریں گے اور سفر کو اپنی ترقی کا ضرور مبداء سمجھیں گے جس پر ان کے دینی اور دنیاوی طرز معاشرت کے اصول منحصر ہیں۔

تعلیم نسواں

عورتوں کی تعلیم پر اتنا کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے کہ اس میں کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم چونکہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اس لئے مختلف آرا کا استقصا کسی قدر ضروری بھی ہے جہانتک ہم غور کر سکے ہیں ہمیں اس مسئلے کی مخالفت یا موافقت کرنے والے تین گروہ نظر آتے ہیں۔

اوّل وہ جو یہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو تعلیم دینے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ان کا فرض محض گھر کا کام کاج سنبھالنا ہے۔ اس لئے وہ اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالیں یہیں تک اکتفا کرتے تو شاید چنداں مضائقہ نہ ہوتا، عضب تو یہ ہے کہ انہیں تعلیم نسواں کے عنوان ہی سے چڑ ہے ان کا خیال ہے تعلیم سے عورتوں کے چال چلن بگڑ جاتے ہیں وہ غیروں سے ارتباط پیدا کر

لیتی ہیں اور مردوں کی برابری کا دعویٰ کرنے لگتی ہیں۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ خدا نے دل و دماغ اور دیگر اعضا و جوارح میں مرد اور عورت دونوں کو یکساں بنایا ہے اس لئے دونوں برابر ہیں لہذا دونوں کو تعلیم بھی یکساں حاصل کرنی چاہیئے۔ کشمکش حیات میں دونوں کو برابر کا حصہ لینا چاہیئے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے دونوں کو دوش بدوش چلنا چاہیئے۔ اگر مرد اسمبلیوں اور کونسلوں میں پہنچتے ہیں۔ سٹیج پر کھڑے ہو کر تقریر کرتے ہیں قومی کاموں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں تو عورتوں کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔

تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ مرد اور عورت کی جسمانی ساخت میں اختلاف ہے ان کے جذبات اور احساسات میں اختلاف ہے اس لئے ان کے فرائض زندگی میں بھی اختلاف ہے مرد اگر جفاکش اور جسمانی اور دماغی محنت کے قابل بنائے گئے ہیں۔ تو عورتیں ہمدردی اور رحمدلی جیسے اوصاف سے متصف کی گئی ہیں اس لئے گھر کی دنیا عورت کے سپرد کی گئی ہے اور بیرونی دنیا سے مرد کو متعلق کیا گیا ہے اور اگر کہیں صورت حال اس کے برعکس پائی جاتی ہے تو اس میں قصور قدرت کا نہیں خود انسان کا ہے لہذا دونوں کی تعلیم ان کی ضروریات کے پیش نظر ہونی چاہیئے۔

پہلا گروہ زیادہ تر لاعلمی میں گرفتار ہے اور کچھ غلط فہمی کا شکار، اس

لیئے قابل رحم ہے اس گروہ کو یہ بتانا ہمارا فرض ہے کہ عورتیں محض فضول اور بے کار پیدا نہیں کی گیئں جس طرح امور سلطنت میں بادشاہ کے وزیر کا باتدبیر ہونا ضروری ہے اسی طرح امور خانہ داری میں مرد کے وزیر یعنی عورت کا باسلیقہ ہونا بہت اہم ہے اور سلیقے کے لئے علم شرط ہے جاہل عورت اپنی جہالت سے گھر کا ستیاناس کر دیتی ہے نہ حساب کتاب، نہ صفائی اور احتیاط بچے کو تکلیف ہوئی بجائے ڈاکٹر یا طبیب کے کسی "جھو چھک چھو" والے کے پاس پہنچی اوّل تو اس قسم کی خرافات سے افاقہ ہونا ناممکن ہے اور اگر اتفاقیہ گھڑی دو گھڑی کے لئے بچے کو سکون ہو بھی گیا تو اس جاہلہ کے عقیدے کو اور تقویت ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوّل تو بچہ طویل بیماری کے بعد راہیٔ ملک عدم ہوا ورنہ عمر بھر کے لئے ناتواں اور کمزور رہ گیا۔ پھر یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بچے کا سب سے پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ اگر ماں خود جاہل ہو گی تو وہ بچے کو کیا سکھائے گی۔

اب چال چلن کے بگڑنے کو لیجیئے۔ تعلیم کی غرض تو یہ ہوتی ہے کہ عقل آئے تمیز بڑھے، شعور میں ترقی ہو، سمجھ میں اضافہ ہو اگر تعلیم نے اس کے برعکس عمل کیا اور عادات و اطوار اور چال چلن کو بگاڑ دیا تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے طرز تعلیم میں خرابی ہے ہمارے نصاب تعلیم میں نقص ہے نفس تعلیم کا کچھ قصور نہیں پس ہمیں طرز تعلیم کو درست کرنا چاہیئے۔ رہا مردوں کی برابری کا دعویٰ،

تو اگر عورتوں کو ان کے مفید مطلب تعلیم دی جائے تو برابری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسرا گروہ بھی سخت غلطی پر ہے ان لوگوں نے عورت کی ساخت اور اس کی نفسیات پر کبھی غور نہیں کیا ان کا یہ خیال محض غلط ہے کہ عورت کے اعضا وجوارح مرد کے برابر ہیں۔ اگر یہ لوگ تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈے دل اور غائر نظر سے دیکھیں تو انہیں اپنی غلط فہمی کا اعتراف کر لینے کے سوا چارہ نہ ہوگا دراصل انہیں چند کمیاب مثالوں نے بہکا دیا ہے دنیا میں اس قسم کی عورتیں ضرور ہوئی ہیں یا ہونگی جو اوسط دماغ یا اوسط توانائی کے مردوں پر فوقیت لے جاتی ہیں لیکن ایسی مثالیں شاذو نادر ہی ملتی ہیں اور النادر کالمعدوم۔ شاذ کا حکم عام پر نہیں لگایا جا سکتا۔ حقیقت میں تعلیم نسواں کا مسئلہ انہی لوگوں کی بدولت گروہ اوّل کا ہدف ملامت بنا ہوا ہے۔

تیسری قسم کے لوگ یقیناً حق پر ہیں انہوں نے جسمانی اور ذہنی دونوں لحاظ سے مرد اور عورت کا موازنہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں میں جو اختلاف ہے اس سے قدرت کا منشا غالبًا دونوں سے مختلف قسم کے کام لینا ہے اور یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے اسی نتیجے کی بنا پر دونوں کا زیور تعلیم سے آراستہ ہونا ضروری ہے لیکن دونوں کے لئے جدا جدا نصاب ہونگے۔ بالکل ابتدائی منزل میں ممکن ہے دونوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم دینا نامناسب نہو۔

مگر آگے چل کر یعنی آٹھ دس سال کی عمر میں ان کے راستے الگ الگ ہو جائینگے نفسیات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ ان کے احساسات و جذبات، انکے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور کیوں نہ ہو۔ جب کشمکش حیات میں دونوں کے فرائض الگ الگ ہیں تو ان کی تعلیمی ضروریات بھی الگ الگ ہونگی۔ لڑکی کو اس عمر سے تاریخ جغرافیہ اور زباندانی کے ساتھ ساتھ گھریلو حساب کتاب، گھریلو سائنس، حفظان صحت کے اصول، امور خانہ داری یعنی لپکانا رینددھنا، سینا پرونا، دھلائی رنگائی وغیرہ سکھانے کی ضرورت ہے۔ ذرا آگے چل کر اسے جنسی معاملات سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ لہٰذا کچھ مضائقہ نہیں اگر پندرہ سولہ سال کی عمر میں اسے جنسی معاملات، کی تعلیم بھی دے دیجائے اور اس کے ساتھ ساتھ بچے کی نگہداشت، اس کی ضروریات اور کسی قدر طبی تعلیم بھی ہو جائے تو سونے پر سہاگے کی کیفیت پیدا کر دے ایک چیز جو نہایت اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہر منزل پر اسے اپنی مذہبی تعلیم سے بہرہ ور رکھا جائے۔ جو لوگ ذرا بڑی عمر میں پہنچ کر مذہب سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے ماں کو مذہب سے بے بہرہ پایا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ لڑکی کے سامنے مذہب کو خرافات اور لاطائلات کا مجموعہ بنا کر پیش نہ کیا جائے بلکہ سیدھے سادے اصول مذہب جو اچھی زندگی بسر کرنے میں اس کے ممد و معاون

ہوں وہ اسے سکھائے جائیں۔ غرض یہ ہے کہ لڑکی کو اس قسم کی تعلیم دی جائے کہ وہ والدین کے گھر میں اچھی بیٹی اور بہن، میاں کے گھر میں اچھی بیوی اور ماں بن سکے۔

عورتوں کی تعلیم کے بارے میں اکبر الہ آبادی کا یہ شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

برسات

کس قیامت کا موسم ہے! ہمارے رنگین مزاج شاعر غالب نے ایک موقع پر مناجات کرتے کرتے جوش میں آ کر جنت اور موعود باغ فردوس پر نکتہ چینی شروع کر دی، اور سب باتیں تو خیر مگر اس نکتہ چینی میں یہ کس قدر چبھتا ہوا مصرعہ لکھ دیا ہے ع

سیہ مستیٔ ابر و باراں کجا

واقعی اگر جنت میں یہ لطف ابر و باراں نہ ہوا تو شراب طہور سے نفرت ہو جانا در کنار وہاں کسی زندہ دل کا دل ہی نہ لگے گا۔ لیکن ہم اطمینان

دلاتے ہیں کہ غالب کو چاہے نہ یقین آیا ہو مگر ہمارا دل تو گواہی دیتا ہے کہ وہاں یہ برسات کے پر لطف دن اور مزے دار راتیں ضرور ہونگی ۔ نہ ہوتا کیسا۔ اگر یہی کیفیت نہ ہوئی تو ساری دلچسپیاں خاک میں مل جائینگی ۔

موسم باراں وہ موسم ہے جس میں خدا جانے کتنے دلوں کے ولولے خود بخود اُبھر آتے ہیں اور نہیں معلوم کتنی توبائیں ٹوٹ جاتی ہیں ۔

آہ! یہی وہ دن ہیں کہ کسی دوست سے چاہے کتنا ہی بگاڑ ہو گیا ہو ادھر ذرا ابر گھر کے آیا اور ملاپ ہو گیا۔ اُدر کسی وقت کے ملاپ میں تو اتنا نقص بھی ہوتا ہے کہ مدتوں کے بخار ہی نکالتے نکالتے اور شکوہ و شکایت ہی کرتے کرتے وقت نکل گیا ۔ مگر ابر سیہ کی مستی اس قسم کی فضول تضیع اوقات کی طرف متوجہ بھی نہیں ہونے دیتی ۔

اور موسموں میں انسان کبھی اتفاقی ہی کوئی ایسا سین دیکھ سکتا ہے کہ دل از خود رفتہ ہو جائے مگر برسات کے موسم میں جہاں کہیں کوئی چھینٹا پڑ گیا آشفتہ مزاجوں کے لئے ہر طرف ایک قیامت بپا ہو جاتی ہے اُودی اُودی گھٹائیں جو میکدے کے نکلے ہوئے برہم مزاجوں کی طرح ہوا کے ساتھ ساتھ آسمان کے کونوں پر ٹھٹکتی پھرتی ہیں ان کا چاروں طرف جھوم جھوم کے چلنا اور بعض بعض جگہ ان کے نازک دامنوں سے دھوپ یا چاندنی یا شفق (جیسا وقت ہو) کے رنگ کا پھوٹ پھوٹ کے نکلنا یہ ایسی کیفیتیں ہیں جو ہر جگہ اور ہر

موقع پر دکھائی دے جاتی ہیں۔ دیکھو! ایک بہت بڑا امیر اپنی لب دریا کوٹھی میں بیٹھا یہی سراپا مسرت منظر دیکھ رہا ہے اور ایک ادنیٰ غریب اپنے جھونپڑے سے گردن نکالے اس عالم بہار کو دیکھ رہا ہے۔

وہ کھیت جو اپنی سیرابی کی آرزو میں بارش کے مشتاق رہتے ہیں اور جن کے پودے ہر لحظہ اسی دھن میں سر اٹھا اٹھا کے آسمان کی صورت دیکھا کرتے ہیں ان کی صورت کو خیال کرتے رہیے۔ برسنا درکنار اگر ابر کا کوئی ٹکڑا بھی آفتاب پر آجاتا ہے تو ان کی کیا صورت ہو جاتی ہے ان کی سبزی آنکھوں کو ہمیشہ صبح وشام کے دلفریب اوقات میں ٹھنڈک پہنچاتی تھی مگر پانی کا دونگڑا پڑ جانے کے بعد دیکھئے کہ وہ سبزی کس قدر شگفتہ کس قدر شاداب اور کس قدر نظر فریب بن کے عاشق مزاجوں کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ باغوں اور کھیتوں کا سماں اس موسم میں ایسا نہیں ہوتا کہ اچھا خاصہ انسان ان کی سیر کرنے کے بعد اپنے آپے میں رہے باغوں کو اگرچہ انسانی کاریگروں نے پیدا کر دیا ہے قدرت کی سادہ کاریگری میں انسان نے اپنی اصلاح کر کے جابجا رنگ برنگ کے پھول لگا دیئے ہیں وہ سادہ پن جو ایک وسیع صحرا یا ایک کوہستانی مرغزار میں باغبان قدرت نے پیدا کر دیا تھا وہ انسانی دستکاری کے عمدہ نتائج دکھانے والے باغوں میں نہیں ہے مگر پھر بھی قدرت اپنی شفقت سے باز نہیں آتی اور موسم بہار کا جانفزا اثر

ان باغوں تک بھی پہنچا ہی دیتی ہے دیکھو! پھولوں کے رنگ کس جوبن پر ہیں اور ان کی سرخی کس قدر آنکھوں میں کھبی جاتی ہے پانی کے قطرے پھولوں کی نازک پنکھڑیوں اور نوجوانان چمن کی ہری ہری کونپلوں پر اس بدلی کے دن کی ہلکی روشنی میں جواہرات اور موتیوں کی طرح جھلک رہے ہیں اور اس قدرتی زیور کا کام دے رہے ہیں جو مشاطۂ بنچرنے عروس بہار یا شاہدان چمن کو پہنا دیا ہے۔

باغ ہی پر کیا منحصر ہے اس موسم میں جہاں کھڑے ہو جایئے ایک ایسی سینری (منظر) نظر آجاتی ہے کہ خود بخود ایک از خود رفتگی کا اثر دل میں پیدا ہونے لگتا ہے نہریں بہنے کو تو ہمیشہ بہتی ہیں اور ان کے پانی کی وجہ سے ان کے کنارے کنارے سرسبزی اور تر و تازگی کا ایک اثر ہمیشہ ہی رہتا ہے مگر یہ لطف سوا برسات کے اور کب ممکن ہے کہ کثرت آب سے دریا گویا جوش پہ جوش کھا کھا کے چھلکا پڑتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ بھی ہماری طرح آپے سے باہر ہوا جاتا ہے شہر کی گلیاں اور سڑکیں جن میں موسمی اثر بہت کم محسوس ہوا کرتا ہے ان میں ذرا ایک پانی کا چھینٹا پڑ جانے کے بعد دیکھئے کہ کیسے دلوں میں ایک گدگدی سی اٹھتی ہے اور خود ہی سے گزر گزر کر ملہار کی لمبی لمبی تانیں اڑانے لگتے ہیں اور ہر سننے والے کی آنکھوں کے سامنے گویا برسات کا فوٹو اتار کے رکھ دیتے ہیں اپنے ہمجنسوں کو

جانے دیجئے ہم تو جانوروں تک کے ممنون ہیں اس پپیہے کی آرزو خدا پوری کرے جو پرسوں ہمارے پڑوس میں ایک درخت پر آکے بیٹھ گیا تھا اور "پی کہاں، پی کہاں" کی رٹ لگا دی تھی اس ظالم ہجراں نصیب پپیہے کو بھی جانے دیجئے اس فصل میں کوئل ہم پر کس قدر مہربان ہے کہ صرف ہمارے جوش دل میں ایک ولولہ پیدا کرنے کے لئے اس نے گویا اس درخت پر اپنا نشیمن بنا لیا ہے اور شب و روز میں اکثر اوقات اپنی مستانہ آواز سے کوئی نہ کوئی ایسی چیز گا دیتی ہے کہ ہمیں برسات کا سماں گھر بیٹھے آنکھوں سے نظر آجاتا ہے۔

افسوس ہماری شامت اعمال یا اہل شہر کی بے سلیقگی اور میونسپلٹی کی غفلت نے گلیوں اور سڑکوں پر اتنی کیچڑ پیدا کر دی ہے کہ ہر قدم پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے ورنہ گھر سے نکل کر اسی روح افزا موسم کے جلوے دیکھئے کہیں تو وہ منظر نظر آجاتے جہاں عالیشان عمارتوں اور درختوں کی سبزی اور زمین کی شادابی اور دریاؤں کی روانی، آسمان کی نیلی نیلی گھٹاؤں نے آپس میں مل کے سماں پیدا کر رکھے ہیں اور اس ضمن میں کہیں نہ کہیں دو ایک وہ نازک مزاج اور رنگین طبع صورتیں بھی نظر آجاتی ہیں جنہوں نے اپنے لباس میں موسم کے مطابق ترمیم کی ہے۔

ہلکے ہلکے دھانی دوپٹے زیب تن کئے ہیں اور خود فراموشی کے عالم میں

کوٹھوں پر آ آ کے کھڑی ہو گئی ہیں نامحرموں کی آنکھ بچا بچا کے گھٹاؤں کے جھومنے، ہوائے لطیف و سرد کے ادھر ادھر سرگرداں پھرنے کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ اور پھر اس پر یہ ستم کہ وہ تو اس ہوا کی مشتاق بن کے آئی ہیں۔ اور ہوا گستاخیاں کر رہی ہے دوپٹے کا آنچل ادھر ہوا سے اڑا۔ اسے سنبھالنے بھی نہ پائی تھی کہ پیشانی کے کچھ کھلے ہوئے بال اڑ کے آنکھوں پر بکھر گئے۔ جھنجھلا کے انہیں ناز و ادا سے ادھر ادھر کانوں کے پیچھے کیا تھا کہ دوپٹے کے دونوں آنچل لٹک کے زمین چومنے لگے اس برہنگی نے اس قدر پریشان کیا کہ گھبرا کے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی دیکھتا تو نہیں ہے اور شرما کے بیٹھ گئیں یہ ادائیں اگرچہ ہمیشہ کے لئے دلفریب ہیں مگر ان کا لطف بھی کچھ اس زمانے میں خوب ہوتا ہے جبکہ اودی اودی گھٹاؤں کی نیلگونی ان کے دوپٹے کے دھانی رنگ پر اپنا سایہ ڈالتی ہو۔

اور موسموں کے جوش و طرب سے صرف رندانہ مشربوں اور ناز فروش مہ جبینوں ہی کو تعلق ہوتا ہے مگر یہ البیلا زمانہ ہے کہ عصمت مآب خاتونیں اور گھر کی بیٹھنے والی بھولی بھالی لڑکیاں جن کو حسن و عشق کی دنیا کی ہوا تک نہیں لگتی ہے اور جو اپنی سادہ زندگی ہی کو نفس انسانی کا کمال خیال کرتی ہیں ان پر بھی کچھ نہ کچھ اثر اس موسم کا ضرور پہنچ جاتا ہے معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں کو جھولا جھولتے وقت ملہار کی دھن میں کچھ نہ کچھ گاتے

کس نے نہیں سنا۔ جب امیر خسروؔ کا ایسا ایک پاکباز اور صوفی منش شاعر شریف گھرانوں کی لڑکیوں کے لئے ساون کا ایک گیت تصنیف کر گیا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قسم کا ہر موسمی ولولہ گویا لڑکیاں بزرگوں سے سیکھ کے ظاہر کرتی ہیں۔

سب کو چھوڑ کے اس گروہ کو دیکھئے جس میں ایک منچلا ابر کو مغرب کی طرف سے آتے دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھا۔ ع

ساقیا مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

اور جب وہ ابر چاروں طرف گھر گیا تو دوسرے صاحب مزے میں آکر بولے:

ابر اٹھا تھا کعبے سے اور جھوم پڑا میخانے پر
بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے اب شیشے اور پیمانے پر

ان سیہ کاروں کو تو کالی کالی گھٹاؤں سے کچھ ایسا عشق ہے کہ ادھر آسمان پر بدلی کی صورت نظر آئی اور یہ بادۂ گلرنگ کی بوتلوں پر جھک پڑے آہ شراب کمبخت حرام ہی ہوگئی ورنہ نئے پاکباز اور جائز عشق کے مزے لوٹنے والے تائب دوستوں سے کہتے کہ ان گھٹاؤں کو ان آنکھوں سے دیکھئے جن میں نشۂ صہبا کے لال لال ڈورے پڑے ہوں۔

الغرض برسات ایک عجیب موسم ہے اور زندگی کے پر حظ منافع اس از خود رفتگی کے موسم میں حاصل ہو سکتے ہیں۔

اُمّید

"دُنیا بامید قائم"

موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بری ہو انسان کے دل کے مشغلے کو کافی نہیں ہوتی۔ موجودہ رنج اور خوشی، محبّت اور دوستی کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں اس لئے اس بڑے کاریگر نے جس نے انسان کے پتلے کو بنایا اس میں چند اور قوتیں ودیعت کیں جن کے سبب سے دل کے لئے کاموں کی کبھی کمی نہیں ہوتی، اور ہمیشہ اور ہر وقت اس کے مشغول رہنے کا سامان مہیّا اور موجود رہتا ہے انہیں قوتوں کے ذریعے سے گزری ہوئی باتیں پھر دل میں آتی ہیں۔ اور آئندہ کی باتوں کا ان کے ہونے سے پیشتر خیال ہوتا ہے۔

وہ عجیب قوّت جس کو ہم یاد کہتے ہیں ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے جب موجودہ چیزوں میں سے کوئی چیز ہم کو شغل کے لئے نہیں ملتی تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بلا لاتی ہے۔ اور ان کے ذکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے اس کی مثال جگالی کرنے والے جانوروں کی ہے کہ وہ پہلے تو گھاس دانہ سب کھا لیتے ہیں اور جب ہو چکتا ہے تو ایک کونے میں

بیٹھ کر پھر اسی کو پیٹ میں سے نکال کر چباتے رہتے ہیں۔

جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل کے مشغلے کے لئے بلالاتی ہے اسی طرح ایک اور قوت ہے جو آئندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے اور جس کا نام امید و بیم یا خوف ورجا ہے۔ انہیں دونوں قسم کے خیالات سے ہم آئندہ زمانے تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باتیں کہ مدت مدید یا زمانہ دراز میں آنے والی ہیں اور بالفعل پردۂ ظلمت میں نہاں ہیں ان کو ایسا سمجھتے ہیں کہ ابھی ہو رہی ہیں ان کے ہونے سے پہلے ان کی خوشی یا رنج اٹھانے لگتے ہیں یہانتک کہ اس زمانے کا بھی جب نہ یہ زمین ہوگی نہ آسمان، ابھی سے خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف موجودہ وقت پر محدود ہے۔

ہماری خوشیاں اس قدر کم ہیں کہ اگر وہ قوت ہم میں نہ ہوتی جس سے انسان ان عمدہ اور دل خوش کن چیزوں کا ان کے حصول سے پہلے مزہ اٹھاتا ہے جن کا وجود میں آنا خیالی امر ہے تو ہماری زندگی نہایت ہی خراب اور بدمزہ ہوتی۔ ایک شاعر کا قول ہے کہ ــــــ "ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے کی امید رکھنی چاہیئے کیونکہ کوئی چیز ایسی نہیں جس کی امید نہ ہو سکے اور کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا ہم کو نہ دے سکے"۔

فارسی زبان میں ایک مقولہ ہے ــــــ "تمنّا را عیبے نیست"۔ کہتے

ہیں کہ کسی سنٹر لیفیا نے کہا۔ "دنیا میں مجھے کسی چیز کا رنج نہیں۔ اس نے کہا کیا عجب ہے کہ میں کبھی نہ مروں کیونکہ خدا اس پر بھی قادر ہے کہ ایک ایسا شخص پیدا کرے جس کو موت نہ ہو اور مجھ کو امید ہے کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔"

یہ قول تو چیز ظرافت کا تھا مگر سچ یہ ہے کہ زندگی کی امید ہی موت کا رنج ہم سے مٹاتی ہے اگر ہم کو زندگی کی امید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ بدتر حالت کسی کی نہ ہوتی۔ زندگی ایک بیجان چیز کی مانند ہے جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی امید اس میں حرکت پیدا کر دیتی ہے امید ہی کے سبب سے انسان میں سنجیدگی اور بردباری اور خوش مزاجی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے گویا امید انسان کی روح کی جان ہے ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے۔ اور تمام تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے۔ محنت پر رغبت دلاتی ہے اور انسان کو بہت سخت اور مشکل کام کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔

امید سے ایک اور بھی فائدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم موجودہ خوشیوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے اور انہیں میں محو نہیں ہو جاتے۔ سیزر نے جب اپنا مال ومتاع دوستوں کو بانٹ دیا تو اس سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اپنے لئے کیا رکھا اس نے کہا کہ امید۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کی عالی طبیعت ان چیزوں کی کچھ قدر نہیں کرتی تھی جو اس کے پاس تھیں بلکہ ہمیشہ اس کا

خیال کسی بہتر چیز کی طرف لگا رہتا تھا۔

اگلے زمانے کے لوگ بغیر امید کے زندگی کو نہایت ہی برا سمجھتے تھے نقل ہے کہ خدا نے انسان کے پاس ایک صندوقچہ بھجوایا جب اس کو کھولا تو اس میں سے ہر قسم کی بلائیں مصیبتیں اور بیماریاں جو انسان کو ہوتی ہیں نکل پڑیں امید بھی اسی صندوقچے میں چمٹ تھی۔ وہ نہ نکلی بلکہ صندوقچے میں چمٹ رہی اور اسی میں بند ہو گئی تاکہ مصیبت کے وقت انسان کو تسلی دے بس جب زندگی میں امید ہے اس سے بڑھ کر کوئی خوش زندگی نہیں۔ خصوصاً جبکہ امید کسی عمدہ چیز کی ہو اور اچھی بنا پر ہو اور نیز ایسی چیز کی جو امید کرنے والے کو حقیقت میں خوش کر سکتی ہو اس بات کی حقیقت وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خوشحال آدمی کے لئے بھی زمانہ موجودہ میں کافی خوشی نہیں ہے۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مذہبی زندگی میں عمدہ عمدہ چیزوں کی بہت سی امیدیں ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں کی ہوتی ہیں جو ہم کو پورا پورا خوش کر سکتی ہیں دینی چیزوں کی امیدیں دنیوی چیزوں کی امیدوں سے بہت زیادہ قوی اور مضبوط ہوتی ہیں کیونکہ ان میں عقل کے علاوہ مذہبی اعتماد کی بھی نہایت قوت ہوتی ہے اس قسم کی امیدوں کا خیال بھی ہم کو پورا پورا خوش رکھتا ہے بلاشبہ امید کے اثر سے انسان کی زندگی نہایت شیریں

ہو جاتی ہے اگر وہ موجودہ حالت پر خوش نہیں رہتا تو اس پر صبر تو ضرور آجاتا ہے مگر مذہبی امیدیں اس سے بھی زیادہ فائدہ مند ہیں۔ تکلیف کی حالت میں دل کو سنبھال لیتی ہیں بلکہ اس کو اس خیال سے خوش رکھتی ہیں کہ شاید یہی تکلیف اس امید کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہو۔ مذہبی امید گویا مردے کو زندہ کر دیتی ہے اور اس کے دل کو غایت درجے کی خوشی بخشتی ہے۔ انسان اپنی تکلیفوں میں خوش رہتا ہے اور روح بھی اس بڑی چیز کے اُچک لینے کو اچھلتی ہے جو ہمیشہ اس کی نظر میں رہتی ہے اور آخرکار اس امید کی خوشی میں اس فانی جسم کو چھوڑ دیتی ہے کہ قیامت کے دن اس سے مل جائیگی۔

حضرت داوُد علیہ السّلام نے نہایت مصیبت اور عین تکلیف کے وقت خدا کی جناب میں یہ مناجات کی تھی "اے خدا! میں ہمیشہ تجھے اپنے سامنے رکھتا ہوں تو میرے داہنی طرف ہے اس لئے میں گھبراتا نہیں۔ میرا دل خوش ہے میرا گوشت بھی اسی امید میں رہیگا کہ تو میری روح کو جہنم میں نہ ڈالے تو اپنی چیز کو خراب ہوتے ہوئے نہ دیکھیگا۔ تو ہی مجھ کو زندگی کے طریق بتائیگا تیرے ہی حضور میں خوشی کا کمال ہے۔ تیرے ہی داہنی طرف ہمیشہ کی خوشی ہے۔ آمین۔

فنون لطیفہ

فنون کی بنیادی قسمیں دو ہیں :-

ا : فنون لطیفہ یا فنون کبیرہ۔

ب : فنون متعارفہ یا فنون صغیرہ اور فنون مفیدہ۔

فنون متعارفہ سے وہ فنون مراد ہیں جو معاشرت کے عام سلسلوں سے براہ راست ایک عام تعلق رکھتے ہیں اور جن پر عام زندگیوں کا بہت کچھ مدار ہے یا یہ کہ ان کے بغیر عام زندگیاں بہ مشکل گزرتی ہیں ایسے فنون کا تعلق علوم یا معلومات علمیہ کی موٹی موٹی صورتوں سے وابستہ ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فنون متعارفہ علمی دائروں سے باہر ہوتے ہیں۔ یا دل و دماغ سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وابستگی اور نسبت تو ہوتی ہے لیکن ایک عامیانہ رنگ میں۔

یا یوں کہیئے کہ فنون متعارفہ وہ ہیں جن سے انسان ترقی کر کے فنون لطیفہ کی حدود تک پہنچتا ہے یا جو فنون لطیفہ کے مبادیات ہیں۔ ایسے تمام فنون متعارفہ یا مبادیات فنون لطیفہ کو صنعت اور حرفت کے نام

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فنون لطیفہ، فنون متعارفہ ہی کی شاخیں ہیں انہیں میں سے نکلے ہیں! ورانہیں کا ایک نرالا اور دلآویز روپ ہیں فنون متعارفہ چند منزلوں پر ہی رہ گئے اور یہ دور نکل آئے وہ عوام کے ہاتھوں میں جا پڑے اور یہ مشاہیر کی گود میں پرورش پاکر نکلے فنون متعارفہ کے متلاشی اور خواہاں عام لوگ رہے اور فنون لطیفہ کی مشتاق وہ جماعت جو فطرت ہی سے ان کے موزون تھی۔

فنون لطیفہ میں انہیں لوگوں نے ترقی کی اور نام پایا ہے جو فطرتاً ان کے موزون ہیں کوئی شخص محنت اور دماغ سوزی سے صحیح معنوں میں شاعر نہیں بن سکتا۔ شاعر پیدائشی ہوتا ہے اور اپنی فطرت ہی میں سچی شاعری کے جذبات رکھتا ہے

فنون لطیفہ فلسفہ کی شاخیں ہیں یا فلسفہ کے خوش آیند خوش مزہ ثمرات جس طرح حلاوت ثمرات کی ذات میں قدرتاً ودیعت ہوتی ہے بیرونی کوشش سے کوئی ثمر بآسانی شیریں نہیں ہو سکتا اسی طرح بعض فطرتیں قدرتاً فنون لطیفہ کا چسکا اور جذبات رکھتی ہیں اور بمقابلہ عام فطرتوں کے وہ خصوصیت سے فنون لطیفہ میں مہارت اور ملکہ حاصل کرتی ہیں۔

پیدائشی شاعر کی طبیعت اور دل و دماغ سے مضامین نکلتے ہیں۔

متشاعر مختلف طریقوں سے مضامین کی تلاش کرتا اور بدقت انہیں قابو میں لاتا اور ترتیب دیتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں بڑا بھاری فرق ہے ایک کے قبضہ میں آمد کی دیوی ہے اور دوسرے پر آورد کا جن سوار ہے۔

فنون لطیفہ کی پانچ قسمیں ہیں :-

ا : فن شاعری۔ ب : فن موسیقی۔

ج : فن تعمیر۔ د : فن سنگ تراشی۔

ہ : فن مصوری

اگرچہ ہر پانچ فن ایک دوسرے سے جدا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ایک نسبت ہے اور ہر پانچ فنون کا "تخیل" اور "تصور" ایک ہی اصول کے ماتحت اور ایک ہی گُر کے تابع ہے ایک ہی خیال سے ان کی بنیاد پڑی ہے اور ایک ہی اصول کی کشش سے فطرت نے ان کا انکشاف کیا ہے۔ ایک ہی کشش اور ایک ہی جذبہ ہے جو فطرتوں کو اس طرف لئے جاتا اور منسلک کرتا ہے ایک ہی رہبر ہے جو اس منزل پہ پہنچاتا اور اس کوچہ سے آشنا کرتا ہے اگرچہ ہر طبیعت اور ہر انسان میں کسی حد تک ایسے راہ نما اور راہبر کا نشان ملتا ہے لیکن کمال کوئی کوئی ہی رکھتا ہے۔

یوں کہئے کہ ان فنون لطیفہ کا مواد فطرتاً ہر طبیعت میں رکھا گیا ہے۔ ہر

شخص کسی نہ کسی پہلو سے ان کا شوق رکھتا اور انہیں چاہتا ہے ان پانچ فنون میں سے کوئی بھی ہو ہر طبیعت میں اس کا مذاق اور ولولہ پایا جائیگا۔ اگر کوئی شخص کچھ ملکہ نہیں رکھتا تو ان کی دید اور شنید سے ہی خوش ہوگا۔ بچّہ کے سامنے کوئی شعر پڑھو، کوئی گیت گاؤ، کوئی تصویر کوئی نقش دکھاؤ وہ بڑے شوق سے دیکھے اور سنے گا۔ اور اس کا ننھا سا چہرہ بزبان حال شہادت دے گا کہ اس کا ضمیر اس کا دماغ ایسے نظّارے سے خوش اور شاداں ہے۔

انسان ہی نہیں حیوانات بھی کسی حد تک ملکہ رکھتے ہیں ان کی شاعری ان کا بولنا، ان کا راگ ان کی اپنی آواز ہے۔ فن تعمیر میں بیا کی کاریگری قابل لحاظ ہے۔ جانوروں کی آشیاں سازی سے ظاہر ہے کہ وہ بھی فنون کے بعض اجزا سے واقفیت رکھتے ہیں اور ان کی زندگی کے بھی وہ ایک حد تک جزو اعظم ہیں۔

بتاں زبسکہ بدل خانہ کردہ اندمرا　　　قسم بہ کعبہ کہ بت خانہ کردہ اندمرا

ہر شخص شاعر نہیں البتّہ نظم کا مادّہ ہر ایک انسانی طبیعت میں پایا جاتا ہے اور یہ مادّہ مختلف طریقوں سے ظاہر اور منضبط ہوتا ہے ایک شاعر بھی نظم کرتا ہے اور ایک درزی، زردوز، نقّاش، سنگ تراش، موسیقی دان اور معمار بھی اپنے اپنے رنگ میں نظم سے کام لیتا ہے۔ درزی قطع برید،

کتر بیونت کرکے کپڑے سیتا اور ایک ٹکڑہ دوسرے ٹکڑے سے پیوند کرتا ہے زردوزی میں ڈورہ، ریشم، گوٹہ وغیرہ مختلف طریقوں اور مختلف پیمانوں سے کپڑوں پر لگایا جاتا ہے۔ نقاش لکڑی، پتھر، کپڑہ، کاغذ پر مختلف قسم کی نقاشی کرنے میں لمبائی، چوڑائی، دائرہ، گولائی کو ایک پیمانے پر لانے کا خیال رکھتا ہے۔ سنگ تراش کو پتھر کی تراش میں بہت سے نشیب وفراز کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

موسیقی دان کو آواز، سُر، تال، ہوا گت کی پابندی بہت سی مشکلات میں ڈالتی ہے۔ تھوڑی سی لغزش بھی بے سرا کر دیتی ہے۔

فن تعمیر میں ایک اینٹ ایک پتھر بھی بے قاعدہ لگ جانا ساری تعمیر کے واسطے ایک شرمناک ٹھوکر ہے۔

جس طرح شعر میں سے کسی لفظ کا نکال دینا یا ناموزوں الفاظ کا ترکیب پا جانا شعر کی وقعت کھو دیتا ہے اسی طرح دیگر فنون کی ترکیب بندش میں نقص عائد ہونا ابتری اور بے وقعتی کا موجب ہے اگر ایک نقاش نقش میں موزونیت اور سلیقہ کا خیال نہ رکھے گا تو نقش کی خوبصورتی عمدگی اور نفاست میں فرق آجائیگا۔

ہر فن میں نظم یا اصول نظم کی ضرورت ہے جب تک نظمیت نہ ہو یا اصول نظم پر نہ چلا جائے تب تک کوئی فن قابل تعریف نہیں ہوتا۔ فن

اسی حالت میں فن ہے جبکہ اس میں نظم کی روح پھونکی گئی ہو۔

فنون لطیفہ کی تقسیم کمی و بیشی اقوام یا ممالک کے اپنے اپنے مذاق پر ہی بہت کچھ موقوف ہے۔ جس طرح آب وہوا کے اختلاف سے ملکوں اور قوموں کے تمدنی اور سوشل اور رسوم یا روشوں میں تضاد اور اختلاف ہے اسی طرح فنون لطیفہ کے انتخاب یا تخصیص میں بھی گونہ اختلاف ہے۔

ایشیا کے اکثر حصوں میں ناچ یا رقص فنون لطیفہ میں شامل نہیں کیا جاتا خاصکر اسی وجہ سے ایشیائی حصوں میں یہ فعل عام طور پر بہ مبالغات مذہبی و مواعید اخلاقی کسی قدر مکروہیت لئے ہوئے ہے۔

فنون لطیفہ کے ذرائع یا موجبات حسب ذیل ہیں :-

ا :- علم۔ ب : معلومات۔

ج : ضرورت۔ د : حسن۔

ہ : شہرت۔ و : آسائش۔

ز : محبت۔

یہی سبعہ ضروریہ ہے جس کی بدولت دنیا میں ہر ایک قسم کے فن نے جنم لیا ہے اور جو فنون کی شہرت اور ہستی کا باعث ہوا ہے۔

حالی کی شاعری

جدید شاعری کی بنیاد سے قبل حالی قدیم رنگ میں فکر شعر کرتے تھے جس کی طرف لوگوں نے بالکل توجہ نہیں کی ہے اور اردو کی بدنصیبی سے اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے حالی کو صرف مسدس کا شاعر جانا اور انہیں قومی مرثیہ گو کی حیثیت سے زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے مگر ان کے اوّل دور کا کلام دیکھیے تو جس طرح ظرافت سے قطع نظر اکبر کی سنجیدہ شاعری انہیں شعرائے قدیم کی صف اوّل میں پہنچا دیتی ہے قدیم شاعری میں حالی کا مقام بھی بہت بلند نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں میر درد کا درد، آتش کی تیزی، مومن کی نازک خیالی و جذبات نگاری، غالب کی نفسیات محبت، اور داغ کی شوخی ساری باتیں آکر جمع ہوگئی ہیں۔ البتہ تعجب کی بات یہ ہے کہ غالب کی شاگردی کے باوجود حالی کے کلام میں میرزا دقت پسندی اور ان کے خیالات کی پیچیدگیاں نہیں پائی جاتیں بلکہ اس کے برعکس بے تکلفی، روانی، سادگی اور لطافت جس نے کلام میں بڑی تاثیر اور تاثیر میں بیساختگی پیدا کر دی ہے حالی کا خاصۂ شاعری ہے اور یہ سب نواب شیفتہ کی صحبت

کا فیض ہے جس نے حالی کے ذوق کی معقول تربیت اور صحیح رہنمائی کی۔
اس وقت شیفتہؔ کی سخن فہمی کی تمام ملک میں شہرت تھی حتیٰ کہ خود میرزا غالبؔ ان کی نکتہ سنجی کے ایسے قائل تھے کہ انہوں نے اپنے اشعار کے حسن و قبح کے جانچ کی کسوٹی شیفتہؔ کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو بنا رکھا تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

غالبؔ بفن گفتگو ناز د بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

اور سچ تو یہ ہے کہ مصطفےٰ خاں شیفتہؔ نے جہاں حالیؔ کی شاعری کو سنوارا وہاں میرزا غالبؔ کی مشکل پسندی کی بھی، جو میرزا کے ابتدائی دور کی شاعری میں نمایاں تھی اصلاح کی۔ شیفتہؔ اپنے معیار پسندیدگی کے متعلق کہتے ہیں ؎

وہ طرز فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہؔ — معنی شگفتہ، لفظ خوش، انداز صاف ہو

چنانچہ ان معنوں میں حالیؔ نے شیفتہؔ کی، جن کے رنگ تغزل سے حالیؔ کے تغزل کو خاص مناسبت تھی۔ پوری پوری پیروی کی ہے ان کے اشعار سادگی و صفائی کی خصوصیت کے ساتھ بعض مرتبہ اس طرح احساسات میں ڈوبے ہوتے ہیں کہ سننے کے ساتھ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں مثلاً :-

انکے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت — نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل ۔۔۔ کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
ذوق سب جاتے رہے جز ذوق درد ۔۔۔ اک یہ لپکا دیکھئے کب جائے گا
یوں ہی گزرے تو سہل ہے لیکن ۔۔۔ فرصت غم کو بھی ثبات نہیں
کوئی دلسوز ہو تو کیجے بیاں ۔۔۔ سرسری دل کی واردات نہیں

خواجہ میر دردؔ کا ایک شعر ہے :-

دید وا دید ہوئی دور سے میری اسکی ۔۔۔ پر جو میں چاہتا تھا سو بات نہ ہونے پائی

مگر صفائی اور لطافت بیان کی خصوصیت کے حالیؔ کے شعر سے جو حسرت و بیکسی ٹپکتی ہے دردؔ کے انداز میں نہیں پائی جاتی۔ حالیؔ کہتے ہیں ؎

کر دیا چپ واقعات دہر نے ۔۔۔ تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

اسی طرح غالبؔ کا مشہور شعر ہے ؎

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا ۔۔۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ غالبؔ کے انداز میں تلخ افسردگی ہے اور حالیؔ کے شعر میں بے بسی و بے زبانی۔ اس کے علاوہ حالیؔ محتاط ہیں وہ غالب کی طرح عشق کا نام نہیں لیتے بلکہ واقعات دہر کی مبہم ترکیب کے پردے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

حالیؔ نے اکثر خواجہ میر دردؔ کی طرح چھوٹی چھوٹی بحروں میں غزلیں کہی ہیں جن کے اشعار درد ہی کی طرح اثر میں ڈوبے ہونے کے علاوہ ضرب المثل

سے ہو گئے ہیں۔ مثلاً :۔

قلق اور دل میں سوا ہو گیا ۔۔۔ دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
نہیں بھولتا ان کی رخصت کا وقت ۔۔۔ وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
ہوا رُکتے رُکتے دم آخر فنا ۔۔۔ مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد ۔۔۔ ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
وہ امید کیا جس کی ہو انتہا ۔۔۔ وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

شوخی اور بے تکلفی کے ساتھ شیرینی و لطافت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں حالی کا پیرایۂ بیان کتنا اچھوتا ہوتا ہے ؎

ملتے ہی انکے بھول گئیں کلفتیں تمام ۔۔۔ گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
رات انکو بات بات پہ سو سو دیئے جواب ۔۔۔ مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں ۔۔۔ اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور ۔۔۔ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
کیوں پوچھتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کو ۔۔۔ پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائیگا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ ۔۔۔ ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائیگا

حالی کے بعض اشعار ہمیں اس طرح متاثر کرتے ہیں جیسے ان کے احساسات منتقل ہو کر ہمارے دلوں میں پیوست ہوئے جا رہے ہوں اور ہم ان سے ایک لذیذ قسم کی کسک محسوس کرتے ہیں وہ بعض مرتبہ ایسی بات کہہ جاتے ہیں، جو

اگرچہ ہمارے لئے نئی نہیں ہوتی اور ہم بھی اسے محسوس کرتے ہیں البتہ ہمیں اس کے اظہار پر قدرت نہیں ہوتی۔ لیکن حالی کا پیرایہ بیان ایسا اچھوتا اور معصومانہ ہوتا ہے کہ سننے کے بعد ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ـــــ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا ـــــ مگر اسی احساس کے سمجھنے یا سمجھانے کی صلاحیت خود ہم میں نہ تھی۔ چنانچہ مولانا حالی کا یہ مشہور شعر دیکھئے کس طرح دل میں اتر جاتا ہے ؎

عشق کہتے ہیں جسے لوگ یہی ہے شاید　　خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

حالی نے بعض نفسیاتی حقائق کا اعتراف جس حسن سے کیا ہے ملاحظہ ہو۔ اصلیت اور حقیقت نگاری کی ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی ؎

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم　　ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

سچ ہے یاں شرم گنہ شوق بھلا دیتا ہے　　توبہ ان کی ہے جنہیں اپنی خطا یاد رہے

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ　　اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

دعا کی بے اثری کی کتنی سچی توجیہہ کی گئی ہے ؎

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی　　دل چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

اور کتنا معنی خیز ہے یہ شعر ؎

مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت　　کوئی وعدہ پورا ہوا چاہتا ہے

پھر وہ کس طرح بھانپ جاتے ہیں کہ ؎

خط آنے لگے شکوہ آمیز ان کے — ملاپ ان سے گویا ہوا چاہتا ہے

ذرا ان کا حسن طلب ملاحظہ ہو محبوب کو کتنی لطیف قسم کی دھمکی دیتے ہیں ۔

وفا شرط الفت ہے لیکن کہاں تک، — دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

ان کی طبیعت میں لطیف قسم کی شوخی اور بذلہ سنجی بھی پائی جاتی ہے ؏

چپ چپاتے انہیں دے آئے دل اک بات پہ ہم — مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار — اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

اور یہی تھی حالی کی اصل شاعری، ورنہ پھر ان کی طبیعت میں ایسا انقلاب آیا کہ وہ شعر و سخن سے متنفر ہو گئے اور ان کی شاعری بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی حتیٰ کہ اخیر وقت میں انہوں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ قدیم رنگ کی لذت اور سوز اور امنگ سے بالکل خالی ہے چنانچہ مجموعۂ غزلیات اور چند مخصوص نظموں کے علاوہ ان کی بیشتر قومی نظمیں بالکل خشک، بے کیف و اثر اور روکھی پھیکی ہیں ۔

حالی کی طبیعت میں انقلاب کا سبب

پروفیسر عبدالقادر سروری شاید حالی کے اس قول سے کہ ــــ "شیفتہ شاعری میں اصلیت کے حامی تھے اور قدیم طرز کی شاعری کو ناپسند کرتے تھے" ــــ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شیفتہ کی صحبتوں ہی سے حالی کی

شاعری میں انقلاب آیا۔ مگر مجھے ان کے اس خیال سے ایک تو اس لیے اتفاق نہیں ہے کہ شیفتہ خود ہمیشہ قدیم رنگ ہی میں شاعری کرتے رہے البتہ شعر میں وہ قدیم انداز مبالغہ و تصنع کو ناپسند کرتے تھے اور یہ اثر حالی نے بھی ان سے لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری میں تصنع اور مبالغہ کی کمی ہو گئی اور اس کی جگہ حقیقت نگاری و اصلیت جسے حالی لازمہ شعر کہتے ہیں زیادہ پیدا ہو گئی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ شیفتہ کی صحبت میں حالی کا عاشقانہ رنگ اپنی سادگی و اصلیت کے سبب زیادہ پُر اثر اور گہرا اور ان کا قدیم رنگ تغزل معائب سے پاک ہو کر اور چوکھا ہو گیا ؎

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی جی چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

چنانچہ قدیم رنگ تغزل کو نہ تو شیفتہ نے چھوڑا اور نہ ہی انکی زندگی میں حالی کے دل میں اس سے بغاوت کا خیال پیدا ہوا۔ دوسرے انھوں نے لاہور کے نئے طرز کے مشاعرہ کی شرکت سے قبل خود کہیں اپنے مزاج میں تبدیلی کا ذکر کیا ہے اور نہ قدیم طرز سخن سے بیزاری ظاہر کی ہے ان کی طبیعت میں انقلاب دراصل شیفتہ کے بعد نمایاں ہوا۔ ان کی زندگی میں تو دراصل حالی کی دنیا ہی اور تھی۔ البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ کی موت نے ان کو بڑا صدمہ پہنچایا جس سے ان کی طبیعت میں بڑی بددلی پیدا ہو گئی

اور نہ صرف قدیم رنگ تغزل بلکہ تھوڑے دنوں کے لئے شعروسخن ہی سے وہ متنفر ہو گئے۔ قصہ یہ ہے کہ غدر کے بعد کچھ دنوں تک حالی کو پریشانی رہی۔ مگر پھر انہیں شیفتہ کی سرپرستی حاصل ہو گئی تو امن و سکون کے ساتھ ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ حالی کے جوانی کے دن تھے چنانچہ شیفتہ کی صحبت میں انہیں کنگھی چوٹی، حسن و عشق، ہجر و وصال اور طنز و شکایت وغیرہ کے مضامین سے دلچسپی رہی اور شاید یہی وہ زمانہ تھا جس کی یاد مولانا کے دل میں کبھی اس طرح چٹکیاں لینے لگی۔

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت   پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

مگر جب حالی کا یہ سہارا چھن گیا تو وہ بددل ہو کر لاہور چلے گئے۔ جہاں گورنمنٹ بکڈپو میں ان کو ایک اسامی مل گئی اور وہ انگریزی کتب سے اردو میں ترجموں کی اصلاح کی خدمت پر مامور ہوئے لیکن یہاں کے لیل و نہار ہی دوسرے تھے لاہور آکر حالی کی دنیا ہی بدل گئی صحبت یاراں چھوٹ گئی وہ وقت سے پہلے اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگے عمر سے زیادہ طبیعت میں سنجیدگی آگئی اور ان کی ساری زندہ دلی ختم ہو گئی۔ چنانچہ وہ اپنے "دل زندہ" کا ان الفاظ میں ماتم کرتے ہیں ؎

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی   بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا   ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

لاہور میں نئے طرز کے مشاعرہ کا قیام

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد آزاد نے لاہور میں ایک مشاعرہ قائم کیا جو بقول حالی "اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا جس میں مصرعوں کے بجائے کسی مضمون کا عنوان دے دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم کریں"۔ چنانچہ انہوں نے بھی چار مثنویاں ایک برسات پر، دوسری امید پر، تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حبِّ وطن پر لکھیں۔ اور یہیں سے ان کی بیانیہ شاعری کی ابتدا ہوتی ہے وہ اس مشاعرہ کا ذکر پھر دوسرے مقام پر اس طرح کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کو قدیم مشرقی شاعری میں کس قدر خامیاں نظر آتی تھیں اس مشاعرہ کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ درو بست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہوگئی تھی اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔ یہ تحریک اگر پندرہ سال قبل شروع کی جاتی تو شاید کوئی ثمرہ مرتب نہ ہوتا۔ کیونکہ جو لوگ ہندوستان میں اردو نظم پر تھوڑی بہت قدرت رکھتے تھے وہ عشقیہ مضامین کی ممارست سے شاعری کو عاشقی کا مرادف جانتے تھے وہ واقعہ نگاری اور تصویر حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے انہوں نے مغربی انشاپردازی کا کوئی نمونہ بھی

اپنی زبان میں نہیں دیکھا تھا جس پر وہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھنے کے قابل ہوتے لیکن یہ تحریک خوش قسمتی سے ایسے وقت میں ہوئی جبکہ اردو زبان میں مغربی خیالات کی روح پھونکی جارہی تھی - اور لٹریچر میں بہت سی کتابیں اور مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو گئے تھے چنانچہ اس کے سبب اردو میں بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا -

الغرض اس نئے طرز کے مشاعرہ نے فضا میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کر دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالی نے جو پہلے ہی سے بددل ہو رہے تھے قدیم مذاق کے مشاعروں میں شرکت ترک کر دی اور جب لوگوں نے اصرار کیا - اور بددلی کا سبب پوچھا تو ——"مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر"—— کے عنوان سے ایک نظم لکھ ڈالی جس میں رنگ قدیم کی پھبتی اڑائی گئی ہے اور رفتہ رفتہ شعر گوئی ہی سے ان کو نفرت ہو گئی - خصوصاً قدیم طرز کے اشعار کی کوئی افادیت ان کی نظر میں باقی نہ رہی - حتیٰ کہ ایک وقت اپنے متعلق انہیں اس احساس سے بڑی تکلیف ہونے لگی کہ اتنی عمر جو قدیم رنگ کی شاعری کی پرورش میں گزری وہ ساری کی ساری ضائع ہو گئی چنانچہ وہ اپنے مسدس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں —— "بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اس ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے - مگر جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے

چلے تھے اب تک وہیں ہیں ؎

شکست رنگ شہاب وہنوز رعنائی	دراں دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

باایں ہمہ حالیؔ شاعری کا مادہ چونکہ فطرت کی طرف سے لے کر آئے تھے وہ ہزار شعر کی برائی کریں اس مادہ کو دبا نہ سکے چنانچہ وہ پھوٹ پڑا اور اب اسے کسی طرف رجوع ہونا ہی تھا خواہ وہ جدید اصلاحی رنگ ہی میں سہی مگر شاعری سے طبعی لگاؤ کے سبب وہ اس سے چھٹکارا نہ پا سکے البتہ اب ان کا :-

وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ "زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے ابھاروں سے دل بڑھتا تھا نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا۔ مگر ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اس لئے بخارات درونی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا دل و دماغ کو متلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈھتے تھے۔ قوم کے ایک سچے بہی خواہ نے آکر ملامت کی، غیرت دلائی اس کی جادو بھری تقریر دل میں گھر کر گئی۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ باسی کڑھی میں ابال آیا۔" مسلمانوں کی اخلاقی و معاشرتی حالت اس وقت

نہایت پست و ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ ان کی اصلاح کے خیال سے سرسید نے ہمت دلائی اور حالی کے دل میں مسدس کی شکل میں ملت کا مرثیہ لکھنے کی تحریک ہوئی۔ اور اس طرح شعر کہنے کی بے چین خواہش نے تسکین پائی۔ اس کے بعد وہ اردو طرز سخن کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور مقدمۂ شعر و شاعری لکھ ڈالا۔ جو شروع سے اخیر تک مغربی اثرات کے ماتحت مرتب کیا گیا ہے مگر تعجب ہوتا ہے کہ اس کا کوئی صفحہ بھی ان حضرات کی نظر سے نہیں گزرا ہے جو اپنے جذبۂ عقیدت کے سبب حالی کو پیروی مغرب کے الزام سے بری کرنے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔ حالی نے اس کتاب میں شعر کی جو مذمت کی ہے تو اپنے خیال کی تائید میں شاید افلاطون سے ناواقفیت کے سبب شاعری کے متعلق اس کے خیالات کی غلط ترجمانی کر دی ہے اور مشرقی شاعری کے نقائص بیان کرنے کے بعد شعر کا اصلاحی معیار بنا کر پیش کیا ہے اس ضمن میں ہم حالی کی نظم "شعر سے خطاب" کے چند اشعار انتخاب کر کے ذیل میں درج کرتے ہیں جس سے حالی کے نظریۂ شاعری کی کسی حد تک نمایندگی ہوتی ہے ؎

اے شعر دلفریب نہ ہو تو، تو غم نہیں ۔۔۔ پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ۔۔۔ ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں ۔۔۔ تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

چپ چاپ اپنے سیج سی کئے جادلوں ہیں گھر
اونچا ابھی نہ کر علم امتیاز تو

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

چنانچہ آہستہ آہستہ ان کے مزاج میں عجیب قسم کی تبدیلی ہونے لگی اور انہیں جب یہ محسوس ہونے لگا کہ ——— اب وہ اگلی سی درازیِ شب ہجراں ہی نہیں تو وہ ——— خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا ——— کے احساس سے بیگانہ ہو کر ——— بس اگلے فسانے فراموش کر دو ——— کا درس عمل دیتے ہوئے آگے بڑھے اور نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ؎

کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں

سرسیّد سی عقیدت

غدر کا ردّعمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا حالی کی معاشرتی و اصلاحی سرگرمیاں بڑے شد و مد سے جاری تھیں وہ سرسیّد کی رہنمائی میں چاہتے تھے کہ ملک میں ذہنی انقلاب برپا کر دیں اور وقت کا بھی تقاضا تھا کہ "تم ہمارا ساتھ دو۔ ہم تمہیں صحیح منزل تک پہنچا دینگے"۔ دل کا حال تو کوئی نہیں جانتا مگر قولاً و فعلاً حالی سرسیّد احمد کو جن کے متعلق وہ کہتے

ہیں کہ ؎ بہت مشکل سے ہاتھ آیا ہے منزل کا نشاں یارو
پہنچ دو سلامت تا بمنزل کارواں یارو

مجدد قوم کی حیثیت سے متعارف کرنے کی کوشش کرتے رہے تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مذہبی، سیاسی اور معاشرتی عقائد میں وہ کس حد تک سرسید کے ہم خیال تھے حالیؔ بعض اوقات کچھ ایسے معمہ بن جاتے ہیں کہ محض ان کی تحریروں سے انہیں سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے بہرحال ان کے عقائد کی حقیقت جو بھی ہو مگر وہ وقت کے تقاضے کے سبب یا ہوا کے رخ کو پہچاننے اور زمانہ کی رفتار سے سمجھوتہ کرنے کے لئے مجبور ہو گئے وہ خود فرماتے ہیں ؎

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارا — کہ ہے آشتی ہی میں اپنا گزارا
نہیں ہے جنہیں میری صحبت گوارا — مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

مغرب و اہل مغرب اور ان کے ادب و تہذیب سے وارفتگی

مولانا حالیؔ کی تحریروں سے اتنا تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر میں مشرقی شاعری کس قدر ذلیل و پست ہو گئی تھی۔ مگر یہ دیکھ کر بڑی

حیرت ہوتی ہے کہ ہرچند انہوں نے مغربی ادب و شعر کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا تاہم شاید محض مغرب سے انتہائی غلو کے سبب مغربی لٹریچر کو وہ بہت بلند درجہ دیتے تھے چنانچہ وہ "مقدمہ" میں مغربی نظریہ شعر کے مقابلہ میں اپنی کمتری کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔ "مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اس وقت آگاہی تھی اور نہ اب ہے اس کے علاوہ اردو جیسی ناکمل زبان میں مغربی شاعری کا پورا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ البتہ کچھ تو طبیعت مبالغہ اور اغراق سے (جو قدیم شاعری کا خاصہ ہے) اس طرح نفور تھی اور کچھ نئے (جدید شاعری یعنی طرز مغرب کے انداز کے شعرا کے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقہ کے ترک کرنے کا الزام عاید ہو۔"

اس اقتباس کے آخری جملہ سے ممکن ہے قدامت پسندوں کی جماعت کو جو حالی کی پیروی مغرب کے منکر ہیں، یہ غلط فہمی پیدا کرنے کا موقع مل جائے کہ حالی نے نہ تو تقلید مغرب کی اور نہ طرز مشرق کو چھوڑا۔ حالانکہ حالی کا مفہوم بالکل واضح ہے، وہ مشرقی شاعری سے اظہار نفرت کے کے ساتھ مغربی شاعری کی برتری کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ باوجود سعی بلیغ وہ انگریزی شاعری کے تتبع کا

حق ادا نہ کر سکے، اور اس کا ایک سبب تو مغربی شاعری کے اصول سے لاعلمی کو اور دوسرا اردو زبان کی بے مائیگی کو بتاتے ہیں۔

وہ اپنی کلیات کے مختصر مقدمہ میں کھل کر تقلید مغرب کی کوشش میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ "میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے ہیں معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعہ میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہ ہو سکا۔ اور ان صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ کی ہونہار اور مبارک ہستیوں کا کام ہے جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہیں چھوڑیں گے ؎

پارۂ در خاک معنی تخم سعی افشاندہ ایم — بو کہ بعد از ما شود ایں تخم نخل باردار

لیکن تعجب ہے کہ ان ساری باتوں کے باوجود حالی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "وہ مغربی شاعری سے ایک حد تک متاثر ضرور ہیں لیکن مغربی تمدن اور مغربی انداز فکر کے ہرگز معترف نہ تھے بلکہ انہوں نے مغربیت کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔"

حالی کا جدید رنگ اور اس کا ردِ عمل

اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حالیؔ مشرقی شاعری سے
بہ سبب مبالغہ و اغراق اظہار نفرت کرتے تھے اور مغربی لٹریچر ان کی نگاہ
میں ان عیبوں سے پاک تھا۔ مگر اس کے برعکس یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی
ہے کہ حالی کی قدیم طرز کی شاعری تو شیفتہؔ کے اثر کے سبب واقعی اغراق
و غلو سے پاک ہوتی تھی اور اس میں حقائق و واقعات کا زیادہ بیان رہتا
تھا اس کے علاوہ اس زمانے میں حالیؔ کو چھچھورے اور بازاری الفاظ و
محاورات اور عامیانہ خیالات سے بھی نفرت تھی۔ البتہ ان کے آخری دور
کے کلام یعنی جدید رنگ شاعری میں بہت زیادہ آورد و تصنع کی جھلک نظر
آتی ہے اور اغراق و مبالغہ کا جہاں تک تعلق ہے انگریزوں کی مدح سرائی
میں انہوں نے مشرقی سلاطین کے یہاں دربارداری کرنے والے قدیم
شعراء سے کم مبالغہ اور حاشیہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے اس کے علاوہ
وہ بھی اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں افلاطون کی طرح شاعری کو نقالی
سے تعبیر کرتے ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان کے جدید رنگ کو ہم
مغرب کی نقالی کے سوا اور کیا کہیں گے۔

اور یہ بھی محض مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ حالیؔ کے مقالات و

خطبات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا مجازی کعبہ لندن تھا۔ اور وہ اسی ذہنیت کے اظہار کے لئے مجبور تھے۔ کیونکہ جس فضا میں وہ سانس لے رہے تھے اس کا یہی تقاضا تھا۔ مگر حیرت اس لئے ہوتی ہے کہ ان ساری باتوں کے باوجود حالی کو نیشنلسٹ اور آزادی پسند شاعر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کہاں تک درست ہے۔ بلاشبہ حالی کے دل میں قوم کا درد تھا۔ مگر اس سے زیادہ انہیں اپنے "رہنمائے قوم" سے محبت و عقیدت تھی جس کی جائے پناہ سرکار برطانیہ تھی اور دین و ایمان مغرب تھا اور ظاہر ہے کہ جو نیت امام کی تھی وہی مقتدی کی تھی۔ چنانچہ وہ بھی اپنے مرشد و آقا سرسید کی طرح انگریزوں کو ماوٰی و ملجا سمجھتے تھے جس کا اپنے مضامین نظم و نثر میں وہ ہر جگہ اعتراف کرتے رہتے تھے۔ اور ان کی یہی انتہا پسندی اردو ادب کی دنیا میں جدت پسندی کی وہ ابتدا تھی جس کی انتہا آج نئے ادب والوں کی خوش خرامیوں میں نمایاں ہو رہی ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے اس انداز کو ہندوستان کی اکثر طبیعتوں نے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر "اودھ پنچ" نے پھبتی کسی کہ:-

سید کی سرگزشت کو حالی سے پوچھیے　　　غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھیے

مولانا شبلی نعمانی کو بھی جو اگرچہ بطریق "خذ ما صفا و دع ما کدر" مغرب

سے مستفید تو ضرور ہیں مگر حالی کی طرح مرعوب نہیں ہیں۔ حالی کی یہ سید پرستی، کورانہ تقلید مغرب اور ذہنی غلامی بُری معلوم ہوئی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

آپ نے ہمکو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم
اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار

بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا
کہ گھٹتا کبھی ناموس شریعت کا وقار

اکبر — حالی کا ردِ عمل

مولانا شبلی اور منشی سجاد حسین کے علاوہ جو ادب و سیاست میں ترقی پسند ہونے کے باوجود سوشل معاملات میں بڑی حد تک روایت پسند تھے۔ دوسرے لوگوں کو حالی کی مغرب پرستی پسند نہ آئی اور حالی اگرچہ ان نتائج سے بالکل بے خبر تھے جن کے مستقبل بعید میں رونما ہونے کا خدشہ تھا مگر دور بیں نگاہیں اسے تاڑ رہی تھیں۔ چنانچہ جب حالی کے اس جذبۂ مغرب پرستی نے شدت پکڑی تو اس نے اکبر (الہ آبادی) کی طنز یہ ظرافت کی شکل میں اپنا ردعمل پیدا کیا۔ اکبر کو اس بات کا احساس تھا کہ ہم ہزار مغرب کی نقالی کریں مگر جب تک ہمارا ایشیا مغرب کا غلام ہے اس وقت تک ہم میں مغربی کمالات پیدا نہیں ہو سکتے چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

حکومت ایشیا پر قسمت مغرب میں ہے جبتک
کمالات ان کے جو ہیں ہمکو حاصل ہو نہیں سکتے

دوسری جگہ وہ غالباً حالی کی نقالی مغرب کا مضحکہ اڑاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

رفتار ترقی یہ کہیں ناچ نہ ہو جائے
یہ قرأت مصری کہیں کھماچ نہ ہو جائے
توحید کی تحریک سے زندہ ہے ترا دل
مغرب کی مگر کوک سے یہ واچ نہ ہو جائے

درج ذیل اشعار میں "مرید دہر" اور "زمانہ دیکھ کے" ان دو لفظوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا اشارہ شاید "سرسید کی دہریت، ابن الوقتی، اور حالی کی "سید مریدی اور مغرب پرستی" کی طرف ہے ؎

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی
نئے جنم کی تمنا ہیں خودکشی کر لی
نگاہ نازِ بتاں پر نثار دل کو کیا
زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کر لی

اکبر گمراہ کن پیروی مغرب سے اسی کو بہتر سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی قدیم تہذیب و معاشرت کے تحفظ کی کوشش کریں جو تکلف و تصنع سے ہر طرح پاک ہے چنانچہ حالی کی تحریک تقلید یورپ پر ایک لطیف طنز ملاحظہ ہو ؎

بے ہنر ہو کر جو بیٹھو طعنۂ حالی سنو
باہنر ہو کر جو چمکو تو تم کی گالی سنو
ہمکو تو پیر طریقت نے یہی دی ہے صلاح
قصۂ منصور دیکھو اور قوالی سنو

اقبال کی تخلیق

چنانچہ جب ہم مبصرانہ نظر ڈالتے ہیں تو حالی شاید مغرب کے مقابلہ

میں احساس کمتری کے باعث اپنے عقیدہ ترقی پسندی میں بڑے تنگ نظر وقدامت پرست اوراس کے برخلاف اکبرؔ اپنی قدامت پسندی کے باوجود اپنے عقاید میں بیحد فیاض نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کی طبیعتوں کے ماحولی اثرات اوراس کے امتزاج سے اقبالؔ کی تخلیق ہوئی۔ اقبال نے ابتدا میں ہرچند اکبرؔ کی تقلید میں بھی اشعار لکھے تھے مگر پھر حالیؔ و اکبرؔ دونوں کے انداز کے درمیان ایک سمجھوتے کی صورت پیدا کرلی۔ وہ مغرب سے مستفید ضرور ہوئے مگر حالیؔ کی طرح یورپ سے مغلوب وشکست خوردہ نظر نہیں آتے انہوں نے مشرقی وقار کو قائم رکھا چنانچہ ان کی شاعری کی شہرت کے ساتھ ان کا یہ رنگ اس قدر مقبول ہوا کہ ہر کس و ناکس نے اس کی پیروی شروع کردی مگر لوگوں کو کامیابی کم نصیب ہوئی البتہ جو لوگ سمجھ اور صلاحیت رکھتے تھے انہوں نے اس سے اپنے لیے نئی راہیں نکال لیں اور اپنا ایک خاص رنگ پیدا کرلیا۔ مگر اکثریت محض نقل بنانے والوں کی جماعت اور اقبالؔ کی کیریکچرسٹ (Characturist) بن کر رہ گئی اور پھر اسی طرز میں جب لوگ بھٹکنا شروع ہوئے اور انہیں کہیں سہارا نہ ملا۔ تو انہوں نے قدیم وقار و شعار کو لٹا کر مغرب کے دامن تخیل و تہذیب میں پناہ لی مگر مشرقی و مغربی مذاق کے درمیان اقبال نے جو توازن پیدا کیا تھا اسے کھو بیٹھے۔ اور کورانہ تقلید ہی کا نام ترقی پسندی رکھ لیا چنانچہ

آج کل کی یہ ننگ معاشرت ترقی پسندی حالی ہی کی تحریک مغرب پرستی کی رہین منت ہے جس کی ترغیب اس شعر میں دی گئی ہے ؎

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اور کچھ لوگوں پر اس کا لازمی ردعمل یہ ہوا کہ انہیں نہ صرف لفظ ترقی پسندی سے ضد ہو گئی بلکہ وہ حالی کی پیروی مغرب ہی کے منکر ہو گئے اور انکے اس شعر کی نئی تاویل کی تلاش میں شاید "اسماالرجال" کی چھان بین کر کے مغربی نامی ایک گمنام شخص کو ڈھونڈھ نکالا جس کا تصوف میں کوئی پایہ تھا۔ اور نہ شاعری میں۔ مگر اسکی شخصیت کو کافی رنگ آمیزی اور مبالغہ کے ساتھ پیش کر کے حالی کی ارادت ان سے منسوب کر دی اور ان کے اس شعر کو عقاید تصوف کا ترجمان بنا کر ان کو مصلحتاً صوفی بنا دیا۔ چنانچہ اگر آج حالی زندہ ہوتے تو اپنے شعر کی عجیب و غریب تفسیر سن کر یقیناً سر دھننے لگتے۔ یا روح کو بقا ہے تو عجب نہیں کہ ان کی روح اردو کی دنیائے تحقیق میں یہ نیا ہنگامہ برپا دیکھ کر کسی دل جلے شاعر کا یہ شعر دہرا رہی ہو ؎

ایں کلام صوفیان شوم نیست
مثنوی مولوی رومم نیست

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

کون نہیں جانتا کہ زبان ہونے کو تو ایک نرم و نازک چیز ہے، مگر اثر بلا کا رکھتی ہے ؎

جراحات السّنان لہا التیام ولا یلتام ما جرح اللسّان

(نیزے کے زخم بھر آتے ہیں مگر وہ زخم نہیں بھرتے جو زبان سے پڑتے ہیں)

بھرنا کیسا زبان کلیجے میں وہ ناسور ڈال دیتی ہے جو قیامت تک مٹائے نہیں مٹتا، جادو بیان شعرا، معجز نما خطیب اور فصیح و بلیغ واعظ سچ تو یہ ہے کہ انسان کے دل کے مالک ہوتے ہیں۔ اور بڑی بڑی قوموں اور زبردست گروہوں سے جو کام چاہتے ہیں لیتے ہیں۔ یہ زبان ہی کا اثر تھا جس نے دنیا میں بڑے بڑے مذہب پھیلائے اور یہ اسی کی کرشمہ سازیاں تھیں کہ زبردست سے زبردست اور ہوشیار سے ہوشیار قومیں لڑنے مرنے پر تیار ہوئیں اور لاکھوں بندگان خدا کا خون ہو گیا۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ زبان نے بھی کبھی وہ اثر نہ کیا ہوگا جو اثر کسی بیکس کے معنی خیز سکوت، کسی دل از دست دادہ کی خاموش نگاہیں

اور کسی ستم زدہ کی زبان بے زبانی کر جاتی ہے ایک بے زبان جانور
اور ایک بے زبان بچے پر ظلم ہوتے کسی سے نہیں دیکھا جاتا صرف اس
لئے کہ وہ اپنی مظلومی و ستم زدگی کو صرف خموشی و سکوت کے لہجے
میں ادا کرتا ہے اور زبان سے نہیں ادا کر سکتا۔ ان دونوں نے تو زبان
ہی نہیں پائی کہ ادا کریں مگر آہ جو ادا کر سکتا ہے اور کسی انتہا درجے
کے خوف کی وجہ سے نہیں ادا کرتا اس کی مظلومی اس سے بھی
بڑھی ہوئی ہے۔

وہ بیکس بیوہ جو اپنی بیکسی و مصیبت پر سر و سینہ پیٹ پیٹ کے
زمین سر پر اٹھائے لیتی ہے اس کی آہیں بیشک جگر خراش ہیں اور اس
کی سوگواری پر سب ہی آنسو بہانے کو موجود ہیں مگر وہ بھولی نو عمر
مصیبت زدہ جسے رونا بھی نہیں آتا جس کا غم اتنا بڑا ہے کہ اس کے
ظاہر کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں پاتی اس کا صرف خاموش ہو جانا اور
حسرت بھری آنکھوں سے ایک اک کا منہ تکنا ہر دیکھنے والے کے دل میں
ناسور ڈالے دیتا ہے جوانمرگ شوہر کی لاش کے گرد رونے اور آنسو بہانے
والوں کا ہجوم ہے کوئی سر پیٹتا ہے اور کوئی ماتم کر رہا ہے کوئی دیوار
سے سر ٹکراتا ہے اور کوئی پچھاڑیں کھاتا ہے کوئی آسمان کی طرف
آہ پُر تاثیر کے تیر پھینک رہا ہے اور کوئی اپنے پر درد الفاظ اور دل

کو خون کرنے والی بین سے قیامت کا سماں دکھا دکھا کے خفتگان مرگ کے چونکانے کی کوشش کر رہا ہے بیشک ان سب کی حالت و کیفیت دیکھ کے دل پر طرح طرح کی چوٹیں پڑتی ہیں کلیجے میں چر کے لگتے ہیں مگر اے صاحب دل دردمند! اور اے درد آشنا دوستو! سچ کہو ان میں سے کسی میں بھی وہ اثر اور وہ دل کو پاش پاش کر دینے والی کیفیت پاتے ہو جو اس نو عمری میں بے والی و وارث ہو جانے والی ساکت و مبتیں نئی بیوہ کی بے بسی و بیکسی کی ادا، یا یوں کہئے کہ اس کی خموشی و بے زبانی کی زبان میں ہے؟ وہ رونا بھول گئی ہے، زیور اتار کے پھینک دیا ہے۔ چوڑیاں توڑ رہی ہے اور کچھ ایسی گھبرائی ہوئی ہے کہ سر پیٹتے بنتی ہے اور نہ آہ وزاری کرتے مگر دیکھنے والوں کے دلوں پر بے زبانی اور سکوت ہی کی ادا سے خدا جانے کس زہر کے بجھے ہوئے تیر برسا دیتی ہے کہ جو ٹیس اور سوزش ان تیروں کے زخم سے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی اور کسی طرح مٹنے کا نام نہیں لیتی۔

مگر یہ بد نصیب بھی ایک حد تک اپنے درد و الم اور اپنی حسرت ناک حالت کو محسوس کرتی ہے قیامت سے زیادہ جگر گدازی اور دلخراشی تو اس یتیم بچے کی سراپا حسرت نگاہوں میں ہے جو یہ بھی نہیں جانتا کہ اس پر کیا گذر گئی اور یتیمی کس چیز کا نام ہے ستمگار زمانہ اسے کیا اور

کیسی دھمکیاں دے رہا ہے اور آئندہ قسمت کے دامن میں اس کے لئے کون کون اور کیسی کیسی مصیبتیں مخفی ہیں وہ اپنی معصومی کی بھولی صورت، بیخبری کی سادہ وضع یا بے زبانی کی زبان سے بے زبان ہلائے اور بغیر چشم وابرو کو حرکت دیئے ایک چشم زدن میں ایسی پُرغم داستان سنا دیتا ہے کہ ہمیں سننا کیسا، اس کی طرف دیکھنے کی بھی تاب نہیں رہتی۔

بیوہ اور یتیم بھی ایک حد تک حس رکھتے ہیں اکثر اوقات وہ چیزیں جن میں کسی قسم کی حس نہیں ایسی طولانی پُراثر اور جانگزا داستانیں سنا دیتی ہیں کہ انسان کو زندگی بے مزہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ ذرا چل کے شہر خموشاں کی سیر کرو اس کو خاموش آبادی کو دیکھو جو گو ز عزیزاں میں بستی ہے نہ ان میں کسی قسم کی حس و حرکت نظر آتی ہے اور نہ ان کے ٹوٹے پھوٹے اور اُجڑے ہوئے گھروں میں۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی اور آئے تو کیونکر، یہاں جتنے لوگ ہیں سب نے بات کرنے اور لب ہلانے کی قسم کھائی ہے۔ مگر نہیں بولتے تو کیا ہوا ؟ بے زبانی کی زبان سے اپنی داستانیں اور سرگزشت اس فصاحت کے ساتھ اور ایسے موثر لہجے میں سنا دیتے ہیں کہ ایک دفعہ سن لیجے تو پھر زندگی بھر نہیں بھولتی۔

موجودہ عہد میں اس زبان خامشی کے سمجھنے کی بہت کوشش کی گئی اور یورپ کے مجسّسوں نے انہی سکوت کی اداؤں اور خاموشی کی لوحوں کو پڑھ پڑھ کے قدیم الایّام کی بہت سی تاریخ کا پتہ لگا لیا اہرام مصری ہزار ہا سال سے خاموش کھڑے تھے ایوان کسریٰ مدت ہائے دراز سے زمانے کی مار کھا رہا تھا اور دم نہ مارتا تھا فراعنہ کی لاشیں ایک بیخودی کے عالم میں غافل پڑی تھیں اور بابل و نینوا کی اینٹیں قدامت کے بہت سے رموز سینے میں چھپائے ادھر ادھر منتشر تھیں ان سب میں شہر حموشان والوں کے دفتر مخفی تھے اور سب زبان بے زبانی سے اگلی کہانیاں سنا رہے تھے۔ سننے والوں نے سنا اور زمانے کو بتا دیا کہ ان کی سرگزشت کیسی جگر گداز اور ان کی کہانیاں کس درجہ دلخراش ہیں وہ کبھی کیا تھے۔ اور آج کیا ہیں، کیسے تھے اور کیسے ہو گئے۔

گورغریباں والوں کی زبان بے زبانی کو موجودہ محقق و مجسّس جس عنوان سے سمجھے ہیں یہ بنا جداگانہ عنوان ہے انہوں نے ان کی تحریریں پڑھیں ان کی عمارتوں کو دیکھ کے قیاس دوڑایا اور ان کے حالات زندگی دریافت کر لئے۔ لیکن ہم صرف ان کے دلوں کو دیکھتے ہیں اور جس وقت کان لگاتے ہیں کچھ اور ہی بیان سنتے ہیں ان کے بیکسانہ سکوت میں جو حسرت و اندوہ چھپا ہوا ہے اور ان کے سنسان مسکن کے سناٹے میں جو آواز سنی جاتی ہے

اس کا مطلب اپنی طبیعت اپنے مذاق اور اپنی حس کے مطابق ہر شخص جدا سمجھتا رہا ہے دنیا والے کیسی ہی عشرت پرستیوں میں مبتلا ہوں جب ان خواب مرگ کی غافل نیند سونے والوں کی خاکستری خوابگاہ پر پہنچتے ہیں ممکن نہیں کہ دو گھڑی کو اپنی خوشیاں نہ بھول جائیں اور ان ساکت و صامت فصیح البیانوں اور عالم بے زبانی کے جادو بیانوں کی داستان غم سن کے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ زندگی کے تمام لطف اور کامیابی و دولت مندی کے سب مزے انہیں خواب مرگ والوں کی طرح خاک میں مل جاتے ہیں ؂

اک دن گیا میں گور غریباں میں دوستو! ... یعنی جہاں بزرگوں کا اکثر مزار ہے
دیکھا کہ ایک قبر پہ نرگس ہے سرنگوں ... پوچھا میں اس سے یوں کہ تو کیوں شرمسار ہے
گردن جھکا کے بولی یہ وہ زار و ناتواں ... ہاں یہ بھی گردش فلک و روزگار ہے
کہنے لگی عزیز! تو نرگس نہ مجھ کو جان
آنکھیں ہیں اس کی ہوں کہ یہ جس کا مزار ہے

تہذیب اخلاق

حکمت عملی کی اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں انسان کے اخلاق اور اخلاقی امراض کے ازالہ کی تدابیر سے بحث ہوتی ہے۔

اس فن کا موضوع نفس انسانی ہے اس لحاظ سے کہ اس سے نیک و بد افعال صادر ہوتے ہیں۔

فلسفۂ اخلاق کا حقیقی عنصر یہ ہے کہ انسان نفس کو پاکیزہ کرے، بیجا خواہشوں کو روکے، قوتوں کا احتساب کرے اور جذبات پر قابو پالے تاکہ ہر امر میں طریق مستقیم اختیار کرے لیکن فلسفہ اخلاق کا مقصد صرف یہ جاننے ہی سے پورا نہیں ہوتا کہ فلاں راستہ اختیار کرنا ہم پر واجب ہے تاوقتیکہ ہم کو وجہ وجوب بھی معلوم نہ ہو۔ اور فلسفہ اخلاق کا یہ فرض ہے کہ وہ وجہ کو واضح کردے اس لئے یہ بحث وارد ہوتی ہے، کہ حسن و قبح اخلاق کا معیار کیا ہے اور پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق کی ماہیت کیا ہے اور ان کی حد کہاں سے شروع ہوتی ہے۔

حقیقت خلق :- ہر انسان کے دل میں اوّل کسی کام کا تصور پیدا ہوتا ہے اور تصور کے بعد شوق اور شوق کے بعد ارادہ۔ اور انسان میں ایک خاص قوت ہوتی ہے جو اس ارادہ کو فعل میں لاتی ہے اور اگر یہ قوت مستحکم اور پائدار ہو تو اس کو ملکہ کہتے ہیں اور اسی ملکہ کو جب اچھا یا برا ہو خلق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر ملکہ اچھا ہے تو وہ شخص خوش اخلاق ہے اور اگر برا ہے تو بد اخلاق۔

خلق جبلی و عادی : یہ ملکہ دو طرح کا ہوتا ہے طبعی و عادی۔

خلق طبعی وہ ہے جو جبلی ہو۔ انسان اس کا تخم شکم مادر سے لے کر آیا ہو۔ اور عادی وہ ہے جو ایک فعل پر مدّت تک مزاولت کرنے سے حاصل ہو۔ جیسے کوئی شخص ایک مدّت تک خوش خطی کی مشق کرے اور انجام کار بے تکلف خوش خط لکھنے لگے۔

اخلاق طبعی ہیں یا غیر طبعی : اخلاق کے طبعی یا غیر طبعی ہونے میں اختلاف ہے نیز یہ بھی مختلف فیہ ہے کہ خلق طبعی کا زائل ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں۔

ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ کوئی خلق نہ طبعی ہے اور نہ مخالف طبع۔ بلکہ انسان میں یہ استعداد رکھی ہے کہ جو خلق اس کے مزاج کے موافق ہو اس کو وہ آسانی سے اور جو اس کے مزاج کے مخالف ہو۔

اس کو بہ قت قبول کر لے۔ یعنی انسان بالطبع نہ نیک ہے نہ بد، بلکہ وہ ایک سفید سادہ کاغذ کی مانند ہے۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ انسان بالطبع نیک ہے لیکن صحبت بد اور ماحول کے اثر سے بد ہو جاتا ہے بعض حکما اس امر کے قائل ہیں کہ انسان بالطبع شریر ہے لیکن تعلیم و تربیت کے اثر سے سلیم الطبع ہو جاتا ہے۔

جالینوس اخلاقی حیثیت سے بنی نوع کو تین قسموں میں تقسیم کرتا ہے :-

ا - بالطبع نیک۔ ب - بالطبع شریر۔

ج - متوسط یعنی نہ بالطبع شریر نہ نیک۔

حسن و قبح اخلاق :- اخلاق کے طبعی یا غیر طبعی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے حسن و قبح کا معیار کیا ہے؟

فلاسفہ کی ایک بڑی جماعت اس امر کی قائل ہے کہ حسن و قبح کا اصلی فارق ضمیر کا فتویٰ ہے۔

بعض فلاسفۂ قدیم اور دور جدید کے فلاسفہ میں مل اور اس کے ہمخیال اس امر کے مدعی ہیں کہ طبعاً ہمارے پاس اخلاق کے حسن و قبح کی شناخت کا کوئی ذریعہ نہیں۔ بس جن اخلاق کو ہم اپنے لئے مفید اور مسرت بخش سمجھتے ہیں ان کو حسن اور جن کو مضر سمجھتے ہیں ان کو قبیح قرار دیتے ہیں۔ اور

ایک طویل مشاہدہ و تجربہ کے بعد نوع انسان نے یہ رائے قائم کی ہے۔

مِل کہتا ہے کہ انسان چونکہ بالطبع خود غرض ہے لہٰذا وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اپنے نفع ذات کے لئے کرتا ہے البتہ کہیں یہ خود غرضی واضح ہوتی ہے اور کہیں مخفی۔ حامیانِ مِل کے نزدیک اخلاقی نیکی اور بدی یہ ہے کہ ہم ارادۃً ایسے قانون کی پابندی کریں کہ وہ مفید اور مسرّت بخش ہو اس لئے ان کو افادئین کہتے ہیں۔

نظریۂ افادئین کی حقیقت

اخلاق کی بنیاد کا خود غرضی پہ قائم ہونا ایک ایسا امر ہے۔ کہ ہمارا شعور ہی اس کی تردید کرتا ہے اس لئے کہ مسرّت اور نیک کرداری دو جداگانہ مفہوم ہیں۔ ممکن ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی فعل سے دونوں نتیجہ برآمد ہوں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دونوں الفاظ مترادف ہو جائیں۔ مثلاً ایک شخص کبھی بد اخلاقی کی طرف مائل نہیں ہوتا اس کا یہ کہاں مطلب ہے کہ وہ اپنے افعال میں ہمیشہ اپنے فائدہ کو مدِّ نظر رکھتا ہے۔ نیز یہ بھی مسلّم ہے کہ نیک کرداری کا حقیقی عنصر ایثار ہے اور ایثار اپنی مسرّت و منفعت پر دوسرے کی مسرّت و منفعت کو ترجیح دینے کا نام ہے۔

ضمیریت :عقل کے علاوہ ہمارے نفس میں ایک ایسی اندرونی طاقت ہے جو ہم کو نیکی اور بدی کی طرف ہدایت کرتی ہے اس بصیرت باطنی کو ضمیر کہتے ہیں اور جو لوگ اس کے قائل ہیں وہ ضمیریتین کے نام سے موسوم کیئے جاتے ہیں اور اس نظریہ کا نام ضمیریت ہے۔

ضمیریت کے خلاف بہت سے دلائل دیئے جاتے ہیں مگر ان کا خلاصہ دو باتوں میں ہے :۔

اوّل یہ کہ قضایائے اخلاقی کا اصل ماخذ و منبع افعال کی حیثیت افادی ہے یعنی ہر فعل کے اندر کسی نہ کسی فائدہ کی امید پنہاں ہوتی ہے۔

دوئم یہ کہ مختلف اقوام میں جن اخلاق کا وجود پایا جاتا ہے وہ باہم متضاد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق کسی بصیرت باطنی (ضمیر) کے مظاہر نہیں بلکہ حسن و قبح اضافی چیزیں ہیں۔

دلیل اوّل کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم اپنے افعال کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہم بہت سے کام ایسے کرتے ہیں کہ ان میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا مثلاً شقاوت سے نفرت۔ نیز بعض اوقات انسان ایک فوری تحریک کے ماتحت کوئی کام کر گزرتا ہے اور اسے اپنے عمل کی بھلائی برائی سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ لہذا یہ فوری تحریک

ہدایت ضمیر کا نتیجہ ہوتی ہے۔

دلیل ثانی کا جواب یہ ہے کہ جہاں اخلاق میں تناقض ہوتا ہے۔ وہ اخلاقی حیثیت سے نہیں بلکہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً غیور قوموں میں دختر کشی کا رواج تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے غیرت کا مفہوم غلط سمجھا۔

ضمیریت کا دعویٰ فقط یہ تھا کہ انسان فطرتاً نیکی و بدی کی شناخت کی استعداد رکھتا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر شخص میں یہ صلاحیت قوت سے فعل میں بھی آتی ہے۔

اخلاقی قوتوں کا بیان

انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے ساتھ تمام اخلاق وابستہ ہیں:۔

ا۔ قوت شہوانی جو جذب نفع کی طرف مائل کرتی ہے۔

ب۔ قوت غضبی جو دفع ضرر کی طرف رغبت دلاتی ہے۔

ج۔ قوت نطق جسے قوت ملکی بھی کہتے ہیں یہ قوت انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے دو کام ہیں:۔

اوّل علمی ترقی اور اس حیثیت سے اسکو عقل نظری کہتے ہیں۔

دوم جسم میں تدبیر و تصرّف یعنی جسمانی قوتوں کو حد اعتدال پر

قائم رکھ کر ان سے کام لینا اور اس حیثیت سے اس کو عقل عملی کہتے ہیں۔

جس طرح حسن ظاہری تناسب اعضاء پر موقوف ہے اسی طرح حسن باطنی تناسب اخلاق پر موقوف ہے جب ان قوتوں کے جذبات حد اعتدال پر رہتے ہیں اور قوت شہوانی اور غضبی، قوت ملکی کی مطیع رہتی ہیں تو انسان کو حکمت حاصل ہوتی ہے۔

چاہیئے کہ تمام جسمانی قوتیں عقل کے تحت کام کریں لیکن بعض مواقع ایسے بھی ہیں کہ وہاں عقلی دلائل سے کام لینا اپنے کو فرائض انسانی سے محروم کرنا ہے مثلاً کسی سائل کی دستگیری اس بنا پر نہ کرنا کہ اس سے بے کاری پھیلتی ہے اس لیئے جذبات و عقل دونوں کا حدّ اعتدال پر قائم رہنا ضروری ہے اگر محض عقلی ترقی زیادہ ہوگی تو جذبات کمزور ہو جائیں گے اور انسان لطف حیات سے محروم ہو جائیگا اور اگر پرورش جذبات کی ترقی زیادہ ہوئی تو عقلی ترقیاں معدوم ہو جائیں گی۔

جذبات کا کام عقل کو حرکت دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال پر لانا ہے پس معیار انسانیت یہی ہے کہ تمام قوتیں افراط و تفریط کے درمیان اعتدال پر قائم رہیں جس طرح کہ ہم اپنی جسمانی حالت میں اعتدال مزاج کا نام تندرستی اور انحراف مزاج کا نام بیماری رکھتے

ہیں۔ اسی طرح اعتدال اخلاق کا نام سعادت اور انحراف کا نام شقاوت ہے۔

دورِ جدید کے فلاسفہ کی تقسیم

دورِ جدید کے فلاسفہ نے اخلاق کی تین قسمیں کی ہیں :۔

ا۔ اخلاق متعلق بادراک :۔ یہ وہ اخلاق ہیں جن کا نتیجہ صدق و کذب، ظن و یقین وغیرہ ہے۔

ب۔ اخلاق متعلق بجذبات :۔ یہ وہ اخلاق ہیں جن کا نتیجہ حسن پرستی اور لذّت پرستی وغیرہ ہے۔

ج۔ اخلاق متعلق بارادہ :۔ یہ وہ اخلاق ہیں جن کا تعلق ارادہ سے ہے مثلاً صبر و استقلال وغیرہ۔

یہ امر بھی مخفی نہ رہے کہ اخلاق میں باہم ایک سلسلہ ربط و اتحاد پایا جاتا ہے کہ ایک خلق دوسرے خلق کو پیدا کرتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص فیاض ہے تو وہ فطرتاً رحمدل و رقیق القلب بھی ہوگا اگر بخیل ہے، تو سنگدل بھی ہوگا۔

اسی طرح شجاع اور بہادر قوم اولوالعزم اور بلند حوصلہ ہوتی ہے بزدل قوم میں عورتوں کی سی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں وہ لہو و لعب

رقص و سرود و عیش پرستی کو حاصل زندگی سمجھتی ہے اور ضروری امور کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔

اخلاقی قوتوں کا اعتدال اور افراط و تفریط :۔

قوت نطق کا اعتدال یہ ہے کہ اس کا مقصد علم و حکمت ہو۔ اور افراط یہ کہ خواہشات نفسانی اور مکر و فریب میں مشغول ہو جائے۔ اور تفریط کا نتیجہ حماقت ہے۔

قوت شہوانی کے اعتدال کا نام عفت ہے اور افراط سے حرص و طمع اور حضائل بہیمیت پیدا ہوتے ہیں اور اس کی تفریط سے جمود و بے حسی پیدا ہوتی ہے۔

قوت غضبی کے اعتدال کا نام شجاعت ہے اور افراط سے غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے نیز یہ ایک عارضی جنون ہے جس سے انسان میں صفات درندگی پیدا ہو جاتی ہیں۔

ان تینوں قوتوں کے اعتدال پر قائم رہنے سے حکمت، شجاعت اور عفت کے علاوہ ایک چوتھی فضیلت پیدا ہوتی ہے جسے عدالت کہتے ہیں۔ لہذا اجناس فضائل چار ہوئے۔ ان فضائل اربعہ کی پھر بہت سی قسمیں ہو جاتی ہیں۔

جس طرح نفس میں فضائل اربعہ اور ان کی قوتیں ہیں۔ اسیطرح

ان کے اضداد بھی ہیں۔ جیسے :۔

حکمت کی ضد جہل۔ شجاعت کی ضد بزدلی۔

عفّت کی ضد حرص۔ عدالت کی ضد جور۔

بعض اخلاق کا حکم بعض حالات میں بدل جاتا ہے مثلاً راز جوئی اگر یہ شخصی طور پر ہو تو نہایت مذموم اور بداخلاقی ہے لیکن اگر ملک و قوم کے لئے جاسوسی کا لباس پہن کر کی جائے تو فعل حسن ہے اسلئے کہ پہلی صورت میں آدمی کا مقصد ذاتی عناد و دشمنی ہے اور دوسری صورت میں ملک و قوم کی خدمت۔

مؤثرات اخلاق

۱۔ تعلیم و تربیت اور صحبت کی طرح تمدّن کا اخلاق پر بہت اثر پڑتا ہے متمدّن اقوام کا طرز معاشرت غیر متمدّن سے بلند ہوتا ہے۔ تمدّن طبیعتوں کو لطیف اور ملنسار بنا دیتا ہے لیکن موجودہ تمدّن نے طبائع میں ظاہرداری اور خودغرضی پیدا کر دی ہے اور سادگی اور ایثار فنا ہو گیا ہے۔

۲۔ انفرادی و قومی اخلاق پر ماحول کا بیحد اثر پڑتا ہے جن حالات میں جو شخص پیدا ہو گا اس کی طبیعت ویسی ہی ہو گی مثلاً پہاڑوں میں

رہنے والی قوم کے اخلاق میدان میں رہنے والی قوموں سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح فاتح قوم کے اخلاق کا اثر مفتوح قوم پر پڑتا ہے اور طرز معاشرت میں مفتوح کا فاتح کی تقلید کرنا بھی اسی قبیل سی ہے۔

۳۔ اخلاق میں مذہب بھی بیحد مؤثر واقع ہوا ہے جن طبائع پر اصول اخلاق اور دلائل فلسفہ اثر نہیں کرتے وہ تقلید سے متاثر ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ یہ چیزیں ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں۔

۴۔ اسلاف کے اخلاق کا اثر آئندہ نسلوں میں باقی رہتا ہے، مگر اس کی عمر چار پشتوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک شخص نے فضائل کا اکتساب کیا اس نے اپنے بیٹے کی پرورش کی اس میں کچھ اخلاق باقی رہے تیسری پشت میں سنی سنائی باتیں باقی رہتی ہیں چوتھی میں فنا ہوجاتی ہیں اور "پدرم سلطان بود" رہ جاتا ہے

۵۔ دنیا میں ہمیشہ دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں ایک وہ جو فطرتاً مستقل مزاج، جری اور خوددار ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو فطرتاً عیش پسند اور تساہل مزاج ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی ہم مذاق جماعت کی معیت پسند کرتا ہے اگر جماعت موافق ہو تو فبہا۔ اگر جماعت اسکی افتاد طبع کے خلاف ملی تو اس صورت میں یا تو جماعت کے اخلاق کا اس پر اثر پڑے گا اور وہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ یا اس کی زندگی

کشمکش میں گذرے گی۔

مثلاً ایک شخص طبعاً ایثار کا مادہ رکھتا ہے اور انفاق سے وہ ایسی جماعت میں نشو و نما پائے جو ایثار پسند ہو تو وہ ماحول سے متاثر ہو کر اس وصف کو منتہائے کمال تک پہنچا سکے گا اور اگر اس کے خلاف خود غرض جماعت میں پرورش پائے تو اس کی طبیعت کا تقاضا کچھ اور ہو گا اور ماحول کا کچھ اور۔ اسلیے اس کی زندگی تلخ گزرے گی یا اخلاق جماعت سے متاثر ہو کر وہ بھی خود غرض ہو جائیگا۔

نیکی اور بدی

قانون فطرت پر ثابت قدم رہنے کا نام نیکی اور اس کی مخالفت کا نام بدی ہے، چونکہ قانون فطرت پر عمل کرنا ہی نیکی ہے اس لئے نیکی سے انسان کو سکون قلب نصیب ہوتا ہے اور ہمارا ضمیر خود گواہی دیتا ہے کہ ہم راہ راست پر چل رہے ہیں اور بدافعالی پر خواہ اس میں کتنا ہی فائدہ کیوں نہو ہمارا ضمیر نادم ہوتا ہے اور راحت قلب کبھی نصیب نہیں ہوتی۔

اخلاق ذمیمہ

انسان کو صورت اور سیرت دو چیزیں عنایت کی گئی ہیں اور اصل

چیز سیرت ہے۔ سیرت کی خوبی اور اس کا زیور اخلاق حمیدہ ہیں انسان کو چاہیئے کہ اخلاق حمیدہ کو حاصل کرے اور ذمیمہ کو ترک کر دے۔ اخلاق ذمیمہ حسب ذیل ہیں :۔

دروغگوئی، خصومت، غیبت، محسن کشی، تکبّر، حسد، تلوّن، خواہشات نفسانی، تعصب وغیرہ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تہذیب اخلاق کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ قدرت نے انسان میں مختلف قویٰ ودیعت کئے ہیں جن کے نشو ونما کے لئے غذا اور ورزش کی ضرورت ہے لیکن مختلف قوتوں کی غذائیں اور ورزشیں بھی مختلف ہیں۔ اخلاقی قوتوں کی غذا افکار عالیہ اور ان کی ورزش کشمکش زمانہ ہے لیکن ہر شخص کے لئے ایک ہی قسم کے افکار مفید نہیں لہذا ہر شخص کو امور ذیل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے :۔

۱۔ اخلاقی غذا کے لئے ایسے افکار کا انتخاب جو طبیعت کے مناسب ہوں۔

۲۔ اخلاقی قویٰ کا صحیح اندازہ تاکہ جو حصّہ کمزور ہو اس کو خاص طور پہ قوی کیا جائے۔

۳۔ روزانہ زندگی میں اصول اخلاق کا نفاذ۔

۴۔ نتائج اخلاق کو بغور مطالعہ کرنا۔

۵۔ زندگی کی ان کشمکشوں سے اجتناب جو اخلاقی حیثیت سے ضرر رساں ہوں۔

رسم ورواج کی پابندی کے نقصانات

ہم اپنے اس آرٹیکل کو بڑے بڑے حکیموں کی تحریروں سے اخذ کر کے لکھتے ہیں۔ کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ انسان کی زندگی کا منشا یہ ہے کہ اس کے تمام قویٰ اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقض نہ ہو بلکہ سب کا مل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو۔ مگر جس قوم میں کہ پرانی رسم اور رواج کی پابندی ہوتی ہے یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والا مطعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے وہاں زندگی کا منشا معلوم ہو جاتا ہے۔

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہانتک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس کا کوئی چلتا ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم

ورواج پر مبنی ہے تو وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی، اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی نہیں ہوتا ہے۔

کسی شخص کی بھی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہیئے اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا۔ کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بات بھی نہ کرنی چاہیئے سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح تعلیم ہونی چاہیئے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں ان کے فوائد سے مستفید ہو اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے۔

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدا تعالیٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل وفہم کو تیز رکھنے بلکہ خلاقی

باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے جبکہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے۔ وہ شخص اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ استعمال میں لائی جاویں ان قوتوں کو کسی اور کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔ البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے زمانہ حال پر نظر کرنے کے لئے اس کو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لئے قوت تجویز اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوت استقراء اور برا بھلا ٹھہرانے کو قوت امتیاز اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اس پر قائم رہنے کے قوت استقلال اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے جو اس کے واسطے مقرر کیا گیا ہو اسی کو انجام دیا کرے بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو ان اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب وہ ذروہ مخلوق کہلاتا ہے۔

ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے، پھولے اور پھلے۔

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ اور مفید ہیں ان کو اختیار کریں جو قابل اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں اور جو بری اور خراب ہوں ان کو چھوڑ دیں۔ نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں۔ ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں۔ مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں۔ کہ اس نے رسومات کی پابندی نہیں کی بلکہ یہ باعث ہے کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے۔ اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو۔ تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانے میں ہر شخص اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک رسم ورواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ نہیں پوچھتا۔ کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں۔ ان کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے اور کونسی بات ان کی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے بلکہ وہ اپنے دل سے پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبے کے کونسی چیز مناسب ہے میرے رتبے اور مقدور کے آدمی کس رسم ورواج کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں اور رتبہ اور مقدور میں زیادہ ہیں وہ کن رسموں کو بجالاتے ہیں۔ تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کے انھی ہی کی شان میں شامل ہو۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جو لوگ اس طرح پر رسومات کو بجالاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ترجیح دے کر پسند کرتے ہیں نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے اور کسی بات کی خواہش کرنے

کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا۔ اور اس لئے طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی پابندی کی ہو جاتی ہے۔ یہانتک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی ہوتی ہیں ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اوّل اوّل میں آتا ہے غرضکہ ان کی پسند وہی ہوتی ہے جو عام پسند ہوں۔ اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم ورواج کے مطابق نہ ہو اس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جرموں سے۔ یہانتک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرنے سے ان میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی کہ جس کی پیروی کریں اور ان کی ذاتی قوتیں بالکل پژمردہ اور بیکار رہنے کے سبب بالکلیہ ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے اور اپنی ذاتی خوشی اٹھانے کے قابل نہیں رہتے۔ اور عموماً ایسی طبعزاد رائیں یا خیالات نہیں رکھتے جو خاص ان کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں۔

اب غور کرنا چاہیئے کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہے یا نہیں؟

رسومات جو مقرر ہوئی ہیں غالباً اس زمانہ میں جبکہ وہ مقرر ہوئیں۔ مفید تصوّر کی گئی ہوں مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے۔ ان کا تجربہ صحیح نہ ہو یا ان کا تجربہ نہایت محدود اور چند اشخاص سے متعلق ہو یا اس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا

ہو یا وہ رسم اس وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو الّا حال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو۔ یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرضکہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے اگر کوئی نقصان نہ ہو تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش اور جودت طبع اور قوت ایجاد بالکل باطل ہو جاتی ہے۔

یہ بات بیشک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے جن کی پیروی سب لوگ کرتے ہیں لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بڑا فرق ہے رسومات کی پابندی میں اس کی بھلائی و برائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے اور دوسری حالت میں بوجہ پسندیدہ ہونے کے۔ اور اس لیے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں الّا پہلی حالت میں نابود ہو جاتی ہیں۔

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے چنانچہ وہ پابندی ایسی قوت طبعی ہے کہ جس کے ذریعے سے بہ نسبت معمولی باتوں

کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے، برابر مخالف رہتی ہے۔ اور انسان کی تنزّل حالت کا اصلی باعث ہوتا ہے۔

اب اس رائے کو دنیا کی موجودہ قوموں کے حال سے مقابلہ کرو تمام مشرقی یا ایشیائی ملکوں کا حال دیکھو کہ ان ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا مدار رسم و رواج پر ہے ان ملکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے بس اب دیکھو کہ مشرقی یا ایشیائی قوموں کا حال جن میں مسلمان بھی داخل ہیں کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل ہے۔

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوت عقل، جودت طبع اور مادہ ایجاد ضرور موجود ہوگا جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں۔ جو اب رسمیں ہیں اس لئے کہ ان کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسن معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ سب باتیں انہوں نے اپنی محنت اور علم اور عقل اور جودت طبع سے ایجاد کی تھیں اور انہیں وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہو گئے تھے۔ مگر اب ان کا حال دیکھو کہ کیا ہے اسی رسومات کی پابندی سے ان کا مآل یہ ہوا کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں جن کے آبا و اجداد اس وقت جنگلوں

میں آوارہ پڑے پھرتے تھے جس وقت ان قوموں کے آباو اجداد عالیشان محلوں میں رہتے تھے۔ اور بڑے بڑے عباد تخانے اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے اس کا سبب یہی تھا کہ اس زمانہ میں ان قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی اور جو کسی قدر تھی تو اس کے ہمراہ ہی آزادی اور ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔

تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہوتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جبکہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے بلکہ ان کی ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گذر گیا ہے اور تنزل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں بہت سی رسمیں ہیں اور ان رسموں کی نہایت درجہ پابندی کی جاتی ہے تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں؟

یہ اعتراض صحیح ہے اور درحقیقت یورپ میں بھی ان رسمونکی پابندی

کا نہایت نقصان ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی تو ان کو بھی بدنصیبی کا دن پیش آئے گا۔ مگر یورپ اور مشرقی ملکوں کی پابندی رسومات میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں تو فی الفور پرانی رسم چھوڑ دی جائے گی اور نئی رسم اخذ کر لی جائے گی اور اس سبب سے ان کے قویٰ عقلی اور حالت تمیز اور قوت ایجاد ضائع نہیں ہوتی۔

تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے ان کے باپ دادا کی نہیں ہے بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا اس کو چھوڑ دیا ہے اور ضروری سمجھا گیا کہ ہر شخص ایک سا مثل اوروں کی لباس پہنے اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اس کے برخلاف مگر اس سے عمدہ ایجاد کرے اور لوگ اس پر اتفاق کریں تو اسی وقت تبدیل نہ ہو سکے۔ اور اسی تبدیلی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں اور تا وقتیکہ ان کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جائیں۔ وہ بدستور رہتی ہیں۔ ملکی معاملات اور تعلیم میں بلکہ اخلاق میں بلکہ مذہب میں ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں۔ پس یہ تصوّر کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے مگر

دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے۔

البتہ یورپ اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش ہے اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی وہی بات اس کے تنزل کا باعث ہوگی بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی اور وہ یہ ہے کہ تمام انگریز جو حب وطن میں نامی ہیں اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جائیں اور سب اپنے خیالات اور طریقے یہاں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کر دیں اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے جو حالات کہ اب خاص خاص عادتیں قائم ہوئی ہیں وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں۔ انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ اور مختلف حیثیتوں کے لوگ اور مختلف پیشے والے لوگ گویا جدا جدا دنیا میں رہتے تھے یعنی سب کا طریقہ اور عادت جدا جدا تھی اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہوگئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہیں سب لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات پڑھتے ہیں اور ایک ہی سی باتیں سنتے ہیں اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں اور ایک ہی سے

مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کھاتے ہیں۔ اور ایک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل ہے اور ان حقوق اور آزادیوں کو قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں اور مشابہت اور مساوات سے اس کو اور زیادہ وسعت حاصل ہوتی ہے تعلیم کے اثر سے تمام عام خیالات کے اور غلبہ ورائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں اور عام ذخیرہ حقائق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے اس پر سب کو رسائی ہوتی ہے آمدورفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شائع ہوتے ہیں۔ اور ہر قسم کی عالی ہمتی بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر شخص ان کے کرنے کو موجود و مستعد ہوتا ہے کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے اور ان سب پر آزادی و عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور امورات رنج وراحت یکساں

ہوتے جاتے ہیں۔ اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور ترقی پر پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اس سے عمدہ نہیں ہو سکتا مگر باوصف اس کے ہم اس نتیجہ کو بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے باعث تنزّل ہوگا۔ سبب اس کا یہ ہے جب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں تو ان کی طبیعتوں سے وہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرانے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد حسن معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں۔ زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے اور پھر تنزّل شروع ہو جاتا ہے۔

اس معاملہ میں ہم کو ملک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے چینی بہت لائق آدمی ہیں کیونکہ ابتدا ہی میں ان کی خوش قسمتی سے ان کی قوم میں بڑے دانا اور بڑے حکیم تھے۔

چین کے لوگ اسی بات میں مشہور و معروف ہیں کہ عمدہ سے عمدہ دانش و عقل کی باتیں ان کو حاصل ہیں۔ ان کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے کے واسطے نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں۔ بیشک جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا انہوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پا لیا اور اس لئے لازم تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں افضل رہتی۔

مگر برخلاف اس کے ان کی حالت سکون پذیر ہو گئی اور ہزاروں برس سے ساکن ہے اور اگر ان کی کبھی کچھ اور ترقی ہو گی تو بیشک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہو گی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہو گئی اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے۔ اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے ان میں سے معدوم ہو گئیں۔

پس جبکہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے جن کی رسومات بھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آ گئی ہے جن میں ہزاروں نقص اور برائیاں ہیں پھر ہم ان رسموں کے پابند ہوں اور نہ ان کی بھلائی برائی پر غور کریں اور نہ خود اصلاح و درستی کی فکر میں ہوں بلکہ اندھا دھند انہیں کی پیروی کرتے چلے جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ ہمارا حال کیا ہو گا اور آئندہ کیا ہونے والا ہے؟

جوشؔ کی شاعری

پچھلے سال لاہور کے ایک عظیم الشان ادبی اجتماع میں جس کو شاعر مشرق ڈاکٹر ٹیگور اور بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی شرکت کا فخر حاصل تھا، مجھے معلوم ہوا تھا کہ صدر بزم محترمی پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفیؔ نے جوش کے تعارف میں یہ بھی فرمایا تھا کہ "جوش کی شاعری نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ آنکھیں نیچی کیے بغیر اپنی شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں"۔

جوشؔ کی اس خوش بختی سے مجھے خوشی ہے کہ ان کو اپنی زندگی میں ایسی داد تحسین نصیب ہوئی۔ لیکن بہر حال داد تحسین اور خاصکر عصری داد تحسین ناقابل اعتبار شے ہے ذوقؔ اور داغؔ کا قبول عام ہمارے سامنے کی بات ہے اسی طرح غالبؔ کا مردود ہونا بھی میرے خیال میں شعر کی سچّی قدر داد تحسین سے نہیں بلکہ اس کے استفادے سے ثابت و قائم ہوتی ہے اور استفادے سے میرا مفہوم وہ انقلاب و اثر ہے جو کسی شاعر کا کلام لوگوں کے خیالات و احساسات میں پیدا

کر دینا ہے۔

میں نے کسی دوسرے مضمون میں اپنے عقیدۂ شعری کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "جس طرح اصل مذہب ایک ہے اسی طرح اصل شاعری بھی ایک ہے اور جس طرح تہذیب و اخلاق کے لئے مذہب کی ضرورت ہے اسی طرح تہذیب نفس کے لئے شعر کی حاجت ہے"۔ اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کا رونما ہونا اور شعر کا صورت پذیر ہونا انسانی فطرت کی ایک ضرورت ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ مہابھارت، ایلیڈ اور شاہنامے کی سی کتابیں ایک مدت مدید تک یا کبھی بھی وجود میں نہ آئیں لیکن جذباتی شاعری اس وقت تک لزوماً وضرورتاً ہوتی رہے گی جب تک انسانی سینوں میں جذبات ابھرتے رہیں گے اور جس وقت تک ہم میں احساس باقی ہے ہم شعر سننے اور سر دھننے پر مجبور ہیں اناتول فرانس کے بقول ہماری مسرتیں غیر منظم اور ہمارے الم مبہم ہوتے ہیں۔ وہ چیز شعر ہے جو ہماری مسرت و الم کو مرتب اور منور کر دیتی اور ان کو زبان عطا کرتی ہے شعر درحقیقت روح انسان کی آواز ہے۔ شعر کے ذریعے ہمیں اپنی خوشی و غم کا شعور ہو جاتا ہے۔

شعر و شاعری کے بیان میں میں نے کہیں پڑھا ہے کہ لباس خیال کو زندگی کے قامت پر موزوں کر دینا شاعری ہے کوئی شک نہیں کہ

شاعری کی یہ ایک جامع تعریف ہے لیکن شعر کی ایک حیثیت تو صوری ہے دوسری معنوی اور یہ تعریف روح شعر پر منطبق نہیں ہوتی۔ شعر اسی صورت میں علوّ مقصود کو پہنچتا ہے اور کامیاب مدعا ہوتا ہے۔ جب اس میں شعری صداقت (POETIC TRUTH) اور شعری حسن (POETIC BEAUTY) بھی ہوتا ہے اور یہ باتیں لباس خیال کو زندگی کے قامت پر موزوں کر دینے کے علاوہ ہیں۔ صداقت اور حسن شعری کے لئے اعلیٰ درجے کی سنجیدگی لازمی ہے اور یہ متانت کامل خلوص بیان (SINCERETY) سے پیدا ہوتی ہے جو ایک وہبی امر ہے شعر میں خلوص بیان اور تاثیر کلام لازم و ملزوم ہیں۔

جوشؔ کے کلام پر فنی اعتبار سے نظر ڈالنا تو کسی واقف فن کا کام ہے میں صرف ان کے شاعرانہ احساسات اور ان کے شعر کی کیفیات و اثرات کے متعلق کچھ اشارے کروں گا۔

شعر کے باب میں اوپر کی سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے اس نقطہ نظر سے میرے خیال میں جوشؔ ایک کامیاب شاعر ہیں۔ وہ صحیح معنی میں شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے ہیں اور قدرت نے نہ صرف ان کو ملکۂ شاعری سے بہرہ ور کیا ہے بلکہ ان کے یہاں وہ خلوص بیان جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے بدرجہ کمال پایا جاتا ہے۔ شعر میں جس

وخروش کو ضروری عنصر قرار دیا گیا ہے جوش کے کلام میں وہ بھی بغایت موجود ہے ان کے شعر میں وہ سچائی ہے جو ان کے فلسفے کو ابھار دیتی ہے وہ ترحم ہے جس میں ضعف نہیں ہوتا۔ جوش کی رندی کفر و الحاد تک ہے لیکن اس کفر و الحاد میں نیکی و پاک نفسی شامل ہے کیونکہ مذہب کی روح، محبت و احترام انسانیت ہے اور اس کی جوش کے یہاں کمی نہیں۔ "رجائیت" جوش کے مذہب سے خارج ہے ان کو "قنوطی" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن دراصل وہ امید کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ زندگی میں "ہم آہنگی" (HARMONY) دیکھتے ہیں۔ اس لئے زندگی کے ساتھ نغمہ سرا ہوتے ہیں یعنی "زندگی" ہی کا سُر الاپتے ہیں وہ اگر "غم روزگار" سے متاثر ہوتے ہیں تو "بلبلانا" نہیں، بلکہ اس کو بھی حیات کی ہم آہنگیوں ہی میں سے باور کر کے متاثر ہوتے اور بیان کر دیتے ہیں۔ "مطالعہ و نظر" کے عنوان سے جو مختلف اشعار "نقش و نگار" میں شامل ہیں۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

کڑی دھوپ آگ برساتی ہے جب گلزار عالم پر
تخیل ابر کا ہوتا ہے سبزے کے تغیر میں
یونہیں خونریز و خوں آشام تلواروں کو ہستی کی
مرا دل تولتا ہے تیری رحمت کے تصور میں

صناعت کے باب میں یہ نکتہ اہم ترین و نادر ترین خصوصیت ہے کہ صنّاع کو فطری رہنا چاہیے۔ جوشؔ ایک سچے اور فطری شاعر ہیں اس لئے کہ وہ ایک سچے اور فطری انسان ہیں ان کی شاعری کا مرتبہ اس وجہ سے بہت بلند ہو جاتا ہے کہ ان کے کلام اور ان کی زندگی میں مطابقت ہے۔ اور سادگی اور سچائی ہر جگہ اور ہر وقت نظر آتی ہے یہی چیز شعر کی صورت میں ڈھل کر تاثیر بن جاتی ہے جس کے سبب سے شعر دل میں اتر جاتا ہے میں سمجھتا ہوں جوش کے شعر کے اس درجہ دلنشین و دلاویز ہونے کا راز یہی ہے۔

جوشؔ معمولی باتوں اور دقیق مسائل، سادہ حسیّات اور پیچیدہ جذبات کی نقاشی جس طرح کر جاتے ہیں اس سے اس بات کا اندازہ بآسانی ہو جاتا ہے کہ ان کو زبان پر کتنی قدرت حاصل ہے نظم کا کیسا ملکہ ہے اور ان کا ادراک و احساس کتنا صحیح اور نازک ہے۔

شعر سے متعلق ایک نازک حقیقت یہ بھی ہے کہ ایک شاعر جس درجہ ثقیف (CULTURED) ہوگا اتنا ہی بلند و نازک شعر کہہ سکے گا ورنہ دیگر تمام اوصاف سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اگر اس میں ثقافت کی کمی ہے تو اس کا شعر اس علو کو حاصل نہ کر سکے گا جو ایک عمدہ شعر کے لئے ضروری ہے جوشؔ کے کلام سے ان کی ثقافت کا بھی بخوبی اندازہ

ہوجاتا ہے اور جہانتک شعر و ثقافت کا تعلق ہے شعر فہمی کے لئے بھی ثقافت اتنی ہی ضروری ہے جتنی شعر گوئی کے لئے۔

غزل کے مقبول عام ہونے اور دیوانوں کی ردیف وار ترتیب نے ہمیں دو باتوں سے محروم کر دیا :-

ایک تو یہ کہ ہم اپنے شعرا کے کلام سے ان کے کردار و سیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور

دوسرے یہ کہ ان کی شاعری اور اس طرح ان کے ذہنی ارتقا کے مدارج مرتب نہیں کئے جا سکتے۔

جوش کی شاعری ان کے کردار و سیرت کا آئینہ ہے۔ اور اگر کسی سبب سے ان کے حالات زندگی ناپید ہو جائیں اور کلام محفوظ رہے تو آئندہ کسی کے لئے بھی ان کے کلام سے ان کا تذکرہ مرتب کر لینا دشوار نہ ہوگا۔ ان کے مجموعۂ کلام سے ان کے ارتقائے ذہنی کو بھی بسہولت پڑھا جا سکتا ہے شکر ہے اب ہمارے شعراء اگر ردیف وار دیوان مرتب کرتے ہیں تو تاریخ کا التزام بھی کرنے لگے ہیں کاش ان کے کلام و زندگی میں مطابقت بھی رونما ہونے لگے۔

المختصر ایک حقیقی شاعر کے لئے جس چشم بینا اور جس دل آگاہ کی ضرورت ہے قدرت نے جوش کو وہ آنکھ اور وہ دل عطا فرما دیا ہے۔

شعر و شاعری کے باب میں مختلف و متنوع نظریے جاری و ساری ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ شعر میں زبان و خیال دونوں جہت سے نغومت (نرم و نازک ہونا) یا بالفاظ دیگر اس میں روانی اور گھلاوٹ ہونا چاہئے۔ جوشؔ کے یہاں نغومت شعری کی کمی ہے اس کا ایک بین سبب تو ان کا نسلی مزاج کہا جا سکتا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جذبات میں یہ کیفیت محبت کی فتادگی اور خودی کی نفی سے پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ جذبات اپنے اظہار کے لئے ویسے ہی نرم و نازک اسلوب و الفاظ انتخاب کرتے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت "زندگی" کے منافی ہے جوشؔ جس کے علمبردار ہیں اس لئے اس قسم کی نغومت جوشؔ کے شعر میں ڈھونڈھنا غلطی ہے۔

یہانتک جو اشارات کیئے گئے ہیں رواج عام کے مطابق ان کو مثالوں سے ثابت کرنا دشوار ہے کیونکہ ان کا تعلق بیشتر وجدان و سلامتی ذوق سے ہے ان نتائج پر پہنچنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جوشؔ کے کلام کا غائر مطالعہ کیا جائے اور اس سے جو اثرات مرتب ہوں ان کے ذریعے سے رائے قائم کی جائے۔

جوشؔ کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے والا اس نتیجے پر ضرور پہنچے گا کہ انہوں نے حافظؔ شیراز کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان میں حافظ کا

رنگ رچ گیا ہے جوش نے روایتی غزل کہنا تو ایک مدت سے ترک کر
دی ہے لیکن وہ غزل مسلسل یا قطعہ کہیے کہ ایک ردیف قافیے میں نظم لکھتے
ہیں ہماری شاعری اگرچہ دو سو سال سے فارسی کی تقلید کر رہی ہے
مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک حافظؔ یا سعدیؔ پیدا نہ ہو سکا۔ لیکن
آج جوش کی ان غزلوں یا نظموں کو سنکر محسوس ہونے لگتا ہے کہ
بلبل شیراز اردو میں نغمہ سرا ہے وہی جوش و خروش اور وہی انداز
بیان، وہی دلنشینی ہے اور وہی طرز کلام۔ اس ضمن میں میرے دوست
حضرت جگرؔ مراد آبادی میرے خیال سے بالکل متفق ہیں مگر ان کی رائے
ہیں جوشؔ کے یہاں حافظؔ کی روحانیت نظر نہیں آتی اور میں جگرؔ صاحب
کی رائے تسلیم کرنے کو آمادہ ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ شئے فراوانی
تفکرؔ کے باعث خود جوشؔ کے اندر موجود نہیں۔ غرض جوشؔ کی اس قسم
کی نظمیں کافی تعداد میں ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو :-

شکر خدا کہ طرۂ طرف کلاہ دوست ۔۔۔ مشعل فروز محفل روحانیاں ہے آج
پھر چہرۂ لبشریہ ہے رنگ الوہیت ۔۔۔ پھر فرش خاک پر سر کروبیاں ہے آج
رندوں گیا لحد روح دو عالم ہے رقص میں ۔۔۔ یوم طواف کعبۂ رطل گراں ہے آج
ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہ ناز ۔۔۔ عین الیقین بہشت کا وہم و گماں ہے آج
ہر خشک و تر میں گونج رہی ہیں حکایتیں ۔۔۔ ہر ذرۂ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج

رہ رہ کے اڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ — کیا جانے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جوشؔ کی شاعری خود ان پر گزر رہی ہوئی کیفیتوں کا مرقع ہے لیکن اس خصوصیت کے باعث ان کی کا آخری دو ایک شعر جو مادی بیان پر مشتمل یعنی خود شاعر کے کسی ذاتی واقعے سے متعلق ہوتا ہے قاری یا سامع کے لئے ایک امتحان ثابت ہوتا ہے۔ نظم کی شاعرانہ کیفیات و تخیلات سننے یا پڑھنے والے کو عالم خیال میں جس بلندی پر پہنچا دیتے ہیں یہ آخری شعر دفعتاً اسے پستی کی طرف لے آنا چاہتا ہے۔

مثال کے طور پر ان کی نظم "جامن والیاں" ملاحظہ ہو۔ برسات کا موسم عام طور پر وجد آفریں ہے لیکن ایک پرستار فطرت کے لیے تو برسات کے مناظر خدا جانے کیا قیامت ہوتے ہیں۔ ہمارا شاعر فطرت پرست اپنے ساتھ ہمیں بھی محو منظر کر لیتا ہے۔ پہلے بند میں بھونرے

کو ع روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی

اور ع بہ رہی ہیں ندیاں ساون کے نغموں کی طرح

کی نادر اور حسین تشبیہوں سے قطع نظر، ہمارا تصور برسات کا ایک منظر دیکھتا ہے جس کے افق پر چند دہقانی عورتیں نظر آتی ہیں۔ دوسرے بند میں ایسے منظر کو جو اکثر ہماری نظروں سے گذرتا، اور

اور قابل التفات نہیں ہوتا ہمارا شاعر ایک شہ پارۂ صناعت بنا کر پیش کرتا ہے اور ہمارا خیال بھی "انگڑائی" کی صورت" میں بلندی کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن آخری بند کا آخری مصرعہ :۔

جوشؔ ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی

ہماری قوت متصورہ کو مادیت کی طرف لے جاتا ہے اور ہم ایک صدمہ سا محسوس کرتے ہیں۔

جوشؔ کے محاکات

میرے خیال میں باعتبار محاکات جوشؔ اس وقت اس لئے فرد ہیں۔ کہ وہ کسی تصویر کے پیش کرنے میں چند ایسے پہلو چن لیتے ہیں کہ پورا مرقع اپنے جزئیات و ماحول کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً "جمنا کے کنارے" کا ایک مرقع ملاحظہ ہو :۔

افسوں بہ نگاہ و زلف بردوش — غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش
فردوس کے در کئے ہوئے باز — ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز
رنگین کلائیوں کو جوڑے — چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے — قرآں ہے کہ رحل پر دھرا ہے

"نظارۂ ماضی" ایک دوسری نظم ہے اس کی ایک تصویر دیکھئے :۔

"کوہستان دکن کی عورت" ایک اور نظم ہے اس کو پڑھیے اور تصور قائم کیجیے جو صورتیں سامنے آئیں گی وہ وہی ہونگی جو دکن میں چلتی پھرتی دیکھی جاتی ہیں اس نظم میں تناسب الفاظ اور ان کے برمحل استعمال کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

جوش کے خمریات

اردو ذخیرۂ اشعار میں اس موضوع پر بہت کافی انتخاب مل جائیگا۔ اور نہایت عمدہ شعراپ کے سامنے آئیں گے جس میں ریاضؔ خیرآبادی (مرحوم) کا نام بر سر فہرست ہوگا۔ لیکن جوشؔ کے خمریات کے سامنے وہ سب ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے شراب کے مقابلے میں پانی۔ اپنی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جوشؔ کا اس قسم کا کلام مجھے حافظؔ و خیامؔ سے بے نیاز کر دیتا ہے اس ذیل میں ان کی نظم "چند جرعے" کی طرف توجہ دلاؤ نگا۔ جو جوشؔ کے خمریات میں بھی اپنی نوع کی ایک ہی نظم ہے اس میں انہوں نے مے نوشی کی کیفیات کے درجے نظم کئے ہیں جس کے باعث وہ خاص طور پر قابل لحاظ اور خصوصیت لئے ہوئے ہے۔

پہلے جرعے میں ہمارے شاعر کے دل میں کوئی کروٹ سی لیتا ہے اور پھر:-

یہ کس کی سن رہی ہے روح آہٹ　　رگوں میں ہے مزے کی سنسناہٹ

زہے رفتار خونِ زندگانی
بغیر اسباب شادی شادمانی
سخن کی داد خود سے پا رہا ہوں
کلی کی طرح کھلتا جا رہا ہوں

اسی کیفیت میں اسے ایک آواز آتی ہے کہ :-

بد مستی بہ از زہد ریائی

تو وہ پھر ساغر اٹھا لیتا ہے اور دوسرے جرعے ہیں :-

رگ وپے میں ہے غلطاں نوجوانی
ہر اک لمحہ ہے عمر جاودانی
گراں زنجیر دانش گل رہی ہے
متانت کی جوانی ڈھل رہی ہے
یہ کیسی طرفگی ہے آج ساقی
صراحی میں ہے وجہ نور باقی

پھر وہی آواز آتی ہے اور وہ پھر تیسرا جرعہ لے کر "زہد ریائی" کو غرق کرنا چاہتا ہے :-

ندی ساون کی چڑھتی آ رہی ہے
سوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے
سر میخانہ حوریں آ رہی ہیں
نگاہیں رام رس ٹپکا رہی ہیں
فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں
بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں
بڑھا جاتا ہوں دریا ہو کہ وادی
مبارک دولت خود اعتمادی

دوسرے جرعے میں "گراں زنجیر دانش" گلی اور تیسرے میں فنا کی بیڑیاں گل گئیں۔ شاعر کو پھر آواز آئی اور خود اعتمادی پیدا ہو جانے کے بعد اس نے تعمیل میں پھر ساغر بھر لیا۔ تو :-

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری ستاروں پر ہے میرا حکم جاری
مجازی صورتوں پر ہے بحالی حقائق ہو چکے ہیں لا ابالی
چھنکتی ہیں بتوں کی بالیاں سی فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی
جوانی روح میں اٹھلا رہی ہے نظر پر کا کلیں بکھرا رہی ہے

جب ہستی کے امتیاز بھی مٹ چکتے ہیں تو پھر وہی آواز آتی ہے اور پھر تحمیل کی جاتی ہے اور پانچویں جرعے میں :۔

تعالی اللہ شان خود نمائی بھرا ہے خاک میں زور خدائی
ہتھیلی پر لئے ہوں گلستاں کو کہاں کا گلستاں سارے جہاں کو
جبین "حال" پر ہے نقش "ماضی" کوئی حد بھی ہے ان بدمستیوں کی
مجھے ارض و سما سے کد نہیں ہے وگرنہ مستیوں کی حد نہیں ہے

یہاں تک کہ مستی کے اندر نہ صرف "زہد ربانی" بلکہ "خودی" بھی غرق کر دی جاتی ہے۔

جوش کی وطنیت

وطن پرستی کا جذبہ جوش کی بدترین خصوصیات سے ہے اور ان کی وطن پرستی، انسانیت پرستی کی ذیل میں ہے۔ حریت یا آزادی ایک ایسا لفظ ہے جس کی صحیح تعریف کرنے میں دنیا اس وقت تک ڈانواڈول

ہے۔

اسلام کا درس حریت، حریت فکر میں مرکوز ہے اور جوشؔ اسی کے مبلغ ہیں۔ ان کی اس قسم کی نظموں میں "غریب الوطن" اور "الوداع" خاص طور پہ قابل ذکر ہیں ان سے جوشؔ کے جذبۂ وطنیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جوشؔ کی ریا دشمنی

مکرو ریا جو آج کل ہمارا اوڑھنا بچھونا اور جس وجہ سے مذہبی تقدس ہمارا مال تجارت بن گیا ہے۔ جوشؔ اس کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اس موضوع پر ان کی متعدد نظمیں ہیں مثلاً "جواب اس شب کا دنیا میں نہیں ہے" اور "وقت مروت" وغیرہ کے پڑھنے سے ان کے احساسات کا پتہ ملتا ہے۔

جوشؔ کے شبابیات

شبابیات کو جوشؔ کا مخصوص موضوع سمجھنا چاہیئے کیونکہ اس بحث پر وہ اپنے حقیقی رنگ و مذاق میں پوری طرح نمایاں ہو سکتے ہیں اور "زندگی" کا تحرک بھی اسی عنوان کے تحت بہترین طریق پر ظاہر

ہو سکتا ہے۔ میں اس ضمن میں خاص طور پر ان کی نظم بعنوان "جوانی" کی طرف توجہ دلاؤنگا۔ جو انہوں نے نظیر اکبر آبادی کے انداز پر نظیر ہی کی بحر میں لکھی ہے جوانی کی شرح اس سے بہتر و بلند تر شاعری میں تصور نہیں کی جا سکتی۔ ٹیپ کے مصرعے پڑھ کر وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے

جوش کی زبان

جوش کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زبان سے گفتگو کرنا ناگزیر سا ہے جوش کی شاعری دو جداگانہ قسم کی زبانوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ جو فارسیت لئے ہوئے ہے اور "یوم بہار" وغیرہ قسم کی نظموں میں ہے دوسری وہ جو "یہ کون اٹھا ہے شرماتا" کے ذیل کی نظموں میں ملتی ہے بعض جگہ یہ دونوں انداز ملے چلے ہیں لیکن ایک خصوصیت دونوں رنگوں میں مشترک ملے گی۔ اور وہ توازن لفظی کی خصوصیت ہے کہ موسیقی و ترنم کہیں ظاہر نہیں ہو پاتا۔ تناسب لفظی کے اعتبار سے ان نظموں میں جو فارسی آمیز زبان میں کہی گئی ہیں۔ "دبیریت" کی جھلک آجاتی ہے اور بعض جگہ اغلاق پیدا ہو کر تناسب کو زائل کر دیتا ہے لیکن بالعموم جوش کے یہاں تناسب لفظی پایا جاتا ہے۔

مگر میری نظر میں جوش کی لسانی خصوصیت وہاں نمایاں ہوتی ہے جہاں وہ ٹھیٹ ہندی لفظ اور محاورے استعمال کرتے ہیں ان کا یہ استعمال اس قدر حسین اور اس درجہ دلنشیں ہوتا ہے کہ انسان جھومنے لگتا ہے۔ جوش کا ایسا کلام پڑھ یقین ہونے لگتا ہے۔ کہ زبان کی گھلاوٹ جس چیز کا نام ہے اردو میں عربی فارسی عنصر بڑھانے سے نہیں بلکہ ہندی شامل کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے میں دیکھتا ہوں کہ جوش کی تقلید دوسری خصوصیات کے علاوہ اس ذیل میں بھی کی جا رہی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب عربی فارسی الفاظ کی "درآمد" بند ہو جائے۔ ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں :۔

رخ پہ سرخی آنکھ میں جادو ۔۔۔ بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون سمٹے ابرو! ۔۔۔ نیچی نظریں بکھرے گیسو
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی ۔۔۔ جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا مسکی ساری ۔۔۔ ہلکی مہندی دھندلی بیندی
یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ڈوبا ہوا رخ تابانی میں ۔۔۔ انوار سحر پیشانی میں
یا آب گہر طغیانی میں ۔۔۔ یا چاند کا مکھڑا پانی میں

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

رخسار پہ موج رنگینی کچی چاندنی سچی چینی
آنکھوں میں نقوش خود بینی مکھڑے پہ سحر کی شیرینی

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کی اصلی صورت ان بندوں میں جھلکتی ہے اور اس وقت جو رجحان نظر آرہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پچاس برس گزرنے سے پہلے یہی زبان مقبول عام ہوگی۔

اس بحث میں ایک اور بات سامنے آجاتی ہے جو میرے علم میں نو ہے مگر ہر اس شخص کو بھی محسوس ہوسکتی ہے جو جوش کا کلام ذرا توجہ سے پڑھے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جوش کو اپنے کلام پر نظرثانی کرنے کی عادت نہیں۔ غالباً وہ اس کو شاعرانہ دیانت کا مقتضار سمجھتے ہیں۔ یا اپنے شعر کو قاطبتاً فطری رکھنے کی خاطر ترمیم و تنسیخ روا نہیں رکھتے۔ لیکن میں اس کو بھی ان کی طبیعت کی بے نظمی اور مزاج کی بے ضابطگی سے تعبیر کرتا ہوں۔ جو فطنت (GENIUS) کا اولین خاصہ ہے مگر ان کی اسی عادت کے باعث ان کے یہاں کہیں کہیں تسلسل بیان و خیال زائل ہو جاتا ہے جو محض اشعار کے تقدم و تاخر سے رفع ہو سکتا ہے۔ اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ بعض وقت کوئی ایسا لفظ بھی بندھ جاتا ہے۔ جو

تناسب سے باہر ہوتا ہے۔

الغرض جوشؔ ایک فطرت نگار شاعر ہیں اور ان کا کلام ضروری شعری کا حامل ہے لیکن اگر فنون لطیفہ کی اس تعریف کو مانا جائے کہ صناعت کا مصرف ہمارے اندر احساس انبساط پیدا کرنا اور ہماری روح کے شرف کو ابھارتا ہے تو جوشؔ کی شاعری اس وقت کامیاب ترین شاعری ہے۔

جوشؔ کا فلسفہ یا مسلک

جوشؔ کا مسلک متعین کرنا انتہائی دشوار کام ہے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ وہ "لذتیت" پر گامزن ہیں لیکن اس سے غافل معلوم نہیں ہوتے، کہ "لذت" ہے کیا شئے؟ "جوانی کی رات" ان کی نہایت مترنم نظموں میں سے ایک ہے اور کیفیات وصل کا صناعانہ مرقع ہے۔ اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

گنبد قصر عیش میں گونج رہی تھی یہ صدا
رات نہ تھی وہ عیش کی جوشؔ تراشتاب تھا

جوشؔ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے بعض خیالات کو عقیدے کے طور پر اختیار کر لیا ہے مثلاً یہ خیال کہ ہماری ساری

مصیبتیں یادِ ماضی کے باعث ہیں اور جو شے ہمیں ماضی کی یاد دلائے۔ وہی ہمارے رنج کا باعث ہوتی ہے جیسے "نظارۂ ماضی" کا یہ شعر:-

پڑتا ہے اثر نہ جانے کیونکر   کوئل کی صدا کا حافظے پر

اس خیال کو جوشؔ نے متعدد جگہ مختلف و دلپذیر پیرایوں میں لکھا ہے اسی طرح "عمرِ رواں" کا موضوع بھی جوشؔ کو بہت محبوب ہے اور بار بار متنوع اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے ان کی نظم "کل رات کو" میں ملاحظہ ہو کس پائے کا شعر کہہ دیا ہے:-

وقت کے ہاتھوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں
ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو

یا "یوم بہار" کا یہ شعر:-

رہ رہ کے اڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

(۵)

اردو، ہندی

یہ جھگڑا کسی طرح طے ہونے کو نہیں آتا اور اہل ملک کی جو حالت ہو رہی ہے اس کے دیکھتے امید نہیں کہ کبھی بھی طے ہو۔ اگر زمانہ کا یہی رنگ رہا اور ہندوستان میں یہی لیل و نہار رہے تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہندوستان میں نہ اردو ہو گی نہ ہندی بلکہ سب کی مادری زبان انگریزی ہو گی مگر زندگی کی تھوڑی مدت جو باقی ہے اس میں بھی ملک کے بیوقوف وکلاء اسے چین نہیں لینے دیتے اگر کسی گروہ کا یہ خیال ہو کہ وہ ہندوستان کی اس رفتار کو بدل دیں گے یا برٹش گورنمنٹ کے سوا یہاں اور کوئی حکومت ہو گی وہ بیوقوف اور عقل کا دشمن ہے برٹش سطوت روز بروز بڑھے گی اور ان تمام قوتوں اور کو پامال کر ڈالے گی جو اس کے خلاف ہیں اور دنیا کے ان تمام مقامات میں جہاں انگریزی حکومت ہے ایک متحد المذاق والاغراض قوم تیار ہو گی جس کی کاروباری اور معاشرتی زبان انگریزی ہو گی۔

اردو ہو یا ہندوستان کی کوئی اور زبان یہ سب مٹنے والی چیزیں

ہیں جو اپنی اپنی عمریں پوری کرکے صرف کتابوں میں رہ جائیں گی۔ اور زبانوں پر فقط انگریزی ہوگی۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انگریزی کو قوت کے ساتھ اٹھایا اور شوق سے حاصل کیا جائے اور ان زبانوں کی جتنی عمر باقی ہو اس میں انہیں موقع دیا جائے کہ امن وامان کی زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کے آزار کے درپے نہ ہوں۔ مگر نہیں، ہم اپنی بے عقلی سے ان کی چند روزہ زندگی کو بھی بے مزہ کئے دیتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو زبان خودرو طور پر پیدا ہوئی اور خود ہی بغیر کسی کوشش کے سارے ہندوستان پر چھا گئی۔ اور اس کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ کسی غیر ملک کا آدمی ہندوستان میں آنے اور ہندوستان کے لوگوں سے ملنے جلنے اور ان سے گفتگو کرنے کے لئے جس زبان کو سیکھتا ہے وہ اردو ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اردو کو مسلمانوں سے کوئی خصوصیت نہیں۔ اسلئے کہ اس کی ترکیب اور اس کی پیدائش میں جتنا دخل عربی یا فارسی کو ہوسکتا ہے اس سے زیادہ بھاشا اور سنسکرت کو ہے دراصل یہ اس سوسائٹی کی زبان ہے، جو ہندو مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی اور سچ پوچھو تو ہندو مسلمانوں کے سابقہ اتحاد اور باہمی ربط وضبط کی ایک یادگار ہے۔

مگر ہندوستان کی پھوٹ مشہور ہے وہ اتحاد کا دشمن ہے اور نہیں چاہتا کہ دوستی و اتحاد کی کوئی یادگار بھی باقی رہے۔

مسلمانوں نے حماقت سے روز بروز تسلیم کیا کہ یہ خاص ہماری زبان ہے اور ہندوؤں نے حماقت سے سمجھ لیا کہ یہ حقیقت میں ہماری زبان نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں گروہوں کی باہمی عداوت و منافرت سے غریب اردو عجب کشمکش میں پڑ گئی ہندوؤں نے اس مالیخولیا میں مبتلا ہو کر کہ "اردو ہماری زبان نہیں" ہندی زبان کا ایک نیا لفظ اختیار کیا جو دراصل ایک اسم ہے جس کا کوئی مسمیٰ نہیں۔ اس جھگڑے سے پہلے ہندی کا لفظ صرف کاتھی اور ایک خاص قسم کے رسم خط کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ جو اکثر جاہل اور ان پڑھ دکانداروں میں مروج تھا ہندی نام کی کوئی زبان ہندوستان میں نہ تھی مگر قومی اور مذہبی سرگرمی کا جوش دکھانے کے لئے ایک ہندی زبان بنائی گئی جو کہ فی الاصل موجود نہ تھی اور نہ اس وقت تک ہے۔

لیکن جب ایک نام اختیار کیا گیا تو اس کے لئے کوئی مفہوم مقرر کرنا ضروری تھا۔ لہذا ایک نئی زبان کے پیدا کرنے کی کوشش کی جانے لگی اور اس کے لئے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا گیا۔ پڑھے لکھے لوگوں کا دستور ہے کہ جس زبان کے لٹریچر کو حاصل کرتے ہیں اس کے اکثر الفاظ

اپنی گفتگو میں شامل کر لیتے ہیں جیسے کہ فی الحال انگریزی دانوں کے زبان پر کثرت سے انگریزی الفاظ ہوا کرتے ہیں چونکہ بیشتر فارسی تعلیم عام تھی اور پڑھنا لکھنا ہندوستان میں فارسی ہی پڑھنے کا نام تھا۔ اس لئے تمام تعلیم یافتہ لوگوں کا قاعدہ تھا کہ اردو میں روز بروز فارسی اور عربی کے الفاظ زیادہ شامل کرتے جاتے تھے اگرچہ اب فارسی کی تعلیم موقوف ہو جانے سے اردو میں نئے الفاظ کے آنے کا سدباب ہو گیا ہے مگر اردو کے دشمنوں کو اس پر اطمینان نہیں ہوا۔ اور بلا لحاظ اس کے کہ زبانوں پر کون لفظ چڑھے ہوئے ہیں اور بے پڑھے بچوں اور عورتوں تک کی زبان پر جاری ہیں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اردو میں سے فارسی و عربی کے مانوس الفاظ سب نکال ڈالے جائیں اور ان کی جگہ بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ عام از نیکہ وہ بولے جاتے ہوں یا نہ بولے جاتے ہوں داخل کر دیئے جائیں اس طریقہ سے ایک نئی زبان تصنیف کی گئی اور اس کا نام "ہندی" قرار دیا گیا۔ جو دراصل نہ کسی ملک کی زبان ہے نہ کسی مذہب کی نہ کسی قوم کی اور نہ کسی گروہ کی۔ مگر زور و شور سے دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ سارے ہندوستان کی زبان یہی ہے۔

دنیا کے تمام ممالک کی طرح ممالک متحدہ میں بھی یہ نظر آئے گا کہ شہر والوں کی زبان پر جو عموماً فصیح و بلیغ اور لٹریری زبان ہوتی ہے۔

ان زبانوں کے الفاظ زیادہ ہیں جن کی تعلیم کے اثر سے زبان اردو بنی تھی۔ کیونکہ چندروز پیشتر کیا معنی آج بھی اعلیٰ سوسائٹی کی زبان یہی ہے اس کے مقابل دیہات میں ایک گنواری زبان مروج ہے۔ جس میں الفاظ تو قریب قریب وہی ہیں مگر افعال کے اشتقاق کی صورت بدلی ہوئی ہے اور فارسی کے بعض حروف اپنے مخارج سے نہیں ادا ہوتے۔ مثلاً "آتے ہیں، کھاتے ہیں، جاتے ہیں، سوتے ہیں اور آتے تھے جاتے تھے، سوتے تھے" کے مقام پر وہ لوگ "آوت ہن، کھات ہن، جات ہن، سووت ہن اور آوت ہتے، جات ہتے، سووت ہتے" بولتے ہیں۔ اور حرف خ، ذ، ز، ض، ظ کو جیم، شین کو سین، عین کو گاف، ف کو پھ اور ق کو گاف کی آوازوں سے ادا کرتے ہیں۔ بس اردو اور اس گنواری زبان میں یہی فرق ہے۔

نئی ہندی کے مصنفوں نے اس گنواری زبان کو بالکل نہیں اختیار کیا ہے کیونکہ ناگری خط کے اخبارات اور ان کی تمام کتابوں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے اس میں نہ یہ دیہاتی افعال کے اوزان اختیار کئے گئے ہیں اور نہ مذکورہ بالا حروف کے مخارج کا امتیاز دور کیا گیا ہے، کیونکہ ناگری کا حرف "جا" نیچے ایک نقطہ دے کر "ز" اور "پھا" نقطہ دے کر "ف" بنا دئے گئے ہیں لہذا اس میں ذرا بھی شک اور شبہ نہیں کہ جس زبان کو

فی الحال ہندی کہا جاتا ہے وہ یہاں کی دیہاتی زبان نہیں ہے، بلکہ ایک نو تصنیف زبان ہے جو صرف لڑنے اور دعویٰ کرنے کے لئے ہے، کوئی ایسی زبان نہیں جو کہیں بولی بھی جاتی ہو۔

مگر فی الحال مردم شماری کے موقع پر ایک بڑی بھاری غلط فہمی یہ پیدا کرائی جا رہی ہے کہ دیہات کی گنواری زبان کو ہندی بتایا جاتا ہے اور شہر کی فصیح زبان کو اردو۔ اور اس کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک میں زیادہ تعداد ہندی بولنے والوں کی ہے۔ کیا دنیا میں کوئی اور زبان بھی ہے جس میں گنواروں اور دیہات کی خراب زبان بولنے والوں سے فصیح زبان بولنے والے پڑھے لکھوں کی تعداد زیادہ نہ ہو؟ اگر یہی اصول ہے تو انگریزی، فارسی، عربی، اور میں کہتا ہوں کہ دنیا کی ساری زبانوں کا لٹریچر دریا برد کر دینے کے قابل ہے کیونکہ وہ چند خاص پڑھے لکھے فصحائے شہر کی زبان ہے جن کی تعداد غلط اور گنواری زبان والوں کے مقابل میں بہت ہی کم ہے۔

دیہات کی زبان اردو کے سوا ہرگز کوئی اور زبان نہیں ہے۔ مگر ہاں ہر ملک اور ہر قوم کے دیہاتیوں کی طرح وہ ایک خراب اور غیر فصیح زبان یا یوں کہئے کہ بگڑی ہوئی اردو ہے چونکہ آج کل باہمی اختلافات اور تعصب نے لوگوں کو سچائی اور حقیقت سے ہٹا دیا ہے۔ لہذا یورپین

حکام سے جو زبان کے مسئلے کو بخوبی نہیں سمجھتے، سمجھا بجھا کے ایسے احکام بھی جاری کرا دیئے گئے ہیں کہ دیہاتی زبان کو بھی ہندی لکھا جائے اور انھوں نے بغیر اس کا اندازہ کئے کہ جس زبان کو ہندی کہا جاتا ہے اور جو ناگری کے اخباروں اور رسالوں اور تحریروں میں برتی جاتی ہے وہ بھی دیہاتی زبان ہے یا نہیں۔ ایسے احکام بھی جاری کر دیئے ہیں لیکن ایسے غلط احکام کے جاری ہونے کے بعد مردم شماری کی رپورٹ کا ہرگز اعتبار باقی نہ رہے گا۔ اور ہرگز اس مردم شماری سے اس کا سچا اندازہ نہ ہو سکے گا کہ ملک میں کتنے لوگ اردو اور کتنے ہندی بولنے والے ہیں۔

یہی مسئلہ آج کل سررشتۂ تعلیم میں بھی چھڑا ہوا ہے اور چونکہ اسکے ارکان میں زیادہ تعداد ان ہندوؤں کی ہے جو ہندی زبان کے حامی ہیں لہٰذا مشکل سے امید کی جا سکتی ہے کہ کوئی صحیح فیصلہ ہو سکے گا۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اس جانب فوری توجہ کریں ورنہ اگر اردو زبان کے خلاف کوئی فیصلہ ہو گیا تو اردو کی ترقی کے لئے گورنمنٹ اور اہل علم نے گذشتہ دو تین سو سال میں جو کوششیں کی ہیں سب بیکار ہو جائیں گی۔

فلسفۂ حسن

حسن بالاتر از مقولات ست عاقلاں کیف وکم تراشیدند

حسن کی اگر جامع مانع تعریف کی جائے تو یہ ایک مشکل امر، یا تکلیف دہ کوشش ہے ہر قوم اور ہر ملک میں ایک جداگانہ تعریف اور جداگانہ حدحسن بیان کی جاتی ہے جب صرف انسانی حسن کی بحث کی جائے تو اس حالت میں حسن کے معانی اور بھی محدود ہو جاتے ہیں اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسانی حسن کا معیار ایک نہیں ہے انسانی حسن کے معیار مقرر کرنے میں خیالات اور مذاق کو بہت کچھ دخل ہے اور کبھی کبھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ :-

"حسن اپنی اپنی پسند کا نام ہے"

چین اور جاپان میں حسن کچھ اور معیار رکھتا ہے، ترکستان اور ایران میں کچھ اور، ہندوستان میں کچھ اور، جرمن، فرانس، روس اور انگلستان میں کچھ اور اور ان تمام اختلافات سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حسن کی دو قسمیں ہیں :-

ا۔ حسن مطلق۔ ب۔ حسن اضافی۔

نوع انسان کی جہت سے حسن مطلق میں اس قدر اختلافات نہیں ہیں جس قدر حسن اضافی میں ہیں۔ حسن مطلق کی وابستگی صرف انسانی چہرہ اور نقوش ہی سے ہوتی ہے اور حسن اضافی دیگر اعضا سے بھی وابستہ کیا جاتا ہے چین میں پاؤں کا چھوٹا ہونا ایک اضافی حسن ہے جو صرف خطۂ چین ہی تک محدود ہے دوسرے مقاموں یا دوسرے ملکوں میں اس کا کوئی اثر نہیں ہے بعض ملکوں میں سیاہ بال ایک حسن ہے۔ لیکن بعض میں بھورے بال سیاہ بالوں سے اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ فنون لطیفہ کی بحث میں گو اضافی حسن بھی شامل ہے لیکن مدار حسن مطلق پر ہے۔ فنون لطیفہ میں حسن کا مفہوم " اعلیٰ درجہ کا تناسب اور کمال یا اظہار کمال ہے یا یوں کہیئے کہ حسن ایک اعلیٰ درجہ کا تناسب یا کمال ہے اور اعلیٰ درجہ کا تناسب یا کمال ایک حسن ہے عام اس سے کہ ایسا کمال کسی صورت میں ہو۔ کمال کیا چیز ہے ؟

کسی ہستی، کسی وجود، کسی شے کا ان تناسبات سے مزین اور متناسب ہونا جو اپنی ذات میں باعتبارات مختلفہ نفاست، لطافت، موزونیت خوبی رکھتے ہوں۔ ہماری سرسری نظروں میں مواد نیچر میں ایک ابتری سی پائی جاتی ہے اور ہم بغیر مشاہدۂ کامل کے نیچر کی اندرونی خوبیوں تک

نہیں پہنچ سکتے لیکن پھر بھی نیچر میں اس قسم کے تناسبات پائے جاتے ہیں جن سے کاریگر یا صانع کی قدرت کا کمال اور خوبی ظاہر ہے کسی درخت کا ایک پتہ، کسی پھول کی ایک پنکھڑی کو بغور دیکھو کہ اس میں کس کس قسم کے جوڑ اور پیوند رکھے گئے ہیں اور ان کے تناسبات کس اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ جوڑ پیوند، رگ و ریشہ، رنگ وغیرہ ایک سوچنے والے کے لئے ایک ایسی کھلی کتاب ہیں جو اپنے صفحات میں ناظرین کی دلچسپی کے واسطے بہت کچھ سامان رکھتی ہے ؎

ہر برگ سبز در نظر ہوشیار ۔۔۔ دفترے ست معرفت کردگار

دنیا کی بڑی سے بڑی چیز لے لو اس میں بھی ایسے تناسبات پائے جائیں گے جو صانع کے کمال پر ایک زندہ شہادت ہیں وہ چیزیں اور وہ ہستیاں جنہیں بدصورت اور بدنما کہا جاتا ہے جن سے بعض طبیعتیں، چنداں دلچسپی نہیں رکھتیں، اپنی ذات میں بہت سی خوبیاں بھی رکھتی ہیں اور یہ خوبیاں بصورت موزوں تناسبات کے صانع کے کمال پر ایک برہان قاطع ہیں۔

ہر حالت میں ایک کمال پایا جاتا ہے صرف خوبصورتی ہی میں کمال نہیں ہوتا۔ بدصورتی اور زشت روئی میں بھی کمال ہے بامعان نظر دیکھو ہر بدصورتی بھی اپنی ذات میں ایک کمال رکھتی ہے۔ گو بمقابلہ فاختہ اور

کبوتر کے سیاہ رنگ کا جانور ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کوّے کی ذات میں، کوّے کے رنگ میں، کوّے کی طبیعت میں کوئی کمال نہیں ہے جو غور کرنے والے کے واسطے ایک سبق ہو۔ ساخت کے اعتبار سے، تاثیرات کے اعتبار سے، نفع و نقصان کے اعتبار سے کوّے کی ذات میں اس قدر کمالات ہیں کہ ان کے جمع کرنے سے قدرت کی حکمت بالغہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

جب قدرت کی ہر شئے میں کمال پایا جاتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ موادِ نیچر میں نسبتاً حسن موجود ہے لیکن جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ نیچر میں کوئی خوبصورتی اور حسن موجود نہیں وہ غلطی پر ہیں نیچر اور سامان نیچر میں وہ کمالات، وہ خوبیاں، وہ حسن، وہ خوبصورتی اور وہ تناسبات اعلیٰ ہیں کہ جن کا اندازہ بھی مشکل سے لگایا جاسکتا ہے۔

اگر ہم حسن کو کمال کے معنیٰ میں تاویل نہ کریں تو بہت سی اشیا اور بہت سی ہستیاں دائرۂ حسن سے نکل جائینگی۔ غلطی اس واسطے پڑتی ہے کہ ہم حسن کی تعریف اور تحدید میں غلطی کھا جاتے ہیں۔

معیارِ حسن

فنون لطیفہ کی بحث میں حسن کا معیار محض نقش و نگار ہی نہیں بلکہ

اصلی خوبی اور اعلیٰ کمال۔ یہ وہ اعلیٰ اور جامع معیار ہے کہ جس سے بدصورت اشیا میں بھی ایک خوبی اور حسن یا خوبصورتی پائی جاتی ہے یہ وہ ترازو ہے کہ جس میں تھوڑا سا کمال اور تھوڑی سی خوبی بھی تولی جاتی ہے یہ ایک ایسا معیار ہے جو اشیا کی اصلی خوبیوں اور اصلی کمالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ہر شخص خوبصورت اشیا میں خوبصورتی اور حسن دیکھنے کا مشتاق اور عادی ہے اور یہی ایک پیمانہ ہے جو ساری دنیا میں مروّج ہے لیکن جو معیار فنون لطیفہ کی بحث میں پاس کیا گیا ہے، وہ بدصورت ہستیوں اور بدنما اشیا میں بھی ایک اعلیٰ تناسب خوبی اور کمال دکھا کر قدرت کا حسن نظم ثابت کرتا ہے۔

ظاہر بیں نگاہیں چہرہ کا کتابی، گول، نقوش کا پتلا موٹا ہونا حسن خیال کرتی ہیں اور صرف انسانی نسل پر ہی اس کا خاتمہ کر دیتی ہیں فنون کا معیار اس سے کہیں اعلیٰ ہے جہاں وہ خوبی اور لطافت، نفاست کمال پاتا اور دیکھتا ہے وہیں اس کی تنقید اور تصدیق کرتا ہے یہ وہ معیار ہے جس کی بدولت دنیا میں فنون لطیفہ کی بنیاد اور داغ بیل پڑی ہے اگر یہ معیار اس قدر وسعت نہ رکھتا تو آج دنیا کی منڈی میں ایک ثمرۂ فن بھی نہ ہوتا۔

ہم انسانوں میں صرف وہی حسن دیکھتے اور وہی خوبصورتی نظارہ

کرتے ہیں جو دراصل حسن اور خوبصورتی کا ایک معمولی نمونہ ہے کیونکہ اس پر کمال کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ کمال اور خوبی کے درجے کہیں دور جاکر ختم ہوتے ہیں۔

منظر خوبصورتی

جو چیزیں ہم دیکھتے اور مشاہدہ کرتے ہیں دراصل وہ ایسی نہیں ہیں جیسا ہم ان کا احساس کرتے ہیں کبھی ہماری نگاہیں ہمیں فریب دیتی ہیں اور کبھی چیزوں اور ہستیوں کی ظاہری نمائشی حالت یا نمائشی کیفیت ہماری لغزش کا باعث ہوتی ہے۔

ہمارے مشاہدات ہمیشہ جامع اور کامل نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ ہم عارضی فن اور عارضی خوبصورتی پر شیدا ہو کر اصلی خوبی اور اصلی کمال کے مشاہدہ سے رہ جاتے ہیں بہت سی چیزیں اور بہت سی ہستیاں صرف نمائشی حسن رکھتی ہیں۔ اگرچہ ان میں اصلی حسن بھی ہوتا ہے۔ لیکن جلدبازی ہمیں اس کی حقیقت سے ایک مرحلہ تک ناآشنا رکھتی ہے۔ اور ہم ظواہر کا ہی نظارہ کر کے رہ جاتے ہیں۔ ہم ہمیشہ ظاہری حسن دیکھنے کے عادی ہیں اندرونی حسن یا اندرونی خوبصورتی بہت کم ہماری نگاہوں سے گذرتی ہے۔ انسان کا اصلی کمال رنگ و روغن اور

نقوش پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ ایک عارضی سلسلہ ہے اصلی کمال اور اصلی خوبی اس کی وہ ہے جو اس کی ذات میں مودعہ ہے۔ جو شخص صرف رنگ ہی میں حسن دیکھتا ہے وہ اس منزل اور مرکز سے ابھی دور ہے جہاں حسن کے تمام اجزا کا نظارہ ہوتا ہے۔

حسن میں تحرّک

"حسن میں جمود نہیں بلکہ ایک تبدیلی اور تحرک ہے" یہ ایک عام مقولہ ہے کہ حسن کو قیام اور ثبات نہیں۔ انسانی خوبصورتی ہی کو لیجیئے کتنے رنگ بدلتا ہے طفلی میں کچھ، شباب میں کچھ، بڑھاپے میں کچھ۔ اگر کسی حسین اور خوبصورت کے مختلف زمانوں کی تصویریں لی جائیں تو معلوم ہو جائیگا کہ رفتہ رفتہ کیا کچھ فرق ہوتا گیا ہے وہ حسین جو زمانہ بھر میں شہرت رکھتے تھے اور حسن کی خوبصورتی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ضعیفی میں ایسے گئے گزرے ہو گئے کہ کوئی دیکھتا ہی نہیں۔

حسن انسانی کا چند ایسے اسباب پر مدار ہے جو تبدیلی پذیر ہیں ان کے تغیّر سے نقشہ بدل جاتا ہے اگرچہ انسانی حسن میں ایک کمال ہے، مگر تبادلہ اسباب سے اس میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ اور ایک کیفیت نہیں رہتی۔

فنون لطیفہ میں جو حسن بہ مفہوم کمال زیر بحث ہے اس میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور اس میں بھی ایک ایسا تحرک ساری رہتا ہے جس سے اسے قیام اور ثبات نہیں اگر ایسا تحرک اور ایسی تبدیلی نہ ہو تو جس ترقی پر انسان پہنچنا چاہتا ہے یا اب تک پہنچا ہے۔ وہ قابو سے نکل جائے گی۔ فنون لطیفہ کی ترقی اس صورت میں متصور ہے کہ جب کمال یا حسن اشیا میں ایک قسم کی تبدیلی اور تحرک پایا جائے قدرت نے اشیا کی طبائع میں جو مواد بھر رکھا ہے اس پر انسان ایک دفعہ قابو نہیں پا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک کل کمالات معرض ظہور میں آ چکے ہوتے انسان رفتہ رفتہ کمالات میں ترقی کرتا اور رفتہ رفتہ ان تک پہنچتا ہے۔

تبدیلی اور تحرک کا مفہوم یہ نہیں کہ حسن اشیاء اپنا مرکز چھوڑ کر کوئی اور مرکز اختیار کرتا ہے۔ بلکہ یہ اسی مرکز میں قائم رہ کر درجوں میں ترقی کرتا جاتا ہے

حسن یا خوبصورتی کا سائنس اور فلسفہ

حسن کا ایک جداگانہ سائنس بھی ہے اور فلسفہ بھی یعنی کمال یا کسی شئے کا کمال من حیث سائنس حسن بھی ثابت کیا جاسکتا ہے

اور من حیث فلسفہ حسن بھی۔

حسن یا اس کے کمال کا فلسفہ اس کا معلوم کرنا اور اس کا پانا ہے جو شخص حسن یا اس کمال کو معلوم کرتا اور پاتا ہے وہ اسکی فلسفی پر پہنچ جاتا ہے فلسفہ کی موٹی تعریف محبّت فراست یعنی (LOVE OF WISDOM) ہے حسن کے فلسفہ کی تعریف محبّت تناسبات یعنی (LOVE OF PROPORTION) ہے جو شخص اعلیٰ تناسبات اور کمال سے محبت رکھتا ہے وہ حسن سے محبّت رکھتا ہے اور ایسا شخص ان معنوں میں فلسفی ہے۔ محبت فراست بھی ایک عظیم الشان مرحلہ ہے لیکن محبت کمال اس سے بھی زیادہ وقیع ہے۔ محبت کمال میں فراست بھی شامل ہے۔ کیونکہ جب تک ذہانت اور فراست نہ ہوگی محبّت کمال کا مادہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

حسن کا سائنس کیا ہے ؟ اس کے کمال کے موجبات اور اسباب معلوم کرنا اور ان میں جو جو نسبتیں با صول نسبت وحدت پائی جاتی ہیں ان پر غور کرنا اور ان کی تطبیق سے ان نتایج کا استنباط کرنا جو مخفی ہیں۔

عملی رنگ میں اس کمال اور اس کمال کی ایسی نسبتوں کا دکھا دینا اور اس سے اور کمالات کی بنیاد ڈالنا ایک سائنس ہے شاعری اور

مصوری ہیں نکات کا ادراک اور نکات کی ترتیب، نکات کی بندش ایک سائنس ہے، سائنس کی بنیاد تجربہ ہے فنون لطیفہ میں جو کچھ ترقیات یا خوبیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا احصار مشکل ہے ہر فن لطیفہ میں جو کچھ کمال پایا جاتا ہے وہ سب سائنس آف بیوٹی کی وجہ سے ہے۔

جو تجربہ انکشاف ادراک تناسبات سے کام لیتا ہے اور موزوں طریقہ پر انہیں ترتیب دیتا ہے تصویر میں ادائے کا پیدا کرنا اور ہو بہو اس کا تماشا اور مشاہدہ کرانا فلسفہ نہیں بلکہ سائنس حسن ہے اور اسی پر حسن کی ہستی کے اظہار اور تکسیف کا مدار ہے۔

حسن باعتبار اثر

باعتبار کشش اور اثر حسن کیا ہے؟ جو ہمیں خوش کرے۔

جو شئے، جو وجود، جو کیفیت، جو ترکیب، جو سماں ہمیشہ خوش نہیں کرتا وہ اگرچہ کسی اور کے واسطے حسن خیز ہو نسبتاً ہمارے واسطے حسن خیز نہیں ہے یا یہ کہ ہم اس میں حسن کا احساس نہیں کرتے ہمیں کونسی کیفیت خوش کرتی ہے؟ جس میں کوئی عجوبہ، کوئی کمال، دلفریب تناسبات ہوں جب تک کسی کیفیت میں یہ چیزیں نہ ہوں، ہم اس سے خوش نہیں ہو سکتے۔

حسن کی یہ ایک ایسی تعریف ہے جو تمام قسم کی خوبصورتیوں، عجائبات، نادرات اور کمالات پر محتوی ہے اس تعریف سے وہ کیفیتیں اور صورتیں بھی اس دائرہ میں آجاتی ہیں جو حسن کی تعریف عامہ میں نہیں آتیں۔ تعریف عامہ کے اعتبار سے مجموعہ ندرت اور کمال کا دائرہ نہایت ہی تنگ رکھا گیا ہے یا یہ کہ ندرت اور کمال کا مفہوم حسن اور خوبصورتی میں ایک حد تک رکھا ہی نہیں گیا جن چیزوں ہستیوں اور کیفیتوں میں ندرت و کمال پایا جاتا ہے انہیں خوبصورت اشیاء کی فہرست سے گویا نکال دیا گیا ہے یا ندرت و کمال کی ایسی تعریف کی گئی ہے جس میں عرفی حسن ہی آسکے اگر ایک حبشی کی تصویر دکھائی جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ ایک خوبصورت تصویر ہے چونکہ وہ ایک حبشی کی تصویر ہے اس لئے فرض کر لیا گیا ہے کہ اس میں کوئی حسن نہیں ہو سکتا۔

اگر ایک حبشی کی تصویر میں عرفی حسن اور خوبصورتی نہ ہو تو اس کا یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس میں کوئی ندرت اور کمال اور تناسبات بھی نہ ہوں۔ ہر ساخت میں کوئی نہ کوئی کمال اور ندرت ہوتی ہے جو اس کے واسطے ایک حسن اور خوبصورتی ہے ؎

گو حسن پر ہیں نازاں پھر و یہ گورے چٹے لیکن کوئی بلا ہے وہ سانولا سلونا

عرفی حسن اور عرفی خوبصورتی ہی ہمیں خوش نہیں کرتی اور ہمارے دل و دماغ میں کشش و متوجہ پیدا نہیں کرتی بلکہ ایک بدصورت سماں، شے یا کیفیت بھی ہمیں اپنی طرف کھینچتی اور ہمارے دل و دماغ پر اثر ڈالتی ہے نہ بطور ایک ہیبت اور خوفناک سماں کے بلکہ بطور ایک عجوبہ اور ندرت اور کمال کے۔ ہر مخلوق اور وجود کا حسن جداگانہ ہے۔ انسان کا حسن جدا ہے حیوان کا جدا، پرندوں کا جدا، درندوں کا جدا، حشرات الارض کا جدا۔ کیا انسان اور گھوڑے کا حسن ایک ہی شان رکھتا ہے؟ اور ان میں کوئی بھی نسبت ہے؟ عرف عام میں انسان کے واسطے سفید رنگ ایک اچھا رنگ ہے لیکن گھوڑے کے واسطے یہ نقرئی رنگ کوئی بھی خوبی نہیں رکھتا

قدرت نے اپنی حکمت بالغہ سے ہر مخلوق، ہر وجود اور ہر ہستی کیلئے حسن کا معیار جداگانہ رکھا ہے اس حسن کا مشاہدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب حسن و خوبصورتی کو بطور ایک کمال عجوبۂ ندرت و صحیح تناسبات سے تعبیر کیا جائے۔ کوئی کمال، کوئی عجوبہ اور کوئی ندرت ایسی نہیں جو ہمیں حیرت میں نہ ڈال سکے اور جس کے تماشا اور مشاہدہ سے ہمارے دل و دماغ میں مسرت اور خوشی کا متوجّہ نہ ہو۔

ان حالات میں جو چیز ہمیں خوش کر سکتی ہے یا ہمیں کشش کرتی

ہے وہی ایک حسن اور خوبصورتی ہے۔ جو کیفیت ہمیں خوش نہیں کر سکتی وہ اگرچہ بذاتہ حسین اور خوبصورت ہے لیکن ہمارے لئے حسن اور خوبصورتی نہیں۔

—(٭)—

ہندو مسلم اتحّاد

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ مسلمان جب تک مسلمان ہیں، اور ہندو جب تک ہندو ہیں ہندوستان میں ان دونوں قوموں کے درمیان اتحاد ممکن نہیں۔

قبل اس کے کہ اس خیال کی غلطی یا درستی پر بحث کی جائے بہتر ہوگا کہ اتحاد کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ اتحاد کا یہ مفہوم ہرگز نہیں۔ کہ دو مختلف چیزیں اپنی جداگانہ ہستی کو مٹا کر بالکل ایک ہو جائیں جس طرح پانی میں جب بہت سی شکر ڈال دی جائے تو خالص پانی باقی رہ جاتا ہے نہ خالص شکر۔ بلکہ دونوں کی جداگانہ ہستی مٹ کر ایک تیسری ہستی (شربت) تیار ہو جاتی ہے۔ جو اپنے ان دونوں اجزائے

ترکیبی سے الگ الگ ایک خاص مزہ، خاص شکل اور خاص تاثیر رکھتی ہے، اسی طرح ہندو مسلم اتحاد کے نہ یہ معنی ہو سکتے ہیں نہ اس معنی میں اتحاد کو کوئی ذمہ وار شخص بتاتا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ دونوں قومیں اپنے اپنے اصول پر، اپنے اپنے عقیدوں پر، اپنے اپنے طریقوں پر پوری مضبوطی اور آزادی کے ساتھ قائم رہ کر ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آئیں۔ ایک دوسرے کے حق میں دست اندازی نہ کریں اور جس طرح دو اچھے ہمسائے ایک دوسرے سے عقیدہ، خیالات اور طرز زندگی میں مختلف ہو کر بھی امن چین سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح یہ دونوں قومیں بھی ایک دوسرے کے امن و سکون میں خلل انداز نہ ہوں بلکہ جو چیزیں اختلاف کی حدود سے باہر ہوں ان میں ایک دوسرے کے شریک، ساتھی اور مددگار ہوں۔ فرض کیجیے ایک مسلمان کے پڑوس میں ایک بیچارہ اچھوت چمار رہتا ہے اور اس چمار کے ہاں شب میں یک بیک آگ لگ جاتی ہے۔ تو کیا اس مسلمان پر یہ فرض نہیں ہے کہ جہاں تک اس کے امکان میں ہو آگ کے فرو کرنے اور اس پڑوسی کو مصیبت سے بچانے میں مدد دے بغیر اس امر کی بحث چھیڑے کہ اس چمار کے عقائد کیا ہیں۔ ٹھیک یہی

صورت ہندو مسلم اتحاد کی ہے۔

اسے کوئی غیرت مند مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ مسلمان اپنے عقائد کو سلام کر کے ہندوؤں میں جذب ہو جائیں اور اسی طرح کوئی پختہ ہندو بھی ہندوؤں کا مسلمانوں میں جذب ہو جانا پسند نہ کرے گا۔ جس شے کو اس کے سنجیدہ، ہوشمند رہبران ملک پکار پکار کر کہہ رہے ہیں وہ صرف وہ اتحاد ہے جس کی رو سے ہر قوم اپنی قومیت کو پوری طرح قائم و برقرار رکھ کر مشترک معاملات میں ایک دوسرے کا ساجھا کر سکے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو سکے اور ایک دوسرے کے ساتھ بطور اچھے ہمسائے کے صلح و ہمدردی کا برتاؤ رکھ سکے۔ کیا کسی گروہ کے نزدیک اس معنی میں بھی اتحاد ناممکن ہے؟ کیا ایسے اتحاد کو ناممکن قرار دینے پر کوئی بھی دلیل عقلی و نقلی پیش کی جا سکتی ہے؟ کیا اس قسم کا اتحاد صدہا سال سے قائم ہوتا نہیں چلا آ رہا ہے؟ اگر ذرا بھی غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہندوؤں نے چند سو سال کی مدت میں اپنے عمل سے جس قدر اتحاد مسلمانوں کے ساتھ کر لیا ہے اس سے زیادہ کوئی قوم کسی دوسری قوم سے توقع نہیں رکھ سکتی۔ زبان کے لحاظ سے فارسی سے ہندوؤں کو کیا واسطہ تھا؟ مسلمان اس کو اپنے ہمراہ لائے اور ہندوؤں نے

اسے بے تکلف اختیار کر لیا اور ان کے ہاں فارسی کے ادیب، شاعر، لغت نویس، مصنّف سبھی پیدا ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں فارسی محاورات کا سب سے زیادہ جامع لغت جو تیار کیا، یعنی "بہار عجم" وہ ایک ہندو ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے بہت سے ہندوؤں نے عربی میں بھی کمال حاصل کیا۔ پھر فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت وغیرہ کی آمیزش سے جو جدید زبان اردو پیدا ہوئی اس کی پیدائش و ترقی میں بھی ہندو صاحبان کا حصہ کچھ کم نہیں۔ مسلمانوں کے مدرسوں میں ہندو اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے اور خوش ہوتے تھے۔

لباس کو دیکھیے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے اثر سے اپنے قدیم لباس میں کتنی تبدیلیاں کر لی ہیں اور کہاں تک مسلمانوں کے لائے ہوئے عربی، ایرانی اور ترکی لباس کو اختیار کر لیا۔ غذا کو لیجیے، کتنے نئی نئی قسم کے کھانے جن سے ہندی ذائقہ بالکل ناآشنا تھا محض مسلمانوں کی وجہ سے ہندوؤں میں رواج پا گئے۔ مکانات و تعمیرات کی ساخت، طرز ماند و بود اور عام رسوم معاشرت، تہذیب، غرض جس حیثیت سے بھی دیکھا جائے ہندو زندگی مسلمانوں سے حد درجہ متاثر نظر آئے گی۔ مسلمان فرمانرواؤں کے عہد حکومت میں بڑے بڑے فوجی اور ملکی عہدے ہندوؤں نے قبول کیے اور مسلمانوں کی

حمایت میں سینہ سپر ہو کر خود اپنی قوم اور مذہب کے لوگوں سے لڑے اور انتہا یہ ہوئی کہ بڑے بڑے ہندو راجاؤں اور سرداروں نے اپنی صاحبزادیوں کو مسلمان بادشاہوں کے ہاں بہو بنا کر بھیجا۔

پس جو قوم مسلمانوں کے ساتھ اس حیرت انگیز حد تک اتحاد کا ثبوت اپنی زبان سے نہیں اپنے عمل و کردار سے، اور چند روز کے لئے نہیں بلکہ سینکڑوں برس تک دے چکی ہے کیا اس سے یہ بدگمانی رکھنا کسی طرح بھی جائز ہو سکتا ہے کہ آئندہ وہ گذشتہ کے مقابلے میں نہایت خفیف اتحاد اور رواداری بھی گوارا نہ کرے گی۔

مسلمان بادشاہوں نے سینکڑوں سال ہندوستان پر حکومت کی۔ اس بڑی مدت میں ظاہر ہے کہ ان میں اچھے بھی ہوئے اور برے بھی، عادل بھی اور ظالم بھی، ایسے بھی جنہوں نے اپنے باپ کے مقابلے میں سرکشی اور فوج کشی کی اور ایسے بھی جو جانوروں تک کو مارنا گناہ سمجھے بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مفتوح ہندوؤں کے ساتھ فاتح مسلمانوں نے کس رواداری اور برابری کا برتاؤ کیا انہیں اپنی حکومت میں ذمہ داری اور بھروسے کے عہدے دیئے۔ ان کے حقوق اپنے برابر تسلیم کئے۔ ان کے رسم و رواج ایک حد تک خود

اختیار کر لئے۔ ان کے ہاں شادی و غم کی تقریبوں میں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ شرکت کی اور ان کے خاندانوں سے عزت و ناموس والیوں کے ڈولے اپنے ہاں اتارے اور تو اور ان کے مندروں اور عبادت گاہوں کے خرچ کے لئے اپنے ہاں سے وظیفے اور روزینے مقرر کر دیئے۔ سینکڑوں برس کے اس باہمی میل جول اور خلاملا کی تاریخی شہادت سے الگ ہو کر اس خالص مذہبی حیثیت سے دیکھا جائے تو کیا ہمیں اسلام میں اس کی روک ہے کہ غیر مذہب والوں سے آشتی و ہمسائگی کے اچھے تعلقات رکھے جائیں؟ کیا اسلام کا کوئی فریضہ کوئی شعار ایسا ہے جس کی بنا پر دوسری قوموں سے خواہ مخواہ ٹکر یا مقابلہ لازم آتا ہو؟ ہندوؤں کے عقائد اسلامی نقطۂ نگاہ سے جتنے بھی غلط ہوں یہ سب مان لینے کے بعد بھی کیا کسی مسلمان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان سے جدال و قتال شروع کر دے؟ قرآن پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے کہ منکرین اسلام سے صاف کہہ دو کہ تم جس کی عبادت کرتے ہو اس سے مجھے صاف انکار ہے اور میں جس کی عبادت کرتا ہوں اس سے تم کو انکار ہے پس تمہارا دین و عقیدہ تمہارے ساتھ اور میرا دین و عقیدہ میرے ساتھ۔

کیا اس سے زیادہ رواداری کی تعلیم اور کسی مذہب نے دی ہے؟

پھر اس سے بڑھ کر صاف و صریح ارشاد اور کہیں مل سکتا ہے کہ مذہب اور عقیدے کے بارے میں جبر و زبردستی کا کیا کام؟ ہدایت و گمراہی دونوں صاف سامنے موجود ہیں جس کا جی جو راستہ چاہے اختیار کرے اسلام کی ساری تعلیم اسی رواداری سے لبریز ہے کلام مجید کی آیات ایک دو نہیں بہت سی اسی قسم کی تائید میں پیش ہو سکتی ہیں۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آیا اسلام کے عقائد، عبادت و معاملات میں کوئی سے بھی ایسی ہے جو ہندوؤں کی دل آزاری و ناگواری کا باعث معقول طور پر بن سکتی ہے۔ اسلام کے اصل عقائد کیا ہیں؟ یہ کہ ساری دنیا جہان کا پیدا کرنے والا اور سنبھالنے والا ایک ان دیکھا خدا ہے جو بالکل اکیلا ہے، کوئی شریک اور ساجھی کسی قسم کا بھی نہیں رکھتا اور وہ رحم والا ہے حکمت والا ہے قدرت والا ہے اور علم والا ہے اس کے بالکل سچے اور محفوظ کلام کا نام قرآن ہے جس میں ہر قسم کی ہدایت درج ہے اس کلام کا لانے والا اور خدا کا پیغام ساری دنیا کے سامنے پوری طرح پہنچانے والا اس کا سچا رسول تھا جس کی زندگی پاک پاکیزہ تھی۔ اسی طرح کے سچے رسول اس سے قبل ہر ملک اور ہر قوم کی ہدایت کے لئے آ چکے ہیں جن میں سے صرف چند کے نام ہم کو معلوم ہیں اور ایک روز آخرت آنے والا ہے جب ہر شخص کو اپنے اپنے عمل و

کردار کی جواب دہی کرنی ہوگی اور اس روز نیکوں کو انعام اور بدوں کو سزا ملے گی۔ کیا ان سارے عقائد میں کوئی شے بھی ایسی ہے جو کسی ہندو یا کسی غیر مسلم کے لئے دل آزار و باعث اشتعال ہو؟

پھر کیا اسلامی عبادات میں اس کا کوئی پہلو نکلتا ہے؟ کیا موذن کا کھڑے ہو کر یہ پکارنا کہ بڑی اور اونچی بلند و برتر ذات خدا کی ہے، وہی اکیلا معبود ہے اس کے رسول محمدؐ ہیں اور لوگو! نیک بات یعنی نماز کی طرف آؤ۔ کیا کسی مسلمان کا جسم کو صاف کر کے اور کھڑے ہو کر خدا کی تعریف کرنا اور تسبیح پڑھنا اور جسم کو ایک خاص ترکیب کے ساتھ جھکانا، اور اٹھانا، کیا کسی مسلمان کا دن بھر اپنے تئیں کھانے پینے اور نفس کی خواہشوں سے روکے رہنا، کیا کسی مسلمان کا اپنی آمدنی میں سے چالیسواں حصہ یا زائد غریبوں، بیکسوں اور ناداروں کو نکال کر دینا، کیا بہت سے مسلمانوں کا سفر کر کے دنیا کے اس حصے میں جمع ہونا جہاں ایک بہت بڑے خدا پرست نے اپنے ہاتھ سے خدا کی یاد کرنے کے لئے ایک گھر بنایا تھا۔ اس گھر پر اور اس کے قریب ایک خاص طریقہ پر یاد خدا کرنا غرض اذان، وضو، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ میں سے کوئی شے بھی اگر ایسی ہو جو غیر مسلموں کے لئے باعث ایذا و آزار ہو تو خدا کے لئے اسے بیان کیا جائے۔

پھر کیا اسلامی معاملات، کیا نکاح، طلاق، وقف، وراثت وغیرہ کے جو طریقے شریعت اسلامی نے بتائے ہیں وہ غیر اقوام سے تعلقات ہمسائگی برقرار رکھنے میں خلل انداز ہوتے ہیں؟ یا اسلام نے اخلاق و آداب و حسن معاشرت سے متعلق جو ہدایات اپنے پیرووں کو کی ہیں مثلاً سچ بولنا، چوری نہ کرنا، پاکباز رہنا، انصاف کرنا، شراب سے بچنا، سود کا لین دین نہ کرنا، جھوٹی شہادت نہ دینا، والدین کی عزت کرنا، شوہر کا حکم ماننا، بیوی کی خاطر کرنا، اس قسم کے احکام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان صلح و امن، اتفاق و اتحاد کی راہ میں حارج ہیں۔

آج جو مسلمان بھائی ہندو مسلم اتحاد کا نام سن کر سر ہلاتے اور چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور اس اتحاد کے ناممکن ہونے کا زور و قوت کے ساتھ حکم لگاتے ہیں براہ کرم ذرا سکون قلب کے ساتھ ان گزارشوں پر غور کریں اور اشارہ فرمائیں کہ اسلامی عقائد ہیں، اسلامی عبادات ہیں، اسلامی معاملات ہیں، اسلام کے احکام ہیں، اسلام کی تعلیمات ہیں، اسلام کے قانون ہیں، آخر وہ کونسی شے ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے تعلقات ہمسائگی، مصالحت و آشتی کو ناممکن بنائے ہوئے ہے؟ دوستی، دلی الفت و محبت کا سوال، ظاہر ہے کہ

بالکل الگ ہے اس کا نہ کوئی دعویٰ کرتا ہے نہ وہ بحث ہے گفتگو جو کچھ ہے وہ اتحاد کے ان حدود کے اندر ہے کہ مسلم اور ہندو دونوں اپنے مذہب پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہ کر بھی ایک دوسرے کے ساتھ اچھے ہمسایہ کی طرح، اچھے رفیق سفر کی طرح خوشگوار و ہمدردانہ برتاؤ رکھ سکتے ہیں۔

یہ خاکہ تو مذہب اسلام کی خصوصیات کا تھا ہندو مذہب کی خصوصیات کوئی ہندو صاحب ہی صحیح طور پر بیان کر سکتے ہیں تاہم جہانتک ایک بیرونی شخص کو واقفیت ہو سکتی ہے بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح مذہب اسلام میں کوئی ایسی بات ذرہ بھر بھی نہیں موجود ہے جو دوسروں کے لئے اشتعال انگیز ہو اسی طرح ہندوؤں کا مذہب بھی ایسے امور سے پاک ہے جو مسلمانوں کا ان سے مقابلہ و تصادم کر دیں۔

ایسی صورت میں اگر دونوں فریق آپس میں لڑ بیٹھتے ہیں اور اس کا ذمہ وار اپنے مذہبی اختلافات کو ٹھیراتے ہیں تو ظاہر ہے کہ مذہب کو ذمہ وار ٹھہرانا کسی معنی میں بھی درست نہ ہوگا نفاق و جنگ کی ذمہ واری ان چیزوں پر آتی ہے جو مذہب سے بالکل الگ ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ ان چیزوں پر جنہیں غلطی سے کسی فریق نے

یا دونوں فریقوں نے اپنے مذہب کا جزو سمجھ لیا ہے۔

(۵)

اُردو افسانوں کا مستقبل

اُردو افسانہ نگاروں کو چند مشورے، فن لطیفہ کے آئندہ رجحانات، اردو افسانہ نگاری کے عام معیار کو بلند کرنے کی ضرورت۔

فن افسانہ نگاری کی یاددہی کے قابل چند امور ہیں۔ جن پر عمل کرنا ایک مہتم بالشان مستقبل تیار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ افسانہ نگار کو سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح اپنے قصہ میں دلچسپی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح قصہ گوئی کے وقت کشادہ روئی بھی عجیب کام کر جاتی ہے اگر افسانہ نگار کو مسخرہ نہ بن جانا چاہیئے تو یہ کب جائز ہے کہ رونی صورت، افسردہ دلی اور بیزار ہاتھوں سے قصہ کا آغاز کیا جائے۔ اگر قصہ حزنیہ ہے تو ہوا کرے۔ خود حزنیہ میں بھی ایک رفعت ایک سربلندی مضمر ہوتی ہے جس سے

قصے کی عمر بہت طویل ہو جاتی ہے لیکن اس کا خیال رہے کہ جذبہ قصوں میں بھی مسلسل رنج و غم ناموزوں سے احتیاط برتنی چاہیے کہ قصے سے تکلف اور بناوٹ کے آثار نمودار نہ ہوں۔ قصہ نگار کی علمیت، مذاق سلیم، زبان پر اقتدار، یہ تمام امور بالکل بے ساختہ اور فطری طور پر ظاہر ہوں۔ بیشک ناول نگار کو اس بات کی اجازت ہے کہ اپنے ہمدردانہ احساس، جوش اور معلومات کے ذخیرہ کو فراخ دلی کے ساتھ استعمال کرے یہاں بخل سے کام لینا معیوب ہے اس کو کبھی اس بات کا خوف نہ کرنا چاہیے کہ ایک افسانے میں بے روک خرچ کرنے سے اس کی معلومات ختم اور اس کے تخیلات کی سوتیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گی۔

اس میں شک نہیں کہ افسانہ نگاری میں بہت سارے اہم امور کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے تاہم افسانہ نگار کے لئے ایک تسلی ضرور ہے کہ افسانہ نگاری کے ذریعہ عزت اور دولت کمانا اور خود عروس شہرت سے ہمکنار ہونا بہ نسبت دیگر فنون لطیفہ کے نہایت آسانی سے ممکن ہے۔ موسیقی کے گھر انگ میں پڑ کر کمال حاصل کرنے کے لئے عمر نوح چاہیے۔ تمام متمدن ممالک میں اعلیٰ پایہ مصور ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ مجسمہ سازی میں قدیم اطالوی ماہرین سے آجتک

کوئی نہیں بڑھ سکا اس میں شک نہیں کہ افسانہ نگار بھی بیحد پیدا
ہوتے ہیں لیکن ان میں سے زندۂ جاوید ہستیاں بہت کم نکلتی ہیں
شاعری میں دوسرے اور تیسرے درجہ تک پہنچنا بھی جان جوکھوں
کا کام ہے لیکن اگر ایک مبتدی بھی نہایت بااصول افسانہ لکھے تو
اس کو چھوٹے بڑے سب خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہیں بہتیر
افسانوں کی شہرت فوراً ہو جاتی ہے اس کے علاوہ فنون لطیفہ میں
سے ہر ایک فن خاص گروہ کے متعلق ہے لیکن افسانہ شعر کی طرح
ہر فن اور پیشہ والے کے لئے یکساں دلچسپی کا مواد رکھتا ہے کبھی کبھی
اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ مانگ جلد بازانہ اور خام پیداوار کے
بازار میں لانے کا باعث ہوتی ہے۔ حصول شہرت کبھی حصول دولت
کے ہم معنی نہیں ہو سکتی اس لئے کسی افسانہ نگار کی فوری شہرت
اس بات کی ذمہ وار نہیں کہ وہ فوراً دولت مند بھی بن جائے بدقسمتی
سے آج کل کسی کی کامیابی کو اس کی محصلہ دولت کے فیتے سے ناپنے
کا خیال مرض وبا کی طرح پھیل رہا ہے گو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی
کامیاب افسانہ نگار کے تصنیفات کی فروخت بھی زیادہ ہوتی ہے
لیکن اس کو کلیۃً قرار دینا غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی بڑے مصنّف کا
کمال ہی اس کی ہر دلعزیزی کے منافی ہو :-

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

ہم کو یقین ہے کہ ایسا مصنف تاجروں کے لئے دولت کمانے کا ذریعہ نہیں بن سکتا گو اس کے کارنامے کسی عالم کے کتب خانے کے لئے سرمایۂ ناز ہوں اگر اس کی عظمت اس کی حاصل کردہ دولت کے پیمانہ سے ناپی جائے تو غریب بعض ایسے لوگوں کے مقابلے میں نہیں آسکتا جن کی عقلیں اس کی آدھی اور جن کی ہر دلعزیزی اس سے دگنی ہے لہذا یہ صریحی نتیجہ ہے کہ عوام کے مذاق سے دوری ہمیشہ فن میں ناکامی کے مترادف نہیں ہو سکتی۔ افسانہ نگار اپنی تصنیف کی کامیابی کا اندازہ کسی طرح لگا سکتا ہے ایک مطرب کی طرح راگ ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے سامعین کے تیور سے ان کے لطف کا حال معلوم کر سکتا ہے۔ اخبارات و رسائل میں تنقیدوں کو پڑھ کر دوستوں کی رائے سے واقف ہو کر ان کے تیور کے مطالعہ سے یا سب سے بڑھ کر خود اپنے ضمیر کے اشاروں سے اس کا پتہ لگا سکتا ہے کہ وہ کہاں تک کامیاب رہا۔ بدنصیب ڈراما نگار اس بات کی شکایت کر سکتا ہے کہ اس کے ڈراما کو بدترین طور سے پیش کیا گیا لیکن بدترین طرز میں پڑھنے سے بھی افسانے کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اگر کوئی افسانہ نگاری میں پہلی کوشش میں

ناکام رہے۔ تو اپنی خطا کا اعتراف اس پہ لازم ہے اور جب دوسری کوشش میں بھی وہ اپنی اگلی خامیوں کی تلافی نہ کرسکے تو اس کا خاموش ہی رہنا زیادہ مناسب ہے ایک خراب ناول پر محنت شاقہ اور طباعت واشاعت کے بار اٹھانے کے بعد ناول کی کسمپرسی اور ذلت ایک ذی شعور مصنّف کے لیے موت ہے تاہم اگر یہ ٹھوکر اس کو غفلت سے چونکا دے اور اپنی خامیوں کی جانچ پڑتال کی طرف متوجہ کردے تو ساری زحمت رحمت سے بدل جائے گی۔

والٹربیسٹ کہتا ہے "کہ ہر ناشر عمدہ تصنیف کا خواہاں ہوتا ہے جب کوئی مسودہ اس کے ہاتھ میں آتا ہے تو دماغ پر زور دے کر اس میں اسقام ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہے اور ادائے معاوضہ کے وقت وہ انہیں اشخاص کو ترجیح دیتا ہے جن کی تصنیفات میں کچھ خوبی موجود ہوتی ہے اسی لئے اس کا خیال ہے کہ افسانے کے سرانجام پانے کے بعد اس کو کسی قابل ناشر کے پاس بھیج دینا مناسب ہوگا۔ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر"۔ اس کا یقین ہے کہ اگر تصنیف میں کچھ صلاحیت موجود ہوگی تو ناشر اس کے قبول اور شائع کرنے سے دریغ کرے گا اگر تصنیف میں قابلیت اپنی جھلکیاں دکھاتی رہے تو مصنّف کی گمنامی اس پہ کچھ اثر نہیں

ڈال سکتی۔ مشہور ناشر، بدنام کنندہ تصنیفات کو اپنے نام کے ساتھ وابستہ کر کے اپنی شہرت کو برباد کرنا نہیں چاہتے۔ ایسی صورت میں ہم افسانہ نگار کو کبھی یہ رائے نہیں دے سکتے۔ کہ وہ اپنے اخراجات سے اس کی اشاعت کا درپے ہو۔

بعض اشاعت خانے ایسے بھی موجود ہیں جو کم رتبہ افسانوں کو سستے داموں مول لے کر شائع کر دیتے ہیں اور اس طرح ایک بڑی تعداد ہیچ پوچ افسانوں کی ہر روز معرض وجود میں آتی ہے، جو اس فن کے لئے نہایت مہلک ہے اسی لئے اس فن کے پرجوش حامیوں سے ہماری درخواست ہے کہ ایسی تصانیف کو جہاں تک کم کرنے کی فکر کریں۔ تاکہ اس فن کے مخالفین کے لئے مواد جمع نہ ہو سکے۔

جب کسی افسانے کو اشاعت خانہ روانہ کیا جائے اور ناشر طباعت کے اخراجات طلب کرے تو سمجھ لو کہ اس میں کوئی سقم ہے بہتر ہوگا کہ ایسے افسانے کو شائع کرنے کا خیال دل سے نکال ڈالا جائے۔ یا کم از کم اس وقت تک تامل کیا جائے، کہ کسی کامل فن کی رائے سے اس میں اصلاح نہ کر لی جائے اگر افسانے کی از سر نو تبدیلی ناممکن ہو اور اس میں کوئی صلاحیت بھی نظر نہ

نہ آئے تو اس کو آگ کے حوالہ کر کے نئے قصے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہیے ورنہ ایسا قصہ مصنف اور فن کے لئے مضر ثابت ہوگا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر ایک علم و فن کی طرح افسانے کے لئے بھی اپنے آپ کو وقف کرنے والے سنجیدہ مصنفین موجود ہوں جن کا مقصد واحد انسان کے اطوار و افعال اور معاشرت کا مطالعہ اور لوگوں کے رجحانات و خیالات اور خوش اعتقادیوں کا مشاہدہ ہونا چاہیے ان کا یہ فرض ہو کہ اپنے خاص زاویۂ نظر سے ان تمام اثرات پر غور کریں جو انفرادی اور مجموعی طور پر نسل انسانی پر عمل کر رہے ہیں۔ وہ ہر وقت ایک جاسوس کی طرح چوکنے، ایک وکیل مجرم کی طرح چست اور ایک ناشر کی طرح ہر قسم کی معلومات کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار رہیں۔ اور یوں اپنی نظر کو اس قدر وسیع کر لیں کہ ان کے سامنے کوئی شئے جو انسان کے متعلق ہو کم رتبہ، حقیر اور ناقابل توجہ نہ معلوم ہو۔ جب اس قدر احتیاط برتی جائے گی تو یقین ہے کہ افسانوں کا مستقبل نہایت شاندار ہو جائے گا۔ انگریزی زبان میں ناول نگاری کا فن بہت ترقی کر چکا ہے اس لئے نہایت مناسب ہوگا اگر اردو ناول نگار بجائے نئی ناولیں لکھنے کے ابتدا میں انگریزی ناولوں کو اپنی طرز

معاشرت اور تہذیب کے مطابق تبدیل کر کے اردو میں منتقل کر دیں
اس سے انگریزی ناول نگاری کے بہت سے راز اردو والوں پر
بے نقاب ہو سکیں گے۔

یورپ کے ایک نقاد حسن کاری، صناعی اور آرٹ کی رائے ہے
کہ چند سال بعد یورپ کے صنّاع اپنی مبالغہ آمیزیوں سے اکتا کر
غیر متناسبانہ کارناموں سے گھبرا کر اور مغالطات اور دھوکہ بازیوں
سے بیزار ہو کر یونانیوں کے سادہ اور صداقت شعار ادبی کارناموں
کی طرف پھر متوجہ ہونگے اور انہی سر چشموں سے اپنی تشنگی کو
بجھائیں گے۔ پر تکلف، تکلیف دہ طریقوں کی جگہ سیدھے اور
آرام دہ راستے اختیار کیے جائیں گے اپنی دماغی پیداوار کو حسن و
نزاکت کی دیوی کے قدموں کے سامنے ڈال دینگے گویا وہ شے جس
کا آغاز سادگی سے ہوا انتہا سادگی پر آکر دم لے گی۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر فن میں کاملین کی تعداد نہایت محدود ہوتی
ہے شاید سو دو سو میں ایک دو نکل جائیں۔ یہ بہت ممکن ہے۔ کہ
بعض صنّاع جن کو ہم کامل فن سمجھتے ہیں آئندہ نسلوں کے سامنے
طفل مکتب معلوم ہونے لگیں لیکن بعض قدیم افسانہ نگاروں کے
متعلق ہمارا حسن ظن ہے کہ وہ زوال کی منزل سے آگے بڑھ گئے

ہیں ان پر نہ مرورِ زمانہ کا اثر ہو سکتا ہے اور نہ تبدیلِ مذاق کا، بلکہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا ان کی عظمت میں اضافہ ہوتا جائیگا۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے شہ کار کے ساتھ زندہ رہے گا۔ جب تک اردو زبان میں باغ و بہار، فسانۂ آزاد، مرآۃ العروس، فردوسِ بریں اور امراؤ جان ادا باقی ہیں میر امّن، رتن ناتھ سرشار، حافظ نذیر احمد عبد الحلیم شررؔ اور مرزا ہادی رسواؔ کی عزت کبھی ہمارے دل سے دور نہیں ہو سکتی۔

ہر ایک حامیِ فن کی یہ خواہش ضرور ہو گی کہ جس طرح نمائشِ تصاویر میں بدنما ہونے کم ہوں اسی طرح مخربِ اخلاق قصوں میں بھی نمایاں کمی ہوتی جائے اور افسانہ نگاری کا عام معیار بلند ہو جائے اس لیے ہم جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ وہ فن جس کی بنیادیں صحیح اصولوں پر قائم کی جائیں کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتا۔ وہ فن جس میں میر امّن، رجب علی بیگ اور سرورؔ اور حافظ نذیر احمد نے امتیاز حاصل کیا، جس نے عبد الحلیم شررؔ، راشد الخیری، پریم چند اور سدرشن جیسے ماہرینِ فن پیدا کئے اور جس میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور حسن نظامی وغیرہ نے قدم رکھا ایک ایسے شاندار مستقبل کی خبر دے رہا ہے جس میں نہ صرف افسانے بلکہ سارے

تخیلی کارنامے فنی نزاکتوں سے مملو ہونگے، قدیم قصوں میں نئی روح نئے اشخاص قصہ کے ذریعہ پھونکی جائے گی۔ ڈراما جس میں بادشاہوں اور شہزادوں ہی کے لئے جگہ تھی اپنے حدود کو وسعت دے کر عوام کو بھی اس میں شامل کر لے گا۔ تو اس کا منشائے تخلیق بھی پورا ہو جائے گا۔ اعلیٰ طبقوں میں حسن اور دلچسپی ان کے پرشکوہ لباس اور روایتی اعتقادات کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ ظاہری رعب و داب ادنیٰ طبقوں کی دسترس سے باہر ہیں لیکن ان کا اخلاص اور سادگی اعلیٰ طبقوں میں نہیں، اور اصل تو یہ ہے کہ قصہ کے اصلی مواد کو ہم خواہ ادنیٰ طبقات میں تلاش کریں یا اعلیٰ، حسن و عشق، ایثار و نیکی کا احساس، بدی کے مرقعے ہر جگہ دستیاب ہونگے اگر افسانہ نگار کی آنکھ اس قدر بصیرت والی نہ ہو کہ اسے :-

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل

تو مجبوراً کہنا پڑے گا :-

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اور جب افسانہ نگار باوجود اصول فہمی کے بہترین قصے پیش نہ کر سکے تو اس کی فطری کوتاہی پر اس کے سوا ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں :-

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

آخر میں ہم ایک ماہر فن افسانہ نویس کی چند ہدایات پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کو بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اردو ناول کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے انہیں استادان فن کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیئے ان کا فرض ہے کہ طبائع انسانی کا نظر غائر سے مشاہدہ کریں اور سچے جذبات کے نمونے پیش کریں۔ پبلک کا ادبی مذاق روز بروز اونچا ہوتا جاتا ہے اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان میں بھی وہی خوبیاں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ جن کی ان کی نگاہیں عادی ہو رہی ہیں۔ بندشوں میں جدت، خیالات میں تازگی، جذبات میں عمق، یہ اچھے ناول کے ضروری لوازم ہیں۔ ناول لکھنا آسان کام نہیں ہے شاید کسی صنف ادب میں اس قدر جدت خیال، اس قدر دماغی انہماک اور اس قدر زور تخیل کی ضرورت نہیں۔ انہیں راتیں خیال میں ڈوب کر کاٹنی ہونگی انہیں تنہا صبح و شام پر فضا مقامات میں سیر کرنی ہوگی۔ انہیں ساتذہ کے کلام کی خوشہ چینی کرنی ہوگی تب کہیں ان کے قلم سے پر زور ناول نکلے گا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب پبلک بیدلانہ کوششوں سے آسودہ ہو جاتی تھی، لوگوں کی نقادانہ نگاہ اب پختہ ہوتی جاتی

ہے۔ ہمارے ناول نویس اگر زندہ رہنا چاہیں تو انہیں زمانے کے ساتھ ساتھ قدم بڑھانا چاہیئے۔

(پ)

گوشہ عافیت

کہتے ہیں۔ "ہیچ آفت نہ رسد گوشہ تنہائی را" اور واقعی اگر خدا نصیب کرے تو اس سے زیادہ لطف کسی جگہ نہیں آسکتا۔ وہ پر فضا چمن جس میں باغ قدرت کے ناز آفریں یعنی شاہدان گل اپنی رعنائی و دلفریبی کی ادائیں دکھا رہے ہوں اور جہاں گل وبلبل کے ناز و نیاز انسان کے دل میں عشق کی گدگدی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لاکھ فرحت بخش اور مزہت افزا بتائے جائیں مگر اس کنج تنہائی کا مقابلہ نہیں کر سکتے جہاں ہمارا مضطرب و منتشر دل دو گھڑی کے لئے رنج وراحت دونوں کو بھلا سکے اس میں شک نہیں کہ صحن چمن کی دلچسپیاں بہت کچھ سامان فرحت پیش کرنے کو تیار ہیں۔ سبزے نے ایک مخملیں فرش بچھا رکھا ہے جس پر دل راحت طلب

چاہتا ہے کہ بے تکلف لوٹ جائے سرو اپنی کشیدہ قامتی پر نازاں ہے اور اس معشوقانہ ادا سے ٹھٹکا کھڑا ہے گویا ایک معشوقۂ فتنہ قامت ہے کہ جی میں آتا ہے بے اختیار دوڑ کے گلے لگا لیجئے۔ غنچوں کی شرم آمیز مسکراہٹ اور پھولوں کی حد اعتدال سے گذری ہوئی ہنسی میں وہ قیامت کی دلبری و دلربائی ہے کہ لاکھوں دفعہ منہ چومیے اور جی نہیں بھرتا۔ نسیم سحر اس مستانہ روی کی شان سے نونہالان چمن کو چھیڑتی اور پھولوں کو گدگداتی ہوئی آتی ہے کہ ہر ایک کا دل بے قابو کر دینے کے لئے کافی ہے الغرض صحن چمن میں یہ اور اس سے بھی زیادہ سامان دلچسپی موجود ہیں مگر وہ چیز نہیں جو اس گوشۂ عزلت میں ہے جہاں نہ کوئی فکر ہو نہ کوئی غم۔ نہ کسی کا خوف ہو نہ کسی بات کا اندیشہ۔

کنج عزلت اگر مل جائے اور نصیب ہو سکے تو وہ دنیاوی جنت ہے جس کی محدود مملکت میں ہمیشہ امن و امان قائم رہتا ہے اور جس کی تنگ وسعت پر ہر زمانے بے فکری و بے غمی حکومت کرتی ہے۔ آزادی و بے پروائی کی وسعت کا تم بخوبی اندازہ کر سکتے ہو مگر اصل یہ ہے کہ اسی تنگ دائرے میں اس کا نشو و نما ہوا ہے اور اسی کنج عزلت اور خلوت گاہ خیال سے نکل کے وہ ساری دنیا پر حکمران ہوئی ہے۔

شاہی محل کو تم سب سے بڑا عشرت کدہ اور راحت و آسائش کا سب سے بڑا مرکز و مامن خیال کئے ہوئے ہیں مگر یہ غلطی ہے بیشک وہاں بڑی بڑی کوششوں اور نہایت اہتمام سے ہر قسم کا سامان عیش فراہم کیا گیا ہے ادنیٰ ادنیٰ خواہش کے پورا کرنے کو ہزاروں خادم و غلام دوڑنے لگتے ہیں اور دلربائی و دلفریبی کو صدہا ماہ وش و پری چہرہ کافرادائیں موجود ہیں موسمی تغیرات پر بھی عشرت پرستی غالب آگئی ہے نہ گرمیوں میں گرمی محسوس ہوتی ہے اور نہ جاڑوں میں سردی۔ برسوں کی آرزوئیں گھڑیوں میں پوری ہوتی ہیں۔ اور عمروں کے حوصلے دم بھر میں نکل آتے ہیں۔ یہ سچ ہے مگر وہ سچی راحت اور حقیقی خوشی جو گوشۂ عافیت میں حاصل ہو سکتی ہے یہاں نام کو بھی نصیب نہیں وہ تاجدار سر جس کے آرام اور عشرت پرستی کے لیے یہ سب سامان فراہم کیا گیا ہے ایسی ایسی روح فرسا اور جانگزا فکروں سے بھرا ہوا ہے کہ کسی مسرت اور کسی سامان عشرت سے لطف نہیں اٹھا سکتا۔ ایک طرف سے اندرونی جھگڑوں، دغاپسند امرا کی بغاوتوں اور رعایا کی بے انتہا اور مسلسل شکایتوں کا ہجوم ہے اور دوسری طرف بیرونی دشمنوں اور سرحدی فتنہ پردازوں کا اندیشہ۔ مگر اُن دل پریشان کرنے والی فکروں کو اس سادے اور آزاد دربار میں

بالکل جگہ نہیں مل سکتی جسے ہم کنج تنہائی کہتے ہیں۔

سچ ہے کہ حکمرانی کے قصر میں آرزوئیں اور تمنّائیں بظاہر بہت آسانی سے پوری ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ آرزوئیں اور تمنّائیں، اگر غور و تامّل کی نگاہ سے دیکھئے تو ہندو دیو مالا کے وہ بیجیا زندگی والے راکشس ہیں جن کو قتل کرتے تو ان کے خون کے ہر قطرے سے ایک نیا راکشس پیدا ہو جاتا۔ یہی حال ان شاہی قصر کی ہوسوں کا ہے کہ ایک تمنّا بر آتی ہے تو صدہا پیدا ہو جاتی ہیں ایک ارمان نکلتا ہے تو دل پر آرزو پر ہزارہا نئے ارمانوں کی یورش ہو جاتی ہے جنہیں تم اپنے خیال میں یہ سمجھتے ہو کہ شاہد آرزو کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ان کی ہوسوں کا سلسلہ دامان قیامت سے ملا ہوا ہے یا قائلین دہر کے اس سلسلۂ دور و تسلسل سے وابستہ ہے جو ایک لا متناہی زمانے تک چلا گیا ہے اور کبھی پورا ہونے کو نہ آئے گا۔

اب اس شاہی قصر اور اس کے ساتھ ہی امرا کے تمام عیش خانوں کو انہیں پریشانیوں اور تردّدات کے حوالے کر کے صوفیوں کی ان خانقاہوں میں چلو جو علائق دنیوی کے ترک کرانے اور افکار زمانہ سے نجات دلا دینے کا وعدہ کرتی ہیں یہاں دعوے تو بڑے بڑے سننے میں آئیں گے بلکہ ظاہری حالت اور پہلی نظر یقین دلا دے گی کہ اگر

بے فکری اور بے غمی کہیں نصیب ہو سکتی ہے تو یہیں اور دنیاوی افکار و آلام اور اس مادی زندگی کی پریشانیوں اور غمگینیوں کی دوا کسی جگہ مل سکتی ہے تو اسی تنگ حجرے میں۔ مگر نہیں یہ محض دھوکا ہی دھوکا ہے معتقدین کی حکمبرداری، مریدوں کی دلالی اور خوش عقیدہ دولت مندوں کی فیاضانہ خدمتگذاری نے نفس ایسے موٹے کر دیئے ہیں کہ یہاں کی ریاکارانہ گلیم کے کونوں میں وہ بیہودہ ہوسیں اور ایسی ایسی ذلیل آرزوئیں بندھی ہوئی ہیں جو شاید تاجداروں کے خیال میں بھی نہ گزری ہونگی اور جنہیں ہم سے نفس پرست بھی گوشۂ خاطر میں جگہ دیتے شرماتے ہیں۔

وہ ذلیل اور معمولی ہوا کے جھونکوں میں اڑ جانے والا جھونپڑا جسے کم حیثیت فقیر اور بھیک مانگنے والے قناعت پسند گوشہ گیر نے جو نہ مقتدائی کا دعویدار ہے اور نہ مریدوں سے اپنے زہد و عبادت کا ٹیکس وصول کرتا ہے ایک غیر آباد مقام میں اور کسی سنسان سڑک کے کنارے ڈال لیا ہے شاید گوشۂ عافیت کہا جا سکے بظاہر ہمارے خیالی عزلت کدے کی اس شخص نے پوری اور سچی تصویر اتار لی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی بالکل نقلی ہے بلکہ نقل بھی نہیں، یہ کہنا چاہیے کہ منہ چڑھاتا ہے اس شخص نے بیفکری و بے غمی کا منہ چڑھا

دیا ہے اور دل میں اتنی ہوسیں بھری ہیں کہ ایک ایک کے سامنے دست سوال پھیلاتا ہے اور نہیں پھیلا چکتا اور نئی اور تازہ آرزوؤں کا خواب دیکھتا ہے اور ہر گھڑی اپنی بے بالگی پر پچھتایا کرتا ہے۔ کبھی شہوت پرست امرا پر حسد کرتا ہے اور کبھی ہوس پرست مرید کرنیوالے زاہدوں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے خلاصہ یہ کہ یہاں بھی وہ آزادی و بے غمی کا گوشۂ عافیت نہیں جو دراصل دنیاوی جنت کہے جانے کے قابل ہے۔

ہم اپنی آرزو مندیوں کے مقام سے بیٹھ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں بہت سے لوگ نظر آتے ہیں جو بظاہر کامیاب و شادکام ہیں اور اس زندگی سے فائدہ اٹھاتے معلوم ہوتے ہیں جو بات کہ صرف گوشۂ عافیت میں نصیب ہو سکتی ہے کسی کو دولت وصل سے کامیاب اور معشوقۂ ناز آفریں سے ہمکنار دیکھ کے ہمیں اپنی ہجراں نصیبی یاد آتی ہے اور دل کو ایسا صدمہ ہوتا ہے کہ زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں لیکن ذرا تامل کریں غور سے دیکھیں اور اس بامراد عاشق کے دل و دماغ کو ٹٹولیں۔ تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جسے ہم کامیاب سمجھے ہیں اپنے خیال میں بالکل محروم القسمت ہے اور زبان حال سے پکار کر کہہ رہا ہے:-

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بے وفائی جاناں کا کھٹکا، رقیب روسیہ کی دراندازیوں کا اندیشہ مفلسی و ناداری کی فکر اور امارت و عزت کی ہوسیں اسے اس قدر گھبرائے ہوئے ہیں کہ ایک گھڑی کو بھی چین لینے نہیں دیتیں۔

وہ بہادر افسر فوج جو فتح و نصرت کے پھریرے اڑا رہا ہے جس نے دشمن کی دارالسلطنت کے برجوں پر بھی اپنا جھنڈا قائم کر دیا اور سپہگری و شجاعت کا تمغہ حاصل کرنے کو ہے اگرچہ ظاہر میں بہت خوش ہے مگر اس کی فکریں اس تھوڑی دیر کی خوشی سے بدرجہا زیادہ بڑھی ہوئی ہیں ہر وقت خوف لگا ہے کہ کہیں ساری ناموری اور عزت خاک میں نہ مل جائے اور معاملہ بن کے نہ بگڑ جائے اور اگر بالفرض یہ اندیشہ بھی نہ ہوا تو عمر کے زیادہ گزر جانے کا صدمہ ہے اور دل ہی دل میں غم کھا رہا ہے کہ افسوس عمر ہو چکی ہے اور اس شہرت و ناموری و اپنی قوت بازو کی حاصل کی ہوئی عزت و حرمت سے فائدہ اٹھانے کا بہت ہی کم موقع ملے گا۔ الغرض تم نے یہاں بھی دیکھ لیا۔ کہ اصلی اور بے غل وغش آسایش اور سچی بےفکری و بےغمی نہیں نصیب۔

وہ آوارۂ وطن جو مدتوں خانماں برباد رہا جس نے برسوں دشت غربت میں خاک اڑائی اور اب آوارہ گردی و بادیہ پیمائی میں عمر عزیز کا بہت حصہ صرف کر کے سواد وطن میں داخل ہوا ہے اور یاران وطن سے

بغلگیر ہو رہا ہے اکثروں کے خیال میں نہایت ہی شاداں و فرحاں ہے
اور اے آوارگان دشت غربت! اور اے یاران وطن کی صورت کو ترسنے
والے! تمہیں اس کا اطمینان بہت ہی کھٹکتا ہوگا مگر محض بیکار اور
ناحق گنہگار ہوتے ہو۔ یہ جو تم سمجھتے ہو کہ فکریں اس کے دل سے دور
ہیں بالکل غلط ہے جو مصیبتیں وطن اور یاران وطن کی دیکھتے ہی اس
کے سر پر آپڑی ہیں تمہاری مصیبتوں سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ جن
احباب سے ملنے کا شوق اسے ہمت دلا دلا کے لایا ہے اور جن کی مانوس
اور محبت بھری صورتیں ہر منزل اور ہر دشت میں اس کی نظر کے سامنے
رہی تھیں ان میں سے بعض کو تو دنیا ہی نے رخصت کر دیا بعض پہلے
اچھی حالت میں تھے اور اب محزون و مغموم ہیں بعض کو جوان و تندرست
دیکھنے کا آرزو مند تھا مگر آ کے دیکھا تو بوڑھے اور ناتواں ملے الغرض اسی
طرح کی ہزارہا پریشانیاں ہیں جنہوں نے وطن کی صورت دیکھتے ہی
دل کو آ کر گھیر لیا ہے اور اتنا بھی موقع نہیں دیتیں کہ اپنی کامیابی پر
دو گھڑی خوش ہو لے۔ قطع نظر اس کے خانہ داری کی ہزارہا فکروں نے
آ کے ہجوم کیا ہے اور ایسا پریشان کر دیا ہے کہ اس بادیہ پیمائی و غربت کو
وطن اور یاران وطن کی زیارت پر ترجیح دینے لگا ہے بہر تقدیر معلوم
ہو گیا کہ جو اطمینان و فارغ البالی اور جو حقیقی مسرت و خوشی گوشہ عزلت

میں حاصل ہو سکتی ہے اس آوارۂ وطن کو بھی وطن پہنچ کے نہ نصیب ہوئی۔

غور طلب یہ امر ہے کہ گوشۂ عافیت میں کیا خوبیاں ہیں کہ جو لطف اس میں ہے نہ کسی بادشاہ کو اپنے دربار میں مل سکتا ہے اور نہ مرشدوں کو عالی مرتبہ خانقاہوں نہ اس کا مزہ دولت مندی اور عشرت پرستی کے عالیشان قصروں میں ہے اور نہ فقیروں کے جھونپڑوں میں۔ جو تسلی و راحت اس کے دامن میں پہنچ کے نصیب ہوتی ہے نہ مشتاق اور دل از دست دادہ عاشق کو معشوقۂ دلربا کے گلے لگانے میں حاصل ہو سکتی ہے اور نہ غربت زدہ آوارہ وطنوں کو سواد وطن میں داخل ہو کے، اصل یہ ہے کہ دنیا کی تمام مسرتیں اور خوشیاں صرف دکھانے اور ہوا پرست انسانوں کو دھوکا دینے کے لئے ہیں۔ قرآن پاک کہتا ہے "انّ مع العسر یسرًا" (مصیبت کے ساتھ راحت ہے) لہٰذا جس طرح ہر صدمۂ جانکاہ اور ہر روح فرسا الم سے امیدوں کی خوشیاں وابستہ ہیں۔ اسی طرح ہر مسرت کے نیچے ایک مصیبت چھپی ہوئی ہے اور ہر خوشی کے دامن میں صدمات و آلام ہیں۔ شادی و غم کا یہ لزوم معلوم ہونے کے بعد صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جہاں خوشی کے چہچہے ہوتے ہیں وہیں پرسوز و گداز مرثیے اور جگر خراش نالے بھی ہوں گے۔ چاہے ہمیں سنائی

نہ دیں اور جس جگہ تمہیں بظاہر عیش وعشرت اور شادی وخرمی کے سامان نظر آتے ہوں یقین کر لو کہ ان میں غم والم کے سامان بھی ضرور ملے ہونگے۔ لہٰذا اگر کسی جگہ کو غم والم اور صدموں اور مصیبتوں سے خالی کرنا چاہتے ہو تو پہلے اسے خوشی وعشرت پرستی کے سامانوں سے خالی کرو جبتک یہ تمہارا فضول اور طفلانہ مزاجی کا سامان عیش دور نہ ہوگا اس وقت تک یہ کبھی ممکن نہیں کہ تمہیں دنیاوی افکار و آلام سے نجات ملے۔ یا پریشانیوں اور مصیبتوں کی طرف سے اطمینان نصیب ہو۔ گوشۂ عافیت جو اصلی خوشی اور حقیقی مسرت کا مرکز اور اطمینان و فارغ البالی کا مامن بتایا جاتا ہے محض اس لئے کہ اس میں آزادی اور امن وامان قائم کرنے کے لئے اسی اصول پر عمل کیا گیا ہے کہ فکروں اور ترددوں مصیبتوں اور الموں سے پہلے عیش وعشرت کے سامان دور کئے گئے نہ راحت طلبی ہی باقی رکھی گئی اور نہ عیش پرستی، نہ برسوں کا وہ خیالی نظر فریب باغ رہا جو روز ایک نئی آرزو دل میں پیدا کرتا تھا۔ اور نہ تمناؤں کا عالیشان عشرت کدہ جو سستی اور کاہلی میں روز افزوں اضافہ کرتا تھا۔

ہمارے دوستوں نے اکثر سنا ہوگا کہ جو لطف سادگی میں ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں مگر اس کی فلاسفی شاید بہت کم کسی کے خیال میں

گذری ہو گی ۔ اصلی سبب یہ ہے کہ سادگی میں عمدہ اور دلچسپ نقش و نگار یا تکلف کے سامان دلفریبی نہیں ہوتے اور انہیں کے ساتھ سادگی کا صفحہ ان ضرورت سے زیادہ پر تکلف گل بوٹوں سے بھی خالی ہوتا ہے جو قدرتی خوبیوں کو بھدا اور بے مزہ بنا دیتے ہیں۔ لہذا سچ یہ ہے کہ سادگی میں قریب قریب وہی شان پائی جاتی ہے جو ہمارے گوشۂ عافیت میں ہے اور یہی سبب اس کے زیادہ دلفریب و دلکش ہونے کا ہے ۔

مگر افسوس دنیا میں سب چیزیں مل سکتی ہیں اور نہیں مل سکتا تو وہ گوشۂ عافیت جس میں دو گھڑی بیٹھ کے ہم پریشان و مضطرب دل کو رنج و راحت اور شادی و غم ہر قسم کے افکار سے پاک و صاف کر لیا کریں ۔ دنیا افکار و تردداتہی کا نام ہے خوشی اور الم اس عالم مادی کی فطرت میں داخل ہے لہذا ہمیں امید نہیں کہ وہ مختصر اور محدود جگہ جسے ہم گوشۂ عافیت کہتے ہیں اور جسے جنت ارضی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اس فانی زندگی میں کبھی نصیب ہو۔ جس طرح ایک کیمیاگر ساری زندگی سونا بنانے کی ہوس میں صرف کر دیتا ہے اور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اسی طرح یہ بھی غیر ممکن ہے کہ کبھی کسی کو اصلی گوشۂ عافیت اور حقیقی کنج عزلت کا پتہ لگ جائے ۔

بس اصلی گوشہ عافیت قبر ہے اور فقط یہی ایک ایسا مامن نظر آتا ہے جس میں پہنچ کے ان دنیاوی افکار و آلام سے نجات پانے اور بے غمی و اطمینان کی زندگی حاصل کرنے کی امید کی جا سکے۔ اور ہزارہا تجربوں اور بار بار ٹھوکریں کھانے کے بعد ہم صرف اسی قدر معلوم کر سکے ہیں کہ جسے ہم گوشۂ عافیت کہتے ہیں وہ حقیقت میں کنج عدم ہے یا آغوش لحد ہے۔ جہاں اگر دنیاوی فکروں اور پچھتاوؤں کو ساتھ نہ لے گئے تو واقعی بڑے مزے کی نیند آئے گی۔

(۞)

ادبیات اردو اور تنقید نگاری

اگر اردو زبان کی موجودہ بساط پر نظر ڈالی جائے تو ہماری نگاہیں جس قسم کی اشیاء سے بہت زیادہ دوچار ہونگی وہ شعر وسخن کے لاتعداد کارنامے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری کسی قوم وزبان کو زندہ اور شگفتہ رکھنے کا نہایت طاقتور ذریعہ ہے لیکن افسوس ہے اس امر کا کہ ہماری شاعری میں بجائے زندگی اور شگفتگی بخشنے والے عنصر کے پژمردہ اور پست بنا دینے والے اسباب کثرت سے پائے جاتے ہیں اگر اس حقیقت کے ارتقائی مدارج پر روشنی ڈالی جائے تو منجملہ اور وجوہ کے ایک بڑا سبب یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہماری زبان میں "فن نقد شعر" کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

ادبیات اردو میں سے اگر شاعری کے جزو کو علیحدہ کر دیا جائے تو وہ بالکل کم مایہ زبان رہ جاتی ہے یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس وقت تک اردو نثر میں بعض نہایت قابل قدر کارنامے

پیش کئے گئے ہیں جو اپنے موضوع اور اسالیب کی اہمیت اور سنجیدگی کے لحاظ سے ضرور مایۂ ناز ہیں لیکن اس کی تعداد اسقدر کم ہے کہ ان کے ذریعہ سے وہ زبردست تشنگی دور نہیں ہوسکتی جو کسی جدید زبان کو فطرتاً حاصل ہوتی ہے۔ شکر ہے کہ اس مبارک زمانہ میں اردو ترقی کے ایسے مدارج طے کررہی ہے، جو مستقبل قریب میں اس کو معراج کمال تک پہنچادینے کے ذمہ وار بنتے نظر آتے ہیں اور وہ وقت طوفانی رفتار کے ساتھ آرہا ہے جبکہ سلسبیل علوم وفنون اور سرچشمۂ تہذیب وتربیت جامعہ عثمانیہ کی آبیاریوں اور اس کے مؤسس اعلیٰ آقائے ولی نعمت سلطان العلوم مدظلہ العالی کی مسیحائیوں کے باعث اردو زبان دنیا کی زندہ اور شگفتہ زبانوں کے ہمدوش ہوجائے گی۔

ان خوش آئند امور کے باعث جہاں ہم معلوم کرتے ہیں کہ متفرق علوم وفنون کی کتابیں لکھنے کی کوششیں کی جارہی ہیں یہ دیکھ کر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ اعلیٰ تنقیدی ادب کی طرف بہت کم انشاء پرداز توجہ کررہے ہیں اور اس کے اسباب غالباً یہی ہیں کہ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تنقیدی کارنامے ادبی دنیا میں دوسرے درجہ پر رکھے جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ فی الحال اردو زبان کو تنقیدی

ادب کی ضرورت نہیں ہے اگر اوّل الذکر کو تھوڑی دیر کے لئے مان
بھی لیا جائے تو اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت
اردو کو اعلیٰ سے اعلیٰ تنقیدوں کی شدت کے ساتھ ضرورت ہے اردو
کے کئی انشاء پرداز اور کارنامے ایسے ہیں جن کی کافی طور پر قدر نہیں
کی گئی۔ اردو دانوں میں علم و ادب کا وسیع مذاق نہ ہونے کے باعث
ان کو مجبوراً "نقش و نگار طاق نسیاں" بننا پڑا ہے۔

جب تک ہمارے دلوں پر اپنے قدیم انشاء پردازوں کی صحیح عظمت
کے نقوش تاثر ثبت نہ ہو جائیں گے۔ اور جب تک ہمارے دماغ اپنی
زبان کے موجودہ شہ کاروں کی مخفی خوبیوں کو جلوہ گر کرنے میں کامیاب
نہ ہولیں گے اس وقت تک ہم میں اعلیٰ ادبی ذوق نہیں پیدا ہوگا۔ اور
اس وقت تک نہ ہماری قوم میں بہتر سے بہتر فن کار پیدا ہو سکتے ہیں۔
اور نہ ہماری زبان میں مہتم بالشان کارناموں کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔
اگر ہم اپنی زبان کو دنیا کی تہذیب و ترقی یافتہ زبانوں کی فہرست میں
شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہماری خواہش ہے کہ اپنے ادب کو کچھ ہی
عرصہ کے بعد انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادبیات کے پہلو بہ پہلو
دیکھیں اگر ہم اپنے ملک و قوم میں شکسپیر اور بیکن، گوئٹے اور کانٹ، روسو
اور اناطول فرانس، ٹالسٹائی اور ڈاسٹوسکی دیکھنا چاہتے ہیں اور اگر

اپنے اس دعوے کو کامیاب بنانے کے متمنی ہیں کہ یہ اردو زبان اور صرف اردو زبان ہی ہے جو نہایت سہولت کے ساتھ تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے تو ہمیں چاہیئے کہ بہت جلد تنقید کے صحیح اصول اور اس کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی طرف متوجہ ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ میں ہماری زبان کے چند خاص خاص انشا پرداز بعض تنقیدی کارناموں کا مستقل اضافہ کر رہے ہیں لیکن ان کی معدودے چند تنقیدی مثالوں کے علاوہ جب ہم عام اردو ادب پر تنقیدی عنصر کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں قطعی طور پر نا امید ہونا پڑتا ہے اور اس بارے میں سب سے زیادہ مایوس کن حالت ہماری زبان کے رسالوں کی ہے حالانکہ رسالہ ہی ہمیشہ کسی زبان کے تنقیدی ادب کے ارتقا کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

آج کل اردو زبان میں کثرت کے ساتھ رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ اور باوجود اس کے ان میں صرف دو تین ہی ایسے ہیں جو نہایت سنجیدہ اور اعلیٰ پایہ کے کہلائے جا سکتے ہوں خاص کر وہ نت نئے رسائل جو آئے دن جاری ہوتے جا رہے ہیں بہت کم کسی ایسے عنصر کا اضافہ کر رہے ہیں جو اردو زبان کا جزو لاینفک بن سکتا ہے یا کم سے کم عرصہ تک باقی رہ سکتا ہے ان مؤخر الذکر حشرات الارض کا تو ذکر ہی کیا

ہے۔ ہماری زبان کے وہ چند رسالے جو بلند پایہ سمجھے جاتے ہیں اور جن کے مضامین مستقل حیثیت رکھنے کے علاوہ ایک حد تک پائدار بھی ہوتے ہیں اور جن کے مدیر ایسی ہستیاں ہیں جنہیں مغربی ادبیات سے بھی واقفیت ہے اور جو غالباً یہ سمجھتی ہیں کہ تنقید نگاری بھی کسی زبان و ادب کی زندگی اور ترقی کا کس قدر زبردست ذریعہ ہے افسوس کہ تنقید و تبصرہ کے عنوان کے تحت بہت کم اعلیٰ مذاقی اور بلند پایگی کا ثبوت دیتے ہیں۔

ان رسالوں میں حسب ذیل تین قسم کی تنقیدیں شائع ہوا کرتی ہیں :-

(۱) پہلی قسم کی تنقیدیں جو عام طور پر تمام اردو رسالوں میں نظر سے گزرتی رہیں اردو زبان کے لئے باعث ننگ و عار ہیں۔ اور سخت افسوس ہوتا ہے جب اس امر کا خیال گزرتا ہے کہ اردو زبان میں اب تک تنقید کے عنوان سے جس قدر لکھا گیا ہے اس کا اکثر حصہ اسی قسم کی لغو باتوں پر مشتمل ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو :-

.. .. یہ کتاب ایک نہایت دلچسپ اور مفید ناول ہے جس کا مصنّف .. .. صاحب ہیں۔ کتاب کی خوبی کے لئے فاضل مصنّف کا نام ضامن ہے لکھائی چھپائی نہایت عمدہ، جس کے لحاظ

سے قیمت بہت کم ہے۔ مصنّف ایک نئے تعلیم یافتہ یا ... ...
ہونہار نوجوان معلوم ہوتے ہیں امید ہے کہ قدردانان و شائقین اردو
اس کی قدر کریں گے۔

تعجّب ہے کہ اس قسم کی لغو باتیں تنقید کے عنوان سے کیوں لکھی
جاتی ہیں اور اگر اس کو کسی کتاب کا اشتہار یا رسالہ کی طرف سے کتاب
کی رسید کہا جائے تو بالکل مناسب ہے اس قسم کی لغویتوں سے
مصنّفوں کو (سوائے کتاب کے ایک اشتہار کے) کسی قسم کے فائدہ
یا عام اردو والوں کے مذاق کی کسی طرح کی اصلاح کے بجائے نہ
صرف پڑھنے والے کا وقت خراب ہوتا ہے بلکہ اردو ادب کی حیثیت
مجموعی کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

(۲) دوسری قسم کی تنقید پہلی سے زیادہ مضرت بخش اور شرمناک
ہیں۔ ان میں بجائے تصنیف پر تنقید کرنے کے محض مصنّف کی ذات
کی طرف توجہ مبذول کی جاتی ہے اگر کسی مدیر رسالہ کو کسی مصنّف
کے ساتھ کسی خاص وجہ سے بغض ہوتا ہے تو وہ کتاب کے پردہ
میں مصنّف پر برس پڑتا ہے اور جس طرح بن پڑے اپنے دل کی بھڑاس
نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس کے برخلاف اس کو مصنّف سے
کسی قسم کی ہمدردی ہو تو پھر کیا کہئے مدیر صاحب مرزا رجب علی بیگ

مسرور بن جاتے ہیں اور مصنف کی خاطر تصنیف کی مدحت طرازی میں نہایت مقفیٰ اور مسجع نثری قصیدے پڑھنے شروع کر دیتے ہیں۔
کیا اس قسم کی تنقیدوں سے ہماری زبان کے وہ ذمہ دار ادیب جنہیں کسی رسالہ کے مدیر ہونے کے علاوہ حامی زبان اردو ہونے کا دعویٰ ہوتا ہے۔ اردو زبان کی کوئی سچی خدمت انجام دے رہے ہیں؟

(۳) اردو رسائل کی تیسری قسم کی تنقیدیں اگرچہ کسی ہمدرد اردو کی اشک شوئی کے لئے کافی نہیں۔ لیکن وہ اس قدر بلند پایہ نہیں ہوتیں اور اس محنت اور گہرے مطالعہ کے بعد نہیں لکھی جاتیں جو کسی ترقی یافتہ زبان کے ایک رسالہ کی تنقیدوں کے لئے ضروری ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ کم از کم ایسی ہی تنقیدیں اردو کے تمام یا اکثر ادبی و علمی رسائل میں شائع ہوا کریں۔

اگر ہماری زبان کے رسالوں کے مدیر اپنے اپنے رسالوں کی ترقی اور زندگی چاہتے ہیں اگر انہیں اس بات کی خواہش ہے کہ ان کے رسالوں کے بعض عنصر دنیائے ادب میں پائدار اور دوامی اثر چھوڑ جائیں اور اگر انہیں ادب اردو کی پر خلوص خدمت کرنے کا دعویٰ ہے تو انہیں چاہیئے کہ اپنے ہر رسالہ کا ایک ثلث حصہ اعلیٰ پایہ کی

تنقیدوں کے لئے وقف کر دیں اور نہ صرف خود کو بلکہ خاص خاص قلمی معاونین کو تنقید نگاری کی طرف متوجہ کر کے ان کی بہتر سے بہتر تنقیدیں شائع کریں اور یہ تنقیدیں نہ صرف جدید مصنفین اور مصنّفات پر مشتمل ہوں بلکہ اکثر متقدمین اردو کے ادبی کارناموں پر بھی حاوی ہوں۔ کیونکہ اردو کے بعض قدیم ترین مصنفین ایسے بھی ہیں جو اپنے کارناموں کے ساتھ خود بھی دنیائے علم سے آہستہ آہستہ مفقود ہوتے جا رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ کہیں بعض بہترین خدایان سخن ان کے کارناموں کی کماحقہٗ بزرگداشت نہ ہونے باعث ہماری نظروں سے ایک عرصہ کے لئے اوجھل نہ ہو جائیں۔

دوسرا اہم امر جس کی طرف فی الحال اردو رسائل کے مدیروں اور نقّادوں کو توجہ کرنی چاہیئے۔ تعمیری تنقید نگاری ہے کیونکہ اس زمانہ میں اردو کی کتابوں پر تخریبی تنقیدیں لکھنا مضر اور سخت مضر ہے۔ تعمیری تنقید میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ کہ مصنّف اور عوام دونوں کے احساسات کو کسی طرح کا صدمہ نہ پہنچنا چاہیئے اگر مصنّف نے کوئی غلطی کی ہو تو اس کا ازالہ اپنی تنقید میں اس طرح کیا جائے کہ نہ مصنّف کو برا معلوم ہو اور نہ عوام اس سے بدظن ہونے پائیں۔ اور اس کی وجہ سے ان کے دلوں سے اس کے

کارنامے کی وقعت گھٹ جائے۔ کیا ہماری زبان کے رسالوں کی تنقیدوں میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے؟

افسوس ہے کہ ہمارے بعض ثقہ اور سمجھ دار تنقید نگار کسی مصنّف کی غلطیوں گن گن کر پیش کرنا اور ان پر زور دینا اپنے تنقیدی عمل کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں:۔

برین عقل و دانش بباید گریست

تخریبی تنقیدیں یوں بھی دنیائے ادب میں مذموم قرار دیجاتی ہیں اور اگر کسی ترقی یافتہ اور کثیر التعداد مصنّفین اور مصنّفات رکھنے اور پیدا کرتے رہنے والی زبان میں تخریبی تنقیدیں لکھی جائیں تو کوئی مضرت رساں حرکت نہ ہوگی لیکن اگر اردو جیسی جدید زبان میں، جس میں ضرورت ہے اس امر کی کہ ہر قسم کی کتابیں اور مضامین کثرت سے لکھے جائیں اور ہر موضوع پر متعدد انشا پرداز قلم اٹھائیں مصنّفوں اور مضمون نگاروں کی غلطیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالی اور اچھال اچھال کر دکھائی جائیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ اردو کے خزانہ میں کس طرح نادر اور بیش بہا اشیا کا اضافہ ہو سکتا ہے؟ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس طریقۂ عمل سے نئے نئے مضمون نگاروں اور مصنّفوں کے دل کھٹے ہو جائیں اور اردو ادب ان شاہکاروں سے ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے محروم ہو جائے جو ممکن تھا اور بعید ممکن تھا کہ انہی نورسوں میں سے کسی کے خلاق دماغ کی پیداوار ہونے والے تھے۔

کیا اس طریقۂ عمل سے اردو زبان کے نقاد اپنی زبان کی صحیح طور پر خدمت کر سکتے ہیں اور کیا تخریبی پہلو اختیار کرنے سے ہمارے رسالہ کے مدیر اپنے علم و ادب کا خود اپنے ہاتھ سے خون نہیں کر رہے ہیں؟ کیا تنقید بغیر کسی مصنف کے ذاتی احساسات کو ٹھیس لگانے والے اسباب پیدا کئے نہیں کی جا سکتی؟ کیا مصنف کی غلطیاں اور اس کے کارنامے کی خامیاں بغیر یہ بتائے درست نہیں ہو سکتیں کہ مصنف یا مؤلف نے حسب ذیل غلطیاں کی ہیں، اور کتاب میں فلاں فلاں خامیاں رہ گئی ہیں؟ معلوم نہیں کہ تنقید کرتے وقت ہماری زبان کے اکثر ذمہ دار قلم کیوں بے لگام ہو جاتے ہیں اور کس لئے اردو زبان کی خیر خواہی اور ادب کی خدمت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں؟

یہ ممکن ہے کہ کسی مصنف یا مضمون نگار نے علمی و ادبی لحاظ سے الفاظ و محاورات کے استعمال یا کسی امر کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں ایک بڑی غلطی کی ہو۔ یا اخلاقی پہلو کے لحاظ سے کسی اور کی تحریر کو کسی نہ کسی طرح اپنے نام سے شائع کرنے کا جرم

گیا ہو۔ لیکن کیا ان دونوں کی پاداش میں اس کو سزائے موت بھگتنی پڑے گی؟ کیا کسی کو سختی اور اس سختی کے ساتھ اس کے جرم سے تنبہ کرنا کہ اس کے بعد سے وہ دنیائے ادب میں منہ نہ دکھا سکے۔ سزائے موت سے کچھ کم ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ اردو رسائل میں نہ صرف تعمیری بلکہ تخلیقی تنقیدیں شائع ہونی چاہئیں۔ کیونکہ فی الحال اردو کو انہی کی سخت ضرورت ہے۔ تخلیقی تنقیدیں بہ نسبت تعمیری کے بہت زیادہ وسیع اور بلند پایہ ہوتی ہیں۔ اس قدر بلند پایہ کہ انہیں بعض اوقات اول درجہ کے ادب میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

اس قسم کی تنقیدوں میں خود نقاد ایک زبردست تخلیق کرتا ہے۔ مثلاً شعر العجم، یادگار غالب یا ناٹک ساگر پر اگر کوئی شخص اس شرح و بسط کے ساتھ تنقید کرے کہ اس کی اعلیٰ بحثیں اور مفید استدلال خود شعر العجم، یادگار غالب یا ناٹک ساگر سے حجم اور نوعیت دونوں لحاظ سے بڑھ جائے تو وہ تنقید تخلیقی ہوگی۔ اور اس کو ادب میں وہی رتبہ حاصل ہوگا جو شعر العجم، یادگار غالب یا ناٹک ساگر کو حاصل ہے۔ انگریزی زبان کے اکثر تنقید نگاروں اور خصوصاً لارڈ میکالے اور میتھو آرنلڈ کی تنقیدیں بہترین ادبی

ادبی کارنامے قرار دی جا سکتی ہیں ان کی وجہ یہی ہے کہ وہاں جو تنقید کی جاتی ہے وہ اس پایہ کی ہوتی ہے کہ خود تصنیف سے زیادہ بلند مرتبہ حاصل کر لیتی ہے اردو میں اس قسم کی تنقیدوں کا بالکل فقدان ہے۔ ضرورت ہے کہ بعض پر خلوص ادیب ان کی طرف متوجّہ ہوں۔ کیونکہ بغیر ان کے نہ اردو زبان اور ادب میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ اردو دانوں کے ذخیرۂ معلومات میں کوئی وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔

علامہ راشد الخیری کی ناول نگاری

یوں تو اردو زبان میں کافی تعداد ایسے ناول نگاروں کی موجود ہے جنہوں نے ناول نگاری میں کمال حاصل کر لیا ہے. مگر ان کے تمام صرف مردوں ہی تک محدود ہیں ایسے ناول جو صنف نازک سے متعلق ہوں معدودے چند ہی ہیں قدیم افسانوں اور ناولوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کے علمبرداروں نے ابتدا ہی سے عورت کو اس قابل نہ سمجھا کہ اس کی زندگی کو منصۂ شہود پر لایا جائے اور اس کے عیوب کی اصلاح کی جائے بعض اصحاب کو شاید میرے ان چند جملوں سے یہ خیال پیدا ہو جائے کہ میں قدیم و جدید اہل قلم حضرات پر اعتراض کر رہا ہوں ان کے اطمینان کے لئے میں صرف اتنا لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا کرنے سے مجبور تھے کیونکہ ان کا ماحول ان کی سوسائٹی اور وقت اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ عورت کی زندگی کے اس پہلو کی طرف متوجہ ہوں، جو ان کی نظر میں ایک سفید کاغذ کی طرح صاف ہے اور اس پر سیاہی کا

کہیں بھی بدنما داغ نہیں ہے۔ شاید اس پر میرے کچھ احباب یہ کہہ اٹھیں کہ قدیم افسانوں اور ناولوں میں عورت کا ذکر کافی طور پر موجود ہے۔ پھر عورت کا قدیم افسانوں اور ناولوں سے مفقود ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ ضمناً عورت کو قدیم افسانوں اور ناولوں میں جگہ دی گئی ہے مگر میرا مطلب یہ ہے۔ کہ قدیم افسانوں کی عورت، مردوں کے عشق کا کھلونا ہے "عورت ذات" پر انہوں نے کوئی کوئی توجہ نہیں کی۔ جہاں کہیں بھی وہ نظر آتی ہے وہ مرد کے واسطے اور صرف مرد کے واسطے ہوتی ہے۔ عورت کی انفرادی زندگی کو کہیں بھی پیش نہیں کیا گیا۔ اس کی خصوصیات کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا اور صرف وہی باتیں ظاہر کی گئیں جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ مرد کی ذات سے ہے عورت کا مقصد حیات، عورت کے فرائض عورت کی زندگی کے منازل انہوں نے بالکل نظر انداز کر دیئے، ان کے یہاں عورت ایک "معشوق" ہے اور مرد ایک عاشق۔ ذرا سوچیئے! یہ معشوق کیا ہے؟ عورت عشق کے سوا اور کچھ جانتی ہی نہیں۔ اس کا حسن یا اس کی ذات فرہاد کو دیوانہ بنا سکتی ہے اس کا ایک لفظ مجنوں کو رقص پر مجبور کر سکتا ہے۔ اور اس کی جدائی قیس کو وارفتہ بنا سکتی ہے۔

قدیم افسانوں اور ناولوں میں عورت 'مثالی' ضرور پیش کی گئی ہے مگر اس کی زندگی کا صرف ایک پہلو نمایاں کیا گیا ہے۔ جو حسن و عشق سے متعلق ہے جس کی زندہ مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ درحقیقت انہوں نے اس پہلو کو چھوڑ دیا ہے جو گھریلو زندگی سے متعلق تھا ہمارے ناولوں میں عورت کی زندگی کے اس پہلو کا فقدان تھا۔ غدر کے بعد سے عورت کی زندگی کے اس پہلو پر بھی توجہ صرف کی گئی۔ ممکن تھا کہ ابھی نصف صدی تک یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک اس طرف توجہ نہ دیجاتی مگر انگریزی ناولوں کے جو ترجمے پیش کئے گئے[۱] تو ان میں ہمارے اہل قلم کو عورت کی زندگی کے وہ واقعات بھی ملے جن کو وہ بیکار سمجھتے تھے۔

غدر کے بعد ہی ہمکو قدیم و جدید تہذیب کی حامل ایک ایسی ہستی نظر آتی ہے جو اپنی لڑکیوں کو تعلیم دینے کی غرض سے ایسی کتابوں کو تلاش کرتی ہے جو ان کو صحیح معنوں میں ایک ہندوستانی خاتون بنا دیں اس کے علاوہ ان میں جاذبیت اور دلچسپی کا عنصر کافی ہو۔ تاکہ ان کو پڑھتے وقت گھبراہٹ نہ ہو مگر اس کو ناکامیابی ہوتی ہے، یہ ناکامیابی اس سے چند ایسی کتابیں لکھواتی ہے جس سے اس کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہو جاتی ہے۔ نہ صرف عوام نے،

بلکہ حکومت وقت تک نے ان کتابوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا
ان پر انعامات دیئے ان کو محکمۂ تعلیم کی طرف سے شایع کیا، یہ
ہستی شمس العلما، مولوی نذیر احمد دہلوی کی ہے اگر خواتین کے
سامنے مولانا نذیر احمد کا نام لیا جائے تو وہ ان کو پہچان بھی نہ
سکیں گی۔ مگر جہاں "اکبری اور اصغری والے" کہا جاتا ہے تو وہ
فوراً ان کی تعریف کرنے لگیں گی۔ مولانا نذیر احمد نے اپنی تصانیف
سے اردو زبان میں ایک جدید چیز کا اضافہ کیا ان کے ناول مراۃ
العروس، بنات النعش اور ایامیٰ عورت کی گھریلو زندگی سے متعلق ہیں
ان میں انہوں نے بچپن سے بڑھاپے تک دو متضاد کردار لے کر
عورت کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا نذیر احمد نے
عورت کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کے مشاغل
نے ان کو اتنی اجازت نہ دی کہ وہ عورت کی زندگی کے ایک ایک پہلو
کو لے کر اس پر اپنا زور قلم صرف کرتے، سیکڑوں باتیں ایسی تھیں
جن کو مولانا ضبط تحریر میں نہ لا سکے۔

علامہ راشد الخیری کی ادبی زندگی کے آغاز کے لئے کوئی خاص
وقت معین نہیں کیا سکتا۔ جب وہ اپنے چچا ڈپٹی عبدالحامد کے
ساتھ ضلع اناؤ میں تھے اسی وقت سے مضامین وغیرہ لکھا کرتے تھے

چنانچہ مولانا کی سب سے پہلی تصنیف "حیات صالحہ" وہیں لکھی گئی
بعض اصحاب اس کتاب کو ناول نہیں کہتے بلکہ "حیات" کہتے ہیں۔
دراصل یہ کتاب حیات کے طرز پر لکھی گئی ہے مگر اس میں ناول کے
عناصر اور منازل وغیرہ بالترتیب موجود ہیں۔ ہر شخص کی زندگی کا
کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے، مولانا کے پیش نظر بھی ایک مقصد
تھا وہ مسلمانوں کی حالت درست کرنا چاہتے تھے مگر انہوں نے اس
اصلاح کا ایک اور ذریعہ نکالا اور وہ یہ تھا۔ "سب سے پہلے مسلمانوں
کے گھروں کی اصلاح کی جائے"۔ چنانچہ انہوں نے ان خرابیوں کو
سب سے پہلے لیا جو مسلمانوں کے گھروں میں رائج تھیں اور جن کی
بدولت مسلمان قوم کے ہونہار بچے تباہ و برباد ہو رہے تھے حیات
صالحہ میں انہوں نے صالحہ اور آمنہ کے کردار پیش کر کے یہ بتادیا
کہ مسلمان عورتوں کو کس طرح اپنی زندگی گذارنا چاہیئے۔ عزت و
عصمت کو کس طرح عزیز رکھنا چاہیئے۔ اس کتاب کا دوسرا رخ
ایک "بدکردار" عورت تمیزاً کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ اس
کردار کے ذریعہ انہوں نے یہ دکھلایا ہے کہ ایک سوتیلی ماں کس طرح
اپنے سوتیلے بچوں کو تباہ و برباد کرتی ہے، صالحہ جیسی فرشتہ سیرت
لڑکی کے خلاف خاوند سے انہونی باتوں کے متعلق کس طرح سو

سو لگاتی ہے کبھی اس پر چوری کا الزام لگاتی ہے کبھی خود بچوں کو مار مار آدھ مرا کر رہی ہے، بچوں سے وہ محنت اور کام لینا کہ بدن جواب دیجائے، اندر ہی اندر وہ جتن کرنا کہ شیطان بھی پناہ مانگے غرض وہ اس طرح سے آمنہ کے خون جگر سے پالے ہوئے بچوں کی زندگی تنگ و تاریک بناتی ہے اس پر بھی تمیز آ کی سیری نہیں ہوتی تو صالحہ کا نکاح "زبردست" سے کر دیتی ہے جو جواری، شرابی اور بدمعاش سب ہی کچھ تھا۔ صالحہ کو کھانے تک کو بھی نہیں ملتا تھا، اس نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ زبردست کو صالحہ کی طرف سے بھرتی رہتی اور وہ اس غریب اور نیک صالحہ کو زدوکوب کرتا رہتا، وہ غریب اس طرح مظالم سہتے سہتے راہی ملک بقا ہوتی ہے وہ اپنے بھائی کے ہاتھ باپ کو بلواتی ہے تاکہ مرتے وقت اس کی صورت دیکھ لے مگر وہ بدذات ناگن اس کی بھی اجازت نہیں دیتی صالحہ تڑپ تڑپ کر جان دیتی ہے۔

یہ ان باتوں کے متعلق تھا جن کو مولانا نے بہت زیادہ اہمیت دی اسی کتاب میں چند اور ان فضول اور بیکار رسموں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو کہ مسلمانوں کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہیں مثلاً غسل صحت پر سارے گاؤں اور شادی کی دعوت، مرے ہوئے

آدمیوں کو بھوت پلید اور چڑیل وغیرہ سمجھنا، ان کے علاوہ عورتوں کی بہت سی بیچ کی باتیں بھی بیان کی ہیں، نند بھاوجوں کی لڑائی ایک لڑکی کے رشتے کے متعلق آپس میں کشمکش پیدا کرنا وغیرہ۔ یہ علامہ راشد الخیری مرحوم کا پہلا ناول تھا ان کے اس ناول کا موضوع وہی "عورت" ہے جو ہماری روزانہ زندگی میں برابر کی شریک ہے اور ہماری زندگی کو تلخ و گلزار بناتی ہے۔

مولانا نے صرف انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہندوستانی عورت اور خاص طور پر ہر مسلم عورت کی خامیوں کو منصۂ شہود پر لانے کی کوششیں کی ہیں۔ ان کے عیوب بتلائے ہیں۔ مولانا نذیر احمد کی طرح دوسرے نیک کردار جو کہ اس کے اصلی کردار کے ضد ہوتے ہیں پیش کر کے ان کو دور کرنے کی کوششیں بھی کی ہیں۔ عیوب کے برے نتائج بھی قصہ کے ساتھ ساتھ بیان کر دیئے ہیں یہی ان کے سماجی ناولوں کے موضوع ہیں اگر آپ کو مولانا کی وسیع النظری دیکھنا ہے تو ان کے سماجی ناولوں کو پڑھئے اور دیکھئے کہ نہ صرف مسلمانوں کے گھروں کا انہوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہے بلکہ ہر ہندوستانی گھر میں یہ باتیں موجود ہیں۔ حیات صالحہ کو بعض اصحاب یہ کہہ دینگے کہ اس میں ہمارے زمانے کے واقعات کو پیش نہیں کیا گیا مگر وہ اس سے انکار

نہیں کر سکتے کہ اس میں اب سے چالیس برس قبل کے گھروں کی حالت پیش کی گئی ہے۔

اگر آپ کو اپنے زمانے اور وقت کی باتیں تلاش کرنی ہوں، تو 'بنت الوقت' دیکھیے۔ جس میں ہماری سوسائٹی کا صحیح نقشہ پیش کیا گیا ہے قدیم اور جدید تہذیب کا قدم قدم پر تصادم ہے۔ ایک ہندوستانی لڑکی جس نے ہندوستان میں پرورش پائی تہذیب مغربی کی حامل نظر آتی ہے، دن دہاڑے جلسوں میں گاتی ہے، کھلے خزانے گاڑیوں میں پھرتی ہے، خلق خدا کی خدمت کا سودا اس کے سر میں بھرا ہوا ہے، نام و نمود کی ہوس دل میں گھر کئے ہوئے ہے، کنواری لڑکی تن تنہا ہر گھر میں آتی جاتی ہے شادی ہونے پر فرخندہ فرخندہ نہیں رہتی بلکہ مسز نصیر ہو جاتی ہے مگر وہ ایک ہندوستانی بیوی نظر نہیں آتی، وہی آزادی اور وہی سودا اس کی رگ رگ میں بھرا ہوا ہے، شوہر کی خدمت، اطاعت اور دلجوئی کی اسے فرصت نہیں ہوتی، شوہر بیمار پڑا ہے مگر جلسے کی شرکت ملتوی نہیں کر سکتی کسی انسان کو انسان نہیں سمجھتی خواہ وہ کوئی نوکر ہو یا محلے والا،

درحقیقت یہ تمام باتیں تہذیب زدہ لڑکیوں میں روز بروز ترقی پا رہی ہیں مولانا نے مسز نصیر کا برا انجام دکھا کر اس بات کی پیش بندی

کردی ہے کہ ایک دن وہ آئے گا - کہ جب ہندوستان میں رہ کر تہذیب زدہ لڑکی کو فرخندہ کی حالت سے گذرنا ہوگا - اور خون کے آنسو بہانے ہونگے -

بعض تنگ نظر لوگ کہہ اٹھیں گے کہ مولانا کا یہ خیال صحیح نہ تھا، ہر لڑکی ایسی نہیں ہو سکتی اور نہ ہوتی ہے ان حضرات کے سامنے میں صرف اتنا کہوں گا - کہ وہ ذرا کسی یونیورسٹی اور کالج کی حالت کو ملاحظہ فرماویں جہاں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو مشترکہ تعلیم دی جاتی ہے، مولانا تعلیم کے خلاف ہرگز نہیں ہیں بلکہ وہ قدم قدم پر تعلیم کا سبق دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہماری قوم کی حالت اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہندوستانی خواتین تعلیم حاصل نہیں کریں گی - مگر تعلیم کے معنی بیحیائی اختیار کرنا نہیں بلکہ تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ علم و ہنر کے ساتھ ساتھ آداب مجلس، اخلاق اور اپنے فرائض سے آگاہ ہوں - وہ تہذیب جدید کے خلاف اس وجہ سے ہیں کہ اس کو حاصل کر کے لڑکیاں اور لڑکے ملک اور قوم کو فائدہ نہیں پہنچاتے بلکہ فرعون بے سامان بن کر ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو حیا سوز، مخرب اخلاق اور وحشیوں کی پامال حرکتوں سے بھی زیادہ بدتر ہوتی ہیں اس کی زندہ مثال فرخندہ یا بنت الوقت ہے -

'سراب مغرب' بھی اسی سلسلہ کا ایک اور ناول ہے جو دراصل سیلاب مغرب کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے 'سیلاب مغرب' مولانا کے خیال میں ایک وسیع لفظ تھا اس میں مغربی تہذیب و تمدن کے علاوہ مشرق میں مشنریوں کے کام بھی آجاتے ہیں۔ اس کتاب میں ضمناً "سادن منانے" کی رسم کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے، جگہ جگہ پر مغرب زدہ لڑکیوں اور لڑکوں کی خصوصیات کو قصہ کے پیرائے میں اس انداز سے ظاہر کیا ہے کہ ان کے وہ جملے دل و جگر میں تیر کی طرح لگتے ہیں۔ ایک جگہ خیرات کے متعلق اپنے زنانہ کردار کی زبانی کہلواتے ہیں :-

"غضب خدا کا! فقیر کے دروازے پر آنے کا حکم نہیں۔ ۔۔ ۔۔ ایک وہ تھے کہ اگر بیمار پڑجاتا تو خود جاکر پوچھتے کہ سائیں کل کیوں نہیں آئے، ایک صاحبزادے ہیں کہ غریب نے صدا دی اور انہوں نے جاکر کہہ دیا، خبردار! آئندہ نہ آنا، محنت کرو اور کھاؤ"۔

موجودہ ترقی کے اوپر لکھتے ہیں کہ مغرب زدہ لوگ ترقی کرنے کی آڑ لے کر کس طرح قوم کا روپیہ برباد کر رہے ہیں پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ کن ضروریات پر روپیہ صرف کرنا چاہیئے بڑی بڑی دعوتوں کے کرنے سے قوم کو کیا فائدہ ہوتا ہے سیکڑوں روپیہ ان

دعوتوں پر وہی لوگ صرف کرتے ہیں جو قوم کی مٹی ہوئی حالت کے متعلق شور و غوغا بلند کرتے ہیں، لکھتے ہیں :۔

" دعوت کیا تھی ایک مصیبت تھی بیسیوں قسم کی مٹھائیاں اور سیکڑوں وضع کی ترکاریاں، میں بھی آخر بچہ نہیں ہوں، سو روپے سے کم نہ اٹھے ہونگے اس پر چیخ و پکار یہ کہ قوم مر رہی ہے بیٹا اگر قوم مر رہی ہے تو یہ روپیہ قوم ہی کو دیا ہوتا، یتیم بچے ہیں، رانڈیں بیویاں، اپاہج فقیر ہیں ان کو دیتے تو دین و دنیا دونوں میں اچھے، وہ الٹی اتنا کچھ ڈکار گئیں، حاصل دین نہ حاصل دنیا "۔

غرض یہ تو قوم کے اصلاح کرنے والوں کی حالت ہے ممکن ہے، بعض اصحاب مولانا کے اس نظریہ پر چیں بجبیں ہوں مگر مولانا نے جو کچھ دیکھا وہ لکھا کیا در حقیقت ایسا نہیں ہو رہا ہے ذراسی بات ہوئی، ٹی پارٹی دے بیٹھے۔ بھائی کیا ہو رہا ہے؟ قوم کی اصلاح کے لئے مختلف ذرائع تلاش کئے جا رہے ہیں ان دعوتوں اور جلسوں میں سیکڑوں اور ہزاروں روپے سالانہ خرچ کئے جا رہے ہیں در حقیقت اگر اس روپے کو قوم کی اصلاح میں صرف کیا جائے تو ہماری قوم کی بہت زیادہ اصلاح ہو سکتی ہے دوسرے جتنے اس طرح کی باتیں کرنیوالے ہوتے ہیں وہ خود کو ممتاز بنانا چاہتے ہیں اور در اصل ان کے دلوں میں

قوم کی خدمت کا جذبہ نہیں ہوتا۔ ذاتی اغراض و مقاصد قدم قدم پر ان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

مولانا کے ناولوں کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ان واقعات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جو ہماری سوسائٹی میں آئے دن پیش آتے ہیں کوئی اخبار ایسا نہیں ہوتا جس میں یہ نہ دیا جاتا ہو کہ فلاں شہر میں فلانے رئیس کی نوجوان اور تعلیمیافتہ لڑکی گم ہوگئی ہندوستان کی وہ لڑکیاں جو قدیم معاشرت کی حامل ہیں، اور مغرب زدہ نہیں ان خبروں کو سن کر دانتوں میں انگلیاں دبا لیتی ہیں، انگریزوں کے یہاں کورٹ شپ کوئی عیب نہیں ہے اس کو بھی مولانا نے سراب مغرب میں پیش کیا ہے مگر اس اندھا دھند مغربی نقالی کا انجام کیسا ہوا، بہت ہی دردناک اور عبرت انگیز ہے۔

اس ناول کی ہیروئن کے گم ہوجانے سے گھر بھر پریشان ہوجاتا ہے وہی مس صاحبہ جو ہر وقت اکرم کو اپنے پاس رکھتی تھیں اس کے باپ سے ملاقات کرنے تک کو تیار نہیں ہوتی۔ اگر ان کی جگہ کوئی ہندوستانی ہوتا تو اس وقت دل و جان سے مدد کرنے کو تیار ہو جاتا میں خود مولانا کے اس خیال کا حامی ہوں۔ غیر قوم کے افراد کو ہمارے ساتھ کیا ہمدردی اور دلچسپی ہوگی وہ ہماری مدد اور اصلاح

کیا کرینگے ؟ کیونکہ ان کا وطن، ان کی زبان، ان کی معاشرت، ان کے آداب اوران کے رنگ وروپ سب ہی ہم سے علیحدہ ہیں۔ ان سے اصلاح اور قوم کی ترقی کی امید کرنا ایک زبردست غلطی ہے اور وہ اصلاح کے پردے میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔

خیر چلتے چلتے پتہ چلتا ہے کہ وہ امرتسر گئی ہے وہاں اس پر جو گذری ایک قوال کی زبانی بیان کیا ہے۔

سراب مغرب میں اس کی ہیروئن کا انجام دیکھنے کے بعد اسی تصویر کا دوسرا رخ ایک دوسرے کردار میں ملاحظہ فرمائیے جو بہنوں کی عاشق، بھائیوں کی شیدائی، ماں باپ کی فرمانبردار ہے۔ جو شوہر کی ہر خواہش کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہے۔ جو اس کو ذرا سی تکلیف ہونے پر اپنا آرام اور اپنا چین کھول جاتی ہے جو بوڑھی عورتوں کا سہارا، رانڈوں کی والی اور اپاہجوں کی سچی ہمدرد ہے جو ایک شریف خاتون ہے عصمت وعفت پر دنیا کی ہر شئے قربان کرنے کو تیار رہتی ہے جو ایک صحیح معنوں میں ماں کہلانے کے لائق ہے، جو بیوہ ہونے پر بھی اپنی وضع داری اور خاندانی شرافت کو ترک نہیں کرتی۔ جو دراصل قوم کی خدمت کرتی ہے۔ مصیبت میں اپنا پیٹ بھیک مانگ کر نہیں بھرتی بلکہ زنانہ اسکول کھولتی ہے لڑکیوں کو

پڑھاتی ہے اور اپنا پیٹ بھرتی ہے۔ وہ شریف لڑکی 'رضیہ' ہے۔ جو بھائی کی ایسی حرکتوں کے باوجود کہ اس کا بچہ مرگیا مگر اس نے ایک پیسہ نہ دیا اس کی تمناؤں کو خاک میں ملادیا، مدرسہ کی اینٹ سے اینٹ بجوادی اور اس کا گھر تباہ و برباد کر دیا اف تک نہیں کرتی، بلکہ جب بڑی بہن کہتی ہے کہ خدا اچھن (بھائی) کو اس کا بدلہ دے گا تو اس کا دل بھر آتا ہے اور وہ کہتی ہے :۔

'رضیہ :۔ اے ہے آپا! خدا کے لئے یہ نہ کہو اس نے جو کچھ کیا اچھا کیا مگر خدا اس کو خوش رکھے۔ بیوقوف ہے، بچہ ہے، بات کو نہ سمجھ سکا مگر للہ! میں یہ نہیں چاہتی کہ میرا بھائی کسی تکلیف میں گرفتار ہو'۔

انہوں نے جس قدر بھی جدید باتوں پر قلم اٹھایا ہے اور ان کے کرداروں کے ذریعہ سے پیش کیا ہے اس کے ضد بھی متعدد ایسے کردار پیش کئے ہیں اور ایسی باتیں بیان کی ہیں جو ان برائیوں کو اور زیادہ ذہن نشین کر دیتی ہیں۔ بعض لوگ اس کو مولانا کے ناولوں کی خامی تصور کرتے ہیں حالانکہ ناول نگاری کے لئے یہ بہت ضروری ہے اگر آپ ایک موضوع کے متعلق طولانی مقالات تحریر کردیں تو چند ہی ایسے اصحاب ہونگے جو اپنے دماغ پر زور دینے کے بعد اس مفہوم کو بخوبی سمجھ سکیں گے آپ دن کے متعلق کہے جائیں کہ دھوپ نکلتی ہے۔

روشن ہوتا ہے، سورج چمکتا ہے اور سفید ہی سفید نظر آتی ہے بہت کم اصحاب کے دماغ میں اس کا نقشہ بیٹھے گا۔ جب آپ دن کے ساتھ رات کو بھی پیش کرینگے تو ہر شخص اس کو بخوبی سمجھ جائے گا۔ اس ضرورت کو مدّنظر رکھ مولانا راشد الخیری نے بھی ایسا ہی کیا ہے برائیوں کو ظاہر کرنے اور ان کو دور کرنے کے لئے اچھائیوں اور خوبیوں کو بھی پیش کر دیا۔ یہ خامی نہیں بلکہ خوبی ہے جس سے ان کے ناولوں میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

علاّمہ راشد الخیری نے ہر پہلو سے اور ہر زمانے اور ہر وقت کو مدنظر رکھ کر "عورت" کے فرائض کو پیش کیا ہے ان عورتوں کی حالتوں کو تو آپ بخوبی دیکھ چکے جو گمراہ ہو کر ذلّت و بدنامی کا شکار ہوتی ہیں۔ ان کرداروں میں پوشیدہ طور پر مولانا نے دراصل ہندوستانی لڑکیوں کی تربیت کی خرابی بتلائی ہے اور درپردہ والدین کی لاپروائی اور بے راہ روی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب ہم اس موضوع کو لیتے ہیں کہ ایک نیک، شریف، فرمانبردار، مصلح قوم اور باعزّت و باہنر خاتون ہونے کے لئے کس طرح کی عورت کی ضرورت ہے۔

'صبح زندگی' اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ نسیمہ کی تربیت کس طرح ہوتی ہے۔ نسیمہ کے تربیت کے ڈھنگ دیکھنے سے پہلے یہ

بھی دیکھ لیجئے کہ سنجیدہ کیسی عورت تھی اور نسیمہ جیسی با سلیقہ لڑکی دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے اسے کس طرح کی معلمہ کی ضرورت تھی۔ سنجیدہ کو دیکھئے :۔

"سنجیدہ جیسی عورت، پھوپھی کی پھوپھی، ماں کی ماں، استانی کی استانی، معلمہ کی معلمہ، جس کی رگ رگ میں خدا کی عظمت اور مذہب کی وقعت بھری ہوئی تھی۔ ۔۔ ۔۔ جاڑا، پالا، گرمی، برسات، صبح وشام، دن رات، آندھی جائے مینہ جائے مگر اس کی نماز اور قرآن نہ جائے"

اب سنجیدہ کی زندگی کو بچپن سے بڑھاپے تک ملاحظہ فرمائیے ماں باپ کی عزت وہ کرتی تھی، پھوپھی کے نقش قدم پر چلنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی، بڑوں کے آگے ادب سے بیٹھتی، عزیز واقارب کے علاوہ محلے والوں سے میل جول اور محبت رکھتی تھی، پھوپھی کی لاگ ڈانٹ ہر وقت سر پر رہتی مگر کبھی اس کے ماتھے پر شکن بھی نہ آتی تھی، روزہ کی پابند، باد ہوائی باتوں سے اسے نہ کوئی لگاؤ نہ غرض، کام سے کام، خانہ داری کے ہر کام میں طاق ۔۔ ۔۔ ۔۔ غرض مولانا نے صبح زندگی میں یہ پیش کر دیا کہ ہر ایک لڑکی کی تربیت کس طرح ہونی چاہیئے اور پھر شام زندگی میں یہ بتلا دیا کہ شادی کے بعد زندگی کس

طرح گذارنی چاہیئے۔ لڑکی سسرال جاتی ہے وہاں کی دنیا دوسری، وہاں کے رہنے والے مختلف المزاج، نہ کوئی مونس نہ ہمدرد۔ اسوجہ سے وہاں اسے اپنی زندگی گذارنے میں بڑی ہوشیاری و دانشمندی سے کام لینا چاہیئے۔ نسیمہ کی زندگی کا یہ دوسرا باب ہے۔ سسرال جاکر اپنے سلیقے اور اپنے اخلاق کی بدولت سسرال کے بچے بچے کو اپنا طرفدار بنا لیتی ہے۔ خاوند کی تمامتر خامیوں اور بدعنوانیوں کو اس پہلو سے نظر انداز کرتی ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس ناول میں مولانا نے ایک شریف ہندوستانی بیوی کے کردار نسیمہ کو پیش کر کے دکھلایا ہے ایک ہندوستانی عورت کا خیال ملاحظہ ہو، یہ الفاظ اس وقت کہے گئے ہیں جبکہ نسیمہ اپنے شوہر کی بدعنوانیوں کا شکار ہوتی ہے اور اس کا بچہ باپ کے لئے بلک بلک کر مرتا ہے شوہر کے پاس نسیمہ کی پھوپھی کا خط آتا ہے اس کا خط پڑھ کر وہ اپنی بیوی کے پیروں پر گر کر معافی مانگتا ہے۔ نسیمہ شرمندہ ہو کر کہتی ہے :-

"تم آقا، میں لونڈی، تم حاکم میں محکوم، تم سرتاج میں چیری ہوں۔ تم مالک ہو میں باندی ہوں۔ مجھ کو گنہگار نہ کرو۔ سچ کہتی ہوں میں اب تک پوری طرح نہ سمجھ سکی کہ کیا معاملہ ہے، لیکن تم نے

میرے پاؤں پر سر رکھ کر میری زندگی پر ایک بدنما دھبہ لگا دیا، خدا شاہد ہے میں بیخبر تھی ورنہ میں اس سر پر قربان ہونے والی ہوں خدا اس سر کو ہمیشہ بلند رکھے اس سر سے میری عزت اور اس زندگی سے میری وقعت ہے تمہارے در پر میری پالکی آئی ہے اور کھٹولی جائیگی جیوں تو تمہاری اطاعت میں اور مروں تو تمہاری خدمت میں۔ آرزو ہے کہ تمہارے ساتھ عزت و آبرو سے زندگی بسر ہو اور ارمان ہے کہ تمہارے ہاتھ سے پیوندِ زمین ہوں باپ دادا کا سایہ میرے سر سے اٹھ چکا۔ بھائی کوئی موجود نہیں، سچے وارث اور حقیقی مالک تم ہو۔ زندہ لائے ہو مردہ بھیج دینا۔ میری زندگی کی مراد، میرے دل کا ارمان اگر ہے تو اتنا کہ بڑوں کی لاج اور بڑوں کی آن میں فرق نہ آئے۔ جس ہاتھ سے پکڑا ہے اسی ہاتھ سے سپرد خاک کر دینا'۔

'شب زندگی' میں مولانا نے اس زندگی پر روشنی ڈالی ہے جو مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق دراصل مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے یہی مولانا راشد الخیری کا بھی خیال معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہماری موجودہ زندگی ہماری آئندہ زندگی کا پیش خیمہ ہے ہم جو کچھ یہاں پر کرتے ہیں۔ اس کی جزا و سزا دوسری زندگی میں پاتے ہیں۔

یہاں تک تو میں نے مولانا کے سماجی ناولوں کا ذکر کیا ہے۔ اس

سے یہ نہ سمجھ لیجیئے گا کہ مولانا کے سماجی ناول صرف یہی گنے چنے اور چند ہیں کافی تعداد میں ابھی ایسے ناول باقی ہیں۔ 'نوحۂ زندگی' ان میں سے ایک ہے اس میں حشمت کی داستان غم ہے نکاح ثانی کی ضرورت پر مولانا نے کافی زور صرف کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ تنگ نظر مسلمان کس طرح عورتوں کے نکاح ثانی کو جو کہ دراصل عین اسلام کے مطابق ہے ایک معیوب بات تصوّر کرتے ہیں خود باپ اپنی لڑکی کو محض اس گناہ پر کہ اس نے نکاح ثانی کر لیا عدالت میں گھسیٹ کر جیلخانے پہنچا کر باغ باغ نظر آتا ہے۔ "نسوانی زندگی" بھی اسی سلسلہ کا ایک دوسرا ناول ہے جس میں مولانا نے عورت کو مجموعی طور پر ماں، بیٹی اور بہن کی صورت میں پیش کیا ہے۔ 'مودودہ' کو بھی سماجی ناول اس لئے کہتا ہوں کہ اس میں علاّمہ موصوف نے مسلمانوں کو شرع اسلام کی طرف توجہ دلائی ہے اور احکام اسلام سنائے ہیں جس کے مطابق لڑکیاں کسی طرح بھی زرکہ سے محروم نہیں کی جاسکتیں۔ 'سودائے نقد' میں عورت کی اسلام میں حیثیت، اور جوان بیٹی کی شادی نہ کرنے کے خوفناک نتائج پیش کیے ہیں۔

اردو ناول نگاروں کے تاریخی ناول بھی ملاحظہ فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ اس میدان میں دو ہستیاں زیادہ ممتاز ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر

اور مولانا محمد علی خاں۔ ان میں سے اول الذکر پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اپنے تاریخی ناولوں میں بے ربط اور بھرتی کے واقعات بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور تاریخ کا مطالعہ نظر غائر سے نہیں کرتے بلکہ سطحی معلومات سے ہی سیر ہو جاتے ہیں۔ مولانا محمد علی خاں کو اس طرح مجروح کیا گیا ہے کہ وہ تاریخ کے ہر واقعہ کی چھان بین اور اس کو ہر ممکن صورت سے پیش کرنے میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ ان کا ناول' ناول نہیں رہتا، بلکہ تاریخی واقعات کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہو جاتا ہے اب سمجھ میں نہیں آتا کہ تنقید نگاروں کا دماغ کس بات کو زیادہ پسند کرتا ہے آج میں علامہ راشد الخیری کو ایک تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں واقعات کی صداقت، ان کی جستجو اور انتخاب وغیرہ تو کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ فی الحال ان کے ناول میں تاریخی واقعات کی صداقت کے ساتھ 'عورت' کی تلاش کرتا ہوں۔

علامہ راشد الخیری نے اپنے تاریخی ناولوں میں عورت کو وہی درجہ دیا ہے جو دوسرے ناول نگاروں کے تاریخی ناولوں میں 'مرد' کو دیا گیا ہے۔ 'در شہوار' میں سبطورا یا ملکہ ایک حکمران کی حیثیت سے نظر آتی ہے جو کہ زراعت کی طرف خاص توجہ کرتی ہے ملک کی قحط سالی کو وہ خوشحالی سے تبدیل کر دیتی ہے۔ بوڑھا، بچہ، نوجوان اور جوان، مرد و

عورت اور سب ہی اس کے گن گاتے ہیں اس کے انصاف کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بج رہا ہے۔ مقدمات کے فیصلوں میں وہ انصاف کا اس قدر لحاظ رکھتی ہے کہ دربارِ عام میں ہر فریادی بلا روک ٹوک حاضر ہو سکتا ہے اپنے کان سے شکایت سنتی اور فوراً توجہ کرتی ہے ایمان کی پختہ، ارادوں میں اٹل، غریب کی داد فریاد سننے کو ہر وقت تیار رہتی ہے اسے بڑے بڑے راجاؤں کی مطلق پروا نہیں۔

جنگ کے موقعوں پر خود گھوڑے پر سوار دشمنوں سے لڑتی ہے۔ سب کہتے ہیں کہ صلح کر لیجیے اور فیلوس سے شادی کر کے ایک وسیع سلطنت حاصل کر لیجیے مگر وہ دشمنوں کی پروا نہیں کرتی وہ دشمنوں کی تلواروں کی چمک کو بے حقیقت سمجھتی ہے۔ وطن کی محبت کے سامنے اپنے تن من دھن کی پروا نہیں کرتی۔

ان کا اسی طرز کا ایک اور ناول 'ماہ مجسم' ہے جو میرے نزدیک ان کے تاریخی ناولوں میں کئی وجوہ سے بہت زیادہ بلند مرتبہ ہے اس میں بھی عورت کو وہی مرتبہ دیا ہے جو کہ درشہوار میں۔ ابیلا یعنی اس کی ہیروئن بھی اس دنیا میں اپنے ارادوں میں اٹل ہے۔ تمام تکلیفیں سہیں، عزیزوں کو خون میں تڑپتا ہوا دیکھا۔ خود بھی اندھی ہوئی مگر سوائے مسعود کے زبان پر دوسرا نام نہیں آیا۔ پریشانیاں، تباہ کاریاں اور موت، سب

کچھ برداشت کیں۔ دم توڑا تو اسی کے سامنے جو مسعود کے نام سے پکارا جاتا تھا جو قربان ہونے والی ابیلا سے درمیان میں منحرف ہو گیا تھا۔ مگر ابیلا کے استقلال اور خیالات میں فرق نہ آیا۔ اسی طرح ان کے اور تاریخی ناولوں میں بھی ہم کو عورت کے کردار ملتے ہیں مگر ان سے بھی عورتوں کو ایک سبق ملتا ہے اور جو ہر شخص ان کے ناولوں کو پڑھ کر اخذ کر سکتا ہے۔

علامہ راشد الخیری کا کردار نگاری میں بھی بہت بڑا مرتبہ ہے بعض اصحاب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مولانا کے یہاں کردار نگاری کی کمی ہے یہ اعتراض نہ صرف بالکل غلط ہی ہے بلکہ قطعی بے بنیاد بھی ہے مولانا کے یہاں کردار نگاری کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مولانا کے سماجی اور تاریخی ناولوں کے اشخاص قصہ جب ہمارے روبرو پیش ہوتے ہیں، تو ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے چند تو ایسے ہیں جو کہ خود بخود بولتے ہیں اور ہم کو اپنے حالات بتاتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو ہمارے سامنے آتے تو ہیں مگر خاموشی کے ساتھ۔ تیسرے وہ ہیں جن کا ذکر ہم غائبانہ طور پر سنتے ہیں۔ مگر وہ نہ تو بولتے ہیں اور نہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مولانا کے ناولوں میں کردار بھی ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ غیر ملکی نام ہونے کی وجہ سے ہم کو چار چھ ہی کردار زیادہ معلوم

ہوں، اکثر اصحاب اس بات کے شاکی ہیں کہ اکثر ایسے نام آجاتے ہیں۔ جن سے ان کے کان آشنا نہیں ہوتے ہیں یہ مولانا کی خامی نہیں بلکہ ان حضرات ہی کی کم ہمتی کا ثبوت ہے جو اس بات کی شکایت کرتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ مولانا نے اپنے ناول کے عناصر کے ساتھ ساتھ وقتی اور مستقل کرداروں کا بہت زیادہ لحاظ رکھا ہے ان کے ناولوں میں سیکڑوں کردار آپ کو ایسے ملیں گے جو اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد ناول سے غائب ہو جاتے ہیں وہ اور ناول نگاروں کی طرح ان کو حیات بخشنے اور ناول میں بار بار پیش کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی متعدد مثالیں آپ کو صبح زندگی، شام زندگی اور شب زندگی کے علاوہ حیات صالحہ میں بھی ملیں گی۔ صالحہ کی ماں کی موت اور نسیم کی رحلت وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ مستقل کرداروں میں صالحہ، نسیمہ، سنجیدہ، فرخندہ بانو، درشہوار اور اکرم ہیں جن کے کردار کے متعلق مولانا کے موضوع کے سلسلہ میں بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ ان کرداروں کو آپ مرکزی کردار بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ناولوں کے تمام تر واقعات ان کی حیات سے پیوند ہیں مولانا کی کردار نگاری کے اس پہلو پر شاید کچھ اصحاب اعتراض کریں کہ انہوں نے زنانہ کرداروں کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور مردانہ کرداروں کو پس پشت ڈال دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ناولوں

کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے اور وہ خصوصیت ہے جو ان کو تمام اردو ناول نگاروں میں بہت ممتاز بناتی ہے اس کی اصل وجہ ان کے ناولوں کے مقاصد تھے اور مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ اعتراضات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتے ۔ یہ ضرور ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کو تمامتر ناولوں میں کبھی مساوی اور کبھی کم وزیادہ اہمیت دی گئی ہے مگر یہ کوئی اصول نہیں موجودہ ناولوں کو اگر ملاحظہ فرمائیں تو ان میں سے چند تو ایسے نکلیں گے جن میں ہیروئن موجود ہی نہیں ہے صرف اس کا ذکر کہیں کہیں غائبانہ طور پر ہو جاتا ہے ۔ وہ بھی زیادہ نہیں ۔ دو جملوں میں اس صورت کے علاوہ جدید ناولوں کی ایک صورت اور بھی ہو رہی ہے اور وہ یہ کہ پلاٹ کی ترتیب اور واقعات کے تناسب پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ۔ بلکہ بے ربط واقعات کو یکجا کر کے ناول بنائے جا رہے ہیں مولانا کے یہ ناول تمامتر موجودہ ناول نگاری کے اصول پر پورے اترتے ہیں ۔

علامہ راشد الخیری کی انشا پردازی پر ایک نظر

مولوی عبدالحق صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ علامہ راشد الخیری کی وفات کے ساتھ دلی کی زبان ختم ہو گئی۔ علامہ مغفور ہماری قدیم بادشاہی تہذیب و ثقافت کی آخری یادگار تھے۔ اس دور تفریح میں مشرقی شرافت کی پرانی روایات انہیں کے دم سے زندہ تھیں۔ وہ تہذیب، وہ تمدن، وہ معاشرت اب ایک بھولا بسرا افسانہ بن چکی ہے اور وہ زبان جو اس تہذیب و تمدن نے پیدا کی تھی دستبرد روزگار کی نذر ہو چکی ہے اب اس جگمگاتے ہوئے آسمان کا آخری ستارہ بھی ٹوٹ کر فضائے بسیط میں گم ہو گیا ہے۔

علامہ راشد الخیری کی ادبی زندگی کی ابتدا انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی اوّل اوّل انہوں نے تحریر میں اپنے نامور پھوپھا مولانا نذیر احمد کی پیروی کی۔ لیکن ان کی اپچ اس پابندی کو برداشت نہ کر سکی اور جلد ہی انہوں نے ایک الگ اسلوب بیان پیدا کر لیا۔ جو اپنی

متنوع خصوصیات کے لحاظ سے ادب اردو میں بےنظیر تھا۔

علاّمہ مرحوم ایک صاحب طرز انشاء پرداز تھے ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ ان کی انفرادی شخصیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے قدرت نے انہیں ایک درد مند دل عطا کیا تھا اس لئے قدرتاً انہوں نے ملک کے سب سے زیادہ مظلوم اور مصیبت زدہ طبقے کی نمایندگی اپنے ذمہ لی۔ انہوں نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے بےشمار مضامین اور کتابیں لکھیں اور عورت کے درد وغم کی ترجمانی اس خوبی سے کی۔ کہ زبان خلق نے انہیں "مصوّر غم" کا خطاب دیا اس سلسلے میں علامہ مرحوم نے عورتوں کی زبان لکھنے میں وہ کمال پیدا کیا کہ کوئی دوسرا شخص اس فن میں بآسانی ان کا ہم پایہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ان کی تحریر میں یہی ایک خصوصیت نہیں۔ وہ ایک شاعرانہ دل ودماغ لے کر پیدا ہوئے تھے اور اگرچہ ہم انہیں اردو کے بڑے بڑے شعرا کی صف میں کھڑا نہیں کر سکتے۔ مگر ان کے شاعرانہ تخیل نے ان کی نثر میں وہ روانی، وہ ہم آہنگی الفاظ، وہ ڈرامائی جوش پیدا کر دیا جو صرف اعلیٰ درجے کی شاعری کا حصّہ ہے۔

مولانا اگرچہ مصوّر غم اور عورتوں کے درد دل کے ترجمان تھے لیکن وہ کوئی مرگ فروش قنوطی نہ تھے ان کی تحریروں میں جابجا خوش طبعی اور

زندہ دلی کے غنچے بھی چٹکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

علامہ مرحوم کی تحریروں میں وسعت اور تنوع کا وہ عالم ہے، کہ کہیں ایک بات دہرائی نہیں گئی وہ جس موضوع قلم اٹھاتے تھے۔ اس کے متعلق الفاظ اور اصطلاحات کا ایک خزانہ بے تکلف لٹا دیتے تھے لیکن اپنے دریا نوال ذخیرۂ الفاظ کے باوجود غیر مانوس اور ناقابل فہم الفاظ اور ترکیبوں سے ہمیشہ بچے رہے۔ سادگی، روانی اور جوش ان کی تحریروں کا طغرائے امتیاز ہے ان کے مضامین اور کتابوں کے آغاز میں بھی یہی سادگی اور دلکشی ہے انہوں نے ان موقعوں پر آرائش کے لئے غیر ضروری تمہیدی فقرے نہیں لکھے ان کی ہر کتاب کا آغاز نہایت برجستہ اور دلکش ہے ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ''صبح زندگی'' کی ابتدا یوں ہوتی ہے :-

"جو کہیں ماں کا بس چلے تو وہ منجھلی کی طرح نسیمہ کا بھی ایسا گھر کھوج کھوئے کہ گھر تو گھر محلہ بھر تھڑی تھڑی کرتا۔ مگر وہ تو خدا بیچاری سنجیدہ کا بھلا کرے بہتیرا ہی بھائی بھاوج نے سر پٹکا لیکن اس اللہ کی بندی نے ایک نہ سنی۔"

"شب زندگی" کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

''نسیمہ کی رحلت معمولی موت نہیں ایک قیامت تھی جس نے شہر بھر

میں کہرام مچادیا۔"

"نوبت پنجروزہ" یوں شروع ہوئی ہے :-

"پھولوں کی سیجوں پر اور کھرّی چارپائیوں پر امرا اور غربار کی راتیں آتی ہیں مگر دلّی کے بادشاہ کی رات دیکھنا کس شان سے آتی ہے اور کس انداز سے جاتی ہے"۔

"ببلہ میں میلہ" کا شاعرانہ آغاز دیکھیئے :-

"کل رات کو جب حسینہ ارضی چادر مہتاب میں لپٹی بے خبر پڑی سوتی تھی، دل وحشی رنگ لایا۔ چاندکی روشن شعاعیں تیر کی طرح آنکھوں میں گھسیں۔ دماغ نے راحت وسکون کے بجائے یاد رفتگاں پر رجوع کیا۔ اور آنکھیں زندہ دنیا میں بچھڑی ہوئی صورتوں پر غور کرنے لگیں۔ تارے آدھی رات کا نقارہ بجا چکے تھے۔ آہستہ سے اٹھا اور خاموشی سے چلا۔ اور ایک بجے کے قریب خود کو مہندیوں میں پہنچا دیا۔"

مولانا کی تصانیف کے یہ سادہ اور دلکش ابتدائی فقرے انکے اسلوب بیان کی کلید کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی پوری کتاب اسی سادہ اور برجستہ انداز کا نمونہ ہوتی ہے۔

وہ جو کچھ کہتے تھے اس کے متعلق انہیں تفصیلی معلومات حاصل

ہوتی تھیں۔ نمونے کے طور پر صرف ایک مثال لے لیجئے۔ 'صبح زندگی' میں تیپچی کی ترکیب یوں بیان فرماتے ہیں :۔

" تیپچی کی ترکیب یہ ہے کہ کپڑا ہاتھ میں لے کر بڑا اوپر اور چھوٹا نیچے رکھا اور پھر سینا شروع کیا۔ سوئی میں جتنا کپڑا آجائے یعنی جب سوئی میں کپڑا بھر جائے اس وقت سوئی نکالو اور پھر آگے شروع کرو اسی طرح ساری سیون ختم کرلو۔ جب پوری کرلو تو جہاں سے تیپچی شروع کی ہے وہاں ناخن رکھ دو۔ مطلب یہ کہ ناخن سے کھینچ کر صاف کردو۔ بیچ میں جھول یا سلوٹ نہ رہ جائے یا تاگے کی گرہ نہ پڑ جائے۔ ہاں جہاں تیپچی ختم ہو دو تین ٹانکے لگا کر دھاگا توڑنا کہ ادھڑ نہ جائے۔ پھر چیکلی دینا۔ وہ اس طرح کہ سیون کو موڑ کر پھر کرتے کو ہاتھ سے صاف کردو اب کرتہ کھڑا ہو گیا۔ وہ جو مونڈھے کی پٹی چھوڑ دی ہے اس میں لال ڈورا دو۔ چیکلی پٹی اوپر اٹھائی نیچے کی نیپلی سیون میں ڈورا رکھا اور وہ چیکلی سیون اوپر رکھ دی، سیدھا کیا اور کوک دی کہ چیکلا نیپلا نہ ہو جائے کوک تو جانتی ہونا۔"

اس اقتباس میں نہ صرف تیپچی کی پوری ترکیب موجود ہے۔ بلکہ اس ضمن میں سینے پرونے کے متعلق ایسے الفاظ اور اصطلاحیں بے تکلفانہ استعمال کی ہیں جو صرف درزیوں یا تجربہ کار عورتوں کو معلوم ہوتی ہیں۔

ایسے موقعوں پر اچھے اچھے لکھنے والے ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔

'صبح زندگی' سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:-

نسیمہ کوٹھڑی کھول چیزیں رکھنے چلی تو ڈانٹ پڑی۔

"کے دفعہ بتا چکی ہوں کہ اوڑھنی کا بکل سیدھی طرح لگایا کرو مگر جب دیکھو وہی بیہودہ پہنے سے۔ بیٹی الٹی طرف کا پلہ زیادہ رکھتے ہیں۔ سیدھی طرف کا بکل لگا الٹی طرف کا کندھے پر ڈال لیا مردوں کے سامنے تو ان باتوں کا خیال رکھا کر بے شرم۔ باپ کے سامنے جا رہی ہے اور سارا بازو کھلا ہے آج باپ بھائی سے لحاظ کرو گی تو کل دیور جیٹھ سے شرم آئے گی۔ یہیں دیدہ ہوائی گیا تو وہاں کیا خاک ہوگا"۔

جزئیات کے مشاہدہ کا کمال دیکھیئے عام طور پر مرد جن باتوں کو سرسری نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے متعلق غور کرنے کی ضرورت کبھی نہیں سمجھتے ان کے متعلق علاّمہ مرحوم کی گہری نگاہ کہاں تک معلومات حاصل کر چکی ہے کوئی عورت بھی اس سے بہتر بکل لگانے کا طریقہ نہیں بتا سکتی۔ آج کل جو لوگ کسی فن کے متعلق سرسری معلومات حاصل کر کے مضامین لکھنے لگتے ہیں ان کے لیۓ علاّمہ مرحوم کا طریق کار چراغ راہ ہونا چاہیۓ۔ عورتوں کے متعلق کتابیں لکھنا جب انہوں نے اپنے لیۓ مخصوص کر لیا تو ان کے جذبات و خیالات، ان کے عادات

ورسوم، ان کے روزمرہ کے کاموں، ان کی تفریحات، ان کی کشیدہ کاری اور ان کے سینے پرونے تک کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور ان کی زبان محاورات اور خاص اصطلاحات کے متعلق وہ معلومات بہم پہنچائیں کہ اچھے سے اچھے گھرانے کی عورتیں بھی اس بات میں ان کی برتری کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

مولانا کی ہمہ گیر طبیعت محض غم کی مصوری پر قانع نہ رہی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان کی تحریروں میں بذلہ سنجی اور خوش طبعی کی چاشنی بھی ہے۔

'سات روحوں کے اعمالنامے' میں مرقان اور جوتے والے کی گفتگو مزاحیہ نگاری میں مولانا کی قدرت فن کی شاہد عادل ہے۔ مرقان 'رب الاہیخفر' کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کو اس دنیا کا بہترین تحفہ جونکوں کی روح ہے پیش کرنا چاہتا ہے عورت کی روح قبض کرنے کے لئے اسے سنکھیا خریدنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ چنانچہ دنیا کے حالات کی ناواقفیت اسے سنکھیا خریدنے کے لئے اسے ایک جوتے والے کی دکان پر لے جاتی ہے۔ جہاں وہ چھوٹتے ہی سوال کرتا ہے۔

" آپ کے ہاں سنکھیا ہے؟

جوتے والا : کیا چیز جناب ؟

مرفان : سنکھیا !

جوتے والا : منوں، کتنی لیجیے گا ؟

مرفان : ایک روح کے قابل۔

دوکاندار مرفان کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے وہاں تھانہ دار نے آپ سے نام دریافت کیا تو یہ سٹپٹائے کہ کیا کہیں۔ ملک الموت کی رفاقت کے صدقے میں انہیں چند بیماریوں کے نام معلوم تھے، بولے :- میرا نام بخار ہے۔

اتنے میں وضعدار نے تھانیدار کے ایسا سے صحیح نام کرنے کے لئے مرفان کے گال پر زنڑ سے ایک تھپیڑ دیا اور دو گھونسے لگا کر کہا :- بتا اپنا نام ؟

مرفان : کھانسی لکھ لیجئے۔

اب تھانیدار آپے سے باہر ہو گیا اور مارے ہنٹروں کے مرفان کی کھال اڑا دی۔

مرفان : اوہ، آہ، ہے، ہو۔ میرا نام سنکھیا، اسقیر، دوزخ آدمی۔

تھانیدار نے تھک کر اسے پھر حوالات میں بند کر دیا۔

مزاح نگاری کی ایک اس سے بہتر مثال 'حیات صالحہ' میں بیوی کی

موت کے بعد سیّد کاظم اور ان کی بہن کی گفتگو ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"ادھر سیّد کاظم کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھوئے چلنے ہی کو تھا کہ ادھر اس نے (بہن نے) لیٹے لیٹے پلنگ سے سر اٹھا کر کہا۔ بھئی اب جو کچھ ہونا تھا ہو گیا آخر گھر کا بھی کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گا یا نہیں۔ بغیر بیوی کے کام نہ چلے گا۔ میری تو صلاح ہے نکاح کر لو۔

سیّد کاظم پہلے ہی نکاح کی دھن میں ایسا باؤلا ہو رہا تھا کہ اس کو دنیا و مافیہا کا ہوش نہ تھا بہن کا کہنا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا۔ یا تو چلنے کو اٹھ کھڑا ہوا تھا یا جھٹ بیٹھ گیا۔

بہن کی گفتگو اور اس "جھٹ بیٹھ گیا" کے فقرے میں مولانا کی نفسیاتی دقّتِ نظر ملاحظہ فرمایئے اس کے بعد اسی نقطۂ خیال سے سیّد کاظم کا جواب دیکھیئے۔ فرماتے ہیں :۔

"کیا کروں میرا دل برداشت نہیں کر سکتا کہ صالحہ کی ماں مر جائے اور میں دوسرا نکاح کر کے ان بچوں کو ایک غیر عورت کا دستِ نگر بنا دوں۔ یہ سچ ہے کہ مجھ کو آرام پہنچے گا میرے کھانے کا پینے کا، کپڑے کا، لتّے کا، آنے کا، جانے کا، حساب کا، کتاب کا، لینے کا، دینے کا ٹھیک ہو جائیگا بلکہ یوں کہو کہ میرا گھر درست ہو جائے گا۔ مگر اب گھر میرا نہیں ان بچوں کا ہے"۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ کاظم صاحب نکاح سے بظاہر انکار فرماتے ہیں۔ لیکن یہ "کھانے کا، آنے کا، جانے کا، حساب کا، کتاب کا اور معلوم نہیں کیا کیا کا" کی بڑھتی ہوئی لَے ان کی زیر شعوری نفسیاتی کیفیت کا بھانڈا کس بھونڈے پن سے پھوڑ رہی ہے۔

مولانا کو مکالمہ نگاری اور ڈرامائی انداز بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ مثال کے طور پر یہاں" جو ہر قدامت" سے حسن اور شاہدہ کا مکالمہ نقل کیا جاتا ہے:۔

شاہدہ: کیا بیویاں اس لئے کی جاتی ہیں کہ چولہے میں جھکیں، اور بھاڑ میں بھنیں؟

حسن: یہ میرا مطلب نہیں ہے کہ اگر کھانا پکانا یا پکوانا ایسی سخت مصیبت ہے تو اس سے بہت زیادہ مصیبت کے کام مرد بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ عورتوں پر احسان کر رہے ہیں۔

شاہدہ: تمہاری گفتگو ایسی تیز ہے کہ افسوس میں برداشت کے لئے تیار نہیں۔

حسن: تمہاری حالت اس قدر خراب ہے کہ مجھ میں اب سہار کی ہمت نہیں۔

شاہدہ: اس کا فیصلہ یہ بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر خوش میں اپنے۔

حسن : اگر یہ ہی بہتر فیصلہ ہے تو سر آنکھوں پر۔

شاہدہ : خیر! مجھے زیادہ بحث کی فرصت نہ ضرورت۔ یہ کہہ کر شاہدہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں آ بیٹھی۔"

اسی کتاب میں مشرقی روایات کا ماتم ان نادر الفاظ میں کیا ہے :۔

"وقت کی پوری رَو، حکومت کا زبردست اثر، مغربیت، ہر ذی روح اور غیر ذی روح شخص سے ظاہر ہو رہی ہے۔ حد یہ کہ زمین کی پیداوار اور ہوا کا کرّہ بھی اسی رنگ میں شرابور تھا۔ اس زہر ہلاہل کا اثر اتنی ترقی کر گیا تھا کہ زمین سے پھول اگتا تو خوشبو سے محروم اور ہوا میں طائر چہکتا تو نغمے سے پاک"۔

آخری فقرے کے الفاظ اور ان کے مفہوم پر غور کیجیے۔ "پھول اگتا تو خوشبو سے محروم اور ہوا میں طائر چہکتا تو نغمے سے پاک" کس اعجازِ بیان سے مغربی تہذیب کے "چھوٹے ٹکڑوں کی ریزہ کاری" کا خاکہ اڑایا ہے۔

مولانا کا دل و دماغ بزرگوں کی جس دنیا میں بستا تھا اس کی ایک جھلک دیکھیے اور اس کی یاد پر پھر وہی ماتم و زاری ملاحظہ فرمائیے :۔

"نوبت پنجروزہ" میں لکھتے ہیں :۔

"عصر کی اذان ہوئی۔ نقارچی نے چار دھولیں بجائے، ادھر بادشاہ

سلامت نے نماز پڑھی، سلام پھیرا، دعا مانگی، کھڑے ہوئے تو جسولنی نے سامنے آکر مجرا کیا اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا :۔

"عملہ محلہ یوزک رکاب سب حاضر"

بادشاہ سلامت برآمد ہوئے۔ چوبدار نقرئی عصا لئے ساتھ ہیں۔ خواجہ سرا دست بستہ آگے آگے چل رہے ہیں، نقیب ہر قدم پر آواز لگا رہا ہے "مزید اقبال، مزید اقبال"۔

جھروکوں میں تشریف لائے، ہائے جھروکوں کا نام آتے ہی کلیجے پر سانپ لوٹ گیا یہ چیزیں کیا ہوئیں اور وہ دن کدھر گئے۔ مگر نہیں سب کچھ ہے۔ قلعہ بھی ہے، جھروکے بھی ہیں، دن بھی، راتیں بھی ہیں۔ فقط ایک چیز چلی گئی۔ وہ کیا؟ خلوص، خلوص"۔

اسی دنیا کی ایک اور جھلک دیکھئے :۔

"دوپہر کی دھوپ چلی اور بارہ دری کے چاروں طرف پہرے لگ گئے۔ اب مجال نہیں کہ چڑیا کا بچہ بھی بارہ دری میں داخل ہوسکے امیر غریب، نوکر، چاکر، سب خاموش اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں کہ جسولنی جو بارہ دری کے خاص کمرے میں پہرہ دے رہی تھی۔ دوڑی ہوئی آئی، اور کہا۔ آبدار خانہ کے داروغہ سے کہو۔ "آبحیات" جلد حاضر کرے۔ داروغہ تیار تھا اسی وقت ایک صراحی گنگا کے اور ایک جمنا کے پانی کی جو چار

پھر تنک نغفار کر سر بہ مہر برف میں دبائی تھی لے کر آگے بڑھا ایک صراحی ہاتھ میں رکھی دوسری جسولنی کو دی۔ جسولنی نے خواص خاص کو دی۔ اس نے جاکر ملکہ عالیہ کے سامنے مہر توڑی اور طلائی کٹورے میں ان کے سامنے پانی الٹا۔ ملکۂ دوراں اپنے ہاتھ سے پانی پلانے چلیں اور کٹورا پیش کیا۔"

ان اقتباسات سے جہاں مولانا کی وقائع نگارانہ قابلیت کا اظہار ہوتا ہے وہاں دردوسوز کے ان سوتوں کا سراغ بھی مل جاتا ہے۔ جن سے ان کو عمر بھر رونے کے لئے آنسوؤں کا اتنا بڑا خزانہ مل گیا۔ خود لکھتے ہیں :۔

"راشد! بے وقت کا راگ گا چکے۔ حب وطن کے جذبات ختم کرو دلّی کا انقلاب انوکھا اور تغیّر نرالا نہیں۔ دنیا ایسے ایسے سینکڑوں رو بھر چکی۔ اور زمانہ ہزاروں سوانگ بدل چکا۔ مردہ صورتوں کو رو چکے زندہ چہروں پر نظر ڈالو۔ یہ زبانیں تغیّر کی پوری پوری داستانیں سنادیں گی۔"

مولانا کو قوم نے مصوّر غم کا خطاب دیا۔ غم کی مصوّری کا کمال دکھانے کے لئے میں کسی نصیبوں جلی عورت کا دکھڑا نقل نہیں کرتا بلکہ مولانا کے قلم سے اس شخص کے غم کی تصویر پیش کرتا ہوں۔ جس کی

مصیبت سارے وطن اور ساری قوم کی مصیبت تھی اور جس کا غم سارے ہندوستان کو معلوم نہیں کس نامعلوم مدّت کے لئے مغموم بنا گیا :-

شہنشاہ ہندوستان بہادر شاہ قید فرنگ کی سختیاں جھیلنے کے لئے زندہ ہے اور زمین و آسمان اس کی مصیبت پر رو رہے ہیں" نوبت پنجروزہ" میں علاّمہ راشد الخیری ان دردناک الفاظ میں بادشاہ کے دل کی ترجمانی کرتے ہیں :-

"بہادر شاہ کی موت کو نہ معلوم کون سی موت کھا گئی تھی کہ دنیا مر رہی تھی۔ لیکن اس کو موت نہ آتی تھی، شاہی مٹ چکی، حکومت ختم ہوئی، دولت کو آگ لگ گئی، عیش رخصت ہوا، مصائب کا توڑ، آفات کا نچوڑ، کس کس کا رونا رویا جائے۔ جوان جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے خاک میں چلے گئے۔ کیسے کیسے موٹے تازے دوست اور خیر خواہ قبروں جا پہنچے۔ لیکن زندہ رہا تو وہی کم بخت مصیبتیں جھیلنے اور آفتیں اٹھانے کو اس حال میں کہ دیوانوں سے بدتر اور اس رنگ میں کہ فقیروں سے ابتر۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سنگ دل لڑکے کی طرح جو پرندے کو پکڑ کر کبھی اس کا پر نوچتا ہے اور کبھی ٹانگ۔ وقت بھی بہادر شاہ کو قسم قسم کی اذیتیں پہنچا کر تماشا دیکھ رہا تھا۔"

اس اقتباس کے پہلے ہی فقرے پر نظر ڈالئے۔" بہادر شاہ کی موت

کو نہ معلوم کونسی موت کھا گئی تھی کہ دنیا مر رہی تھی لیکن اس کو موت نہ آتی تھی"۔ شدت غم کی تصویر کھینچنے کے لئے اس سے زیادہ بلیغ الفاظ نہیں مل سکتے۔

چونکہ مضمون اندازے سے زیادہ طویل ہو گیا ہے اس لئے خاتمہ پر میں علاّمہ مرحوم کی تحریروں کی چند مزید خصوصیات واضح کرنے کے لئے ان کی مختلف تصانیف سے جستہ جستہ فقرے نقل کر دینے پر اکتفا کرتا ہوں :۔

الفاظ کے ذریعے سے حرکت صوتی کی تصویر ملاحظہ ہو :۔

"وہ عجیب لمحہ تھا۔ آمنہ کا کلیجہ دُھکڑ دُھکڑ کر رہا تھا اور کان جواب کے واسطے تڑپ رہے تھے"۔

معصومیت کی تصویر دیکھئے :۔

"قربان ان پیاری پیاری نظروں کے جو مُٹر مُٹر ماں کا منہ دیکھ رہی ہیں"۔

"نثر میں شاعرانہ تخیل کی جولانی ملاحظہ ہو :۔

"آدھی رات کے سنسان وقت میں جب فانی دنیا کے جھوٹے شیدا آستانۂ سرکار کے باہر اونگھ رہے تھے، سردارِ دو جہاں باہر تشریف لائے۔ آسمان عقل کے اندھوں پر کھلے ہوئے دانتوں سے

ہنس رہا تھا اور زمین جفا کار ہستیوں کو تھپک رہی تھی"۔

محاورہ بندی اور سلاست بیان کا نمونہ دیکھیے :۔

"کہاں پندرہ بیس روپے ماہوار کی مغلانی اور کہاں چار پانچ لاکھ روپے کا تعلقہ، سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا، وہ بڑھ بڑھ کر بولتی اور چڑھ چڑھ کر کہتی کہ سننے والے دنگ رہ جاتے"۔

اخیر میں مولانا مرحوم کی زبان سے ایک چھپیے والے کا ذکر سن لیجیے مغلیہ ہندوستان کا سماں آنکھوں میں پھر جائے گا۔

" آدھی رات کے وقت شہر میں ایک صدا گونجتی تھی :۔

شیدی قمر کے باغ کا دانہ"

یہ ایک خوش الحان کنجڑہ تھا جو نو بجے رات کو شیدی قنبر کے باغ سے کھجوروں کا چھپاے کر اٹھتا تھا رات کے سناٹے میں جب اس کی آواز بھنبیری کی طرح جھومتی تھی تو لوگ پروانوں کی طرح گرتے تھے"۔

آہ! اب نہ وہ دن رہے نہ وہ راتیں رہیں اور نہ کوئی ان دنوں اور ان راتوں کی باتیں لکھنے والا رہا۔ ہماری قدیم تہذیب و معاشرت ایک افسانۂ شب ہو کر رہ گئی اور اس کی آنکھیں دیکھا ہوا ہمارا آخری ادیب بھی دفینۂ خاک بن گیا۔

دلی کی زبان ختم ہو گئی۔

ہماری علمی درسگاہوں کا غلط نقطۂ نظر

جب ہم اپنے گردوپیش انسانی تہذیب و تمدن پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت مختلف شعبوں پر مشتمل ہے زندگی نے اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ان شعبوں کو یہ شکل دی ہے مثلاً اس نے اپنی ضروریات کی تشفی کے لئے مذہب کی تنظیم کی، قانون جاری کیا، عدالتیں، پولیس، جیل خانے اور اس قسم کی بہت سی افادہ گاہیں (INSTITUTIONS) قائم کیں۔ اسی طرح انسان کو حیوانی منزل سے نکالنے اور اس کے تمام پوشیدہ امکانات کو ظاہر کرنے کے لئے تعلیم کا نظام رائج ہوا ہے۔

زندگی اور اس کی تمام افادہ گاہوں میں ایک نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہے وہ ان تمام حوادثات، تبدیلیوں اور خیالات سے متاثر ہوتی ہیں جو زندگی پر اپنا اثر ڈالیں۔ مختلف لوگوں نے اور مختلف زبانوں نے زندگی کا مفہوم جداگانہ سمجھا ہے اس کے نصب العین کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ اس کے اغراض و مقاصد مختلف قرار دیئے ہیں اس وجہ سے

ان افتادہ گاہوں نے کبھی ایک مقصد پورا کیا ہے اور کبھی دوسرا۔ اگر ایک طرف مذہب غالب فرقوں کا اقتدار قائم رکھنے میں معین ہوا ہے۔ تو دوسری طرف اس نے مغلوب کی جنبہ داری بھی کی ہے سرمایہ داری کے نظام میں قانون کا فرض عام طور پر یہ رہا ہے کہ جس کے پاس کچھ ہے اس اور دیا جائیگا اور جس کے پاس کچھ نہیں ہے اس سے وہ بھی لے لیا جائیگا جو اس کے پاس ہے لیکن آج کل اشتراکی نظام نے قانون ہی کو ان لوگوں کا طرفدار بنا دیا ہے جو مدتوں سے سرمایہ اور ملکیت دونوں سے محروم تھے۔ اس طرح جوں جوں زندگی کا نصب العین بدلتا رہا ہے تعلیم کی غرض بھی لوگوں کی رائے میں بدلتی رہی ہے۔

یونانیوں کے عہد زریں میں جسمانی نشو و نما، طاقت اور حسن کا فروغ تعلیم کا اعلیٰ مقصد سمجھا جاتا تھا۔ یورپ نے ازمنہ متوسط میں، جب عیسائیت کی سخت گیریاں اور مذہبی مظالم جنون کی حد تک پہنچ گئے تھے تعلیم راہبانہ رنگ میں رنگی گئی تھی گذشتہ صدی میں بہت زیادہ اور کسی قدر کم اس زمانہ میں بھی صنعت و حرفت کا زور ہونے کی وجہ سے تعلیم کا مقصد ایک مستعد اور کماؤ کاریگر ہونا قرار دیا گیا چونکہ زندگی کا میکانیکی رخ غالب اور پیش پیش تھا اس لئے مدرسوں نے اس خیال سے مرعوب ہو کے اس بات کی کوشش کی کہ وہ محض طلب کی کارکردگی

(EFFICIENCY) میں اضافہ کریں۔ اور دوسرے مقاصد کو محض اس مرکزی غرض کے تابع رکھیں۔ یہ نقطۂ نظر اس قدر تنگ اور ضرر رساں ہے کہ اس کی عام قبولیت تعجب کا باعث ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان طبعاً بیوقوف ہے جیسا کہ شیکسپیئر اپنی ایک ہوائی روح پک کی زبانی کہلواتا ہے۔ "بارالہا! یہ انسان کیسے بیوقوف ہوتے ہیں"۔ اس کی دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ یہ میکانکی مفہوم اس زمانے کے فلسفۂ زندگی اور عمل کا ایک جزو ہو چکا تھا اس لیے اس کو تعلیم کے شعبہ اور فلسفے میں راہ پا لینا دشوار نہ تھا۔

ہم نے اب تک یہ بیان کیا ہے کہ کسی ملک یا قوم کی زندگی کی عام حالت کا عکس اس کے نظام تعلیم میں بھی نظر آتا ہے اس اصول کو رہبر بناکر ہم ہندوستان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک کی بے نظمی اور قومی زندگی کے تمام شعبوں کا انتشار ہماری تعلیم میں نمایاں ہے۔ چونکہ ملک کی زندگی کسی مرکز پر مجتمع نہیں کسی زبردست نصب العین کی تابع نہیں اور نہ کسی تخلیقی خیال کے برقی اثر سے متاثر ہے۔ اس لیے اس کی تعلیم میں بھی کوئی ممتاز جگہ کسی دوسرے نظام نے نہیں لی۔ اس لیے نہ تو ہماری تعلیم اس فلسفۂ زندگی کا آئینہ ہے جو مدتوں تک ہمارا امتیازی نشان رہا ہے یعنی امن و سکون اور

رضا جوئی، ابدی سرور کی تلاش۔ اور نہ اس کا کوئی بدل ہمیں نصیب ہوا ہے۔

مغربی تاثرات سے ہم ضرور متاثر ہوئے ہیں لیکن کئی وجوہات سے انہوں نے ہمارے اوپر پوری طرح غلبہ نہیں کیا۔ ہماری تہذیب بہت پرانی ہے اور اس کے بہت سے اثرات ہمارے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ان گہری جڑوں کو زمین سے نکالنا آسان نہیں ہے۔ سیاسی مخالفتوں اور مغربی تہذیب کو ایک حد تک حقیر سمجھنے کی وجہ سے بھی ہمیں اس کے اثرات قبول کرنے میں تامل ہوا ہے اس لئے مغرب میں جو تعلیمی خیالات رائج ہیں ان کو بھی ہم نے تمام تر قبول نہیں کیا البتہ جہاں تک خارجی نظام کا تعلق ہے گورنمنٹ نے ہمارے اوپر اس قسم کے مدارس عاید کر دئیے ہیں جیسے انگلستان میں پچاس برس پیشتر رائج تھے اس سے یہ مراد ہے کہ انہوں نے سرزمین میں جڑ نہیں پکڑی، نشو و نما نہیں پائی، اور اس لئے وہ ان تمام مفید اصلاحوں، ترمیموں، تبدیلیوں سے بیگانہ ہیں جو قدرتی طور پر ماحول کے اثرات کی وجہ سے ہر زندہ افادہ گاہ میں ہونے چاہئیں۔

پھر ہمارے تعلیمی نظام اور تعلیمی خیالات کا رجحان کس طرف ہے تعلیم خواہ کیسی ہی ناقابل اطمینان ہو ملک کے حالات کا ردعمل ہوتا ہے،

ملک کی سیاسی حالت کیا ہے ؟ ایک دفتری حکومت برسر اقتدار ہے۔ اس کے دفاتر میں جگہ پانے اور اس میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ خاص انگریزی حاصل کی جائے جو ان دفاتر کا دروازہ امیدوار کے لئے کھولتی ہے۔ جب تعلیم کا یہ مقصد قرار پایا۔ ارادی طور پر نہیں بلکہ ضروریات اور صورت حال کے منطقی نتیجہ کی بنا پر تو ظاہر ہے کہ اس کی تمام عمارت اس خیال سے بنائی جائے گی کہ وہ اپنی اس غرض کو پورا کرے۔ لہٰذا مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس قسم کی تعلیم رواج پا گئی جو نام نہاد "تعلیمیافتہ" لوگوں کو مختلف قسم کی سرکاری ملازمتوں کے لئے تیار کرتی ہے تعلیم کے اس غرض کے لئے محدود ہو جانے سے اس میں تقریباً تمام وہ نقائص پیدا ہو گئے ہیں۔ جو پیشہ کی تعلیم میں ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ ان تمام فوائد اور خوبیوں سے معرا ہے جو بالعموم پیشہ کی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں۔ بظاہر وہ عام تعلیم ہے یعنی کسی مفید پیشہ سکھانے سے اس کو سروکار نہیں یا بقول دل خوش کن جملہ گروں کے اس کا کام "زندگی کا پیشہ" سکھانا ہے۔ جو شخص بی، اے، پاس کر لیتا ہے وہ اکثر سوائے ملازمت کے کوئی فائدہ بخش کام نہیں کر سکتا۔ بقول حالی :-

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر ۔۔۔ یہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

لیکن "عام تعلیم" کی جو غایت اصلی ہے وہ اس سے پوری نہیں ہوتی یعنی شوقوں کا ابھار، دلچسپیوں کی وسعت، مختلف حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت، انسانی حقوق و فرائض سے آگاہی اور ان کا احترام، رواداری وغیرہ۔

میں نے کہا ہے کہ "وہ بظاہر وہ عام تعلیم" ہے۔ "بظاہر" اس لئے کہ فی نفسہ اختصاصی تعلیم ہے۔ یعنی وہ ایک پیشہ کے لئے تیار کرتی ہے اور وہ پیشہ ملازمت کا پیشہ ہے۔ ہم ملازمت کو "حقیر" نہیں سمجھتے۔ معمولی حالات میں وہ بھی ملک اور قوم کی خدمت کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن اس کو تعلیم کا منتہا بنا لینا ایک تو اس کے نصب العین کو گرانا ہے۔ دوسرے اس کے فوائد اور عمدہ اثرات کو محدود کرنا۔ ملازمت کے لئے امیدوار تیار کرنے سے وہ فائدے بھی حاصل نہیں ہوتے جو پیشہ کی تعلیم سے عام طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی انفرادی رجحانات کا معلوم ہونا اور مخصوص انفرادی قوتوں کی نشو و نما عملی مشاغل کی مصروفیت میں ذہنی طاقتوں کی ترقی، توجہ اور خیالات کی یکسوئی، انسانی جذبہ تخلیق و ایجاد کی تشفی اور ان طلبہ کی صلاحیتوں کا اظہار جن کے لئے کتابی تعلیم موزوں نہیں۔

مختصر یہ کہ موجودہ تعلیم حاصل کرنے میں یہ اندیشہ ہرگز نہیں کہ

اس سے انسانی تہذیب و تمدّن میں کوئی اضافہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے عام طور پر جدّت اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوگا۔ کیونکہ اس کے لئے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں رعایت ہی نہیں رکھی گئی۔ نہ وہ تمام مختلف قسم کی قوتوں کو پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ اس کی نظر اور دائرہ تنگ ہے اور حلقۂ اثر محدود۔ اور ارادی طور پر شوق خدمت یا جذبۂ ترقی کو نہیں ابھارتی کیونکہ تعلیم گاہوں کی زندگی اور نصب العین میں ان مقاصد کو عملاً تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس تعلیم کو حاصل کرنیوالوں میں اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ صاحبان تحقیق خادمان ملک و قوم ہوئے ہیں۔ لیکن اس کی ذمہ داری اس نظام تعلیم پر عائد نہیں ہوتی۔ بلکہ خود ان لوگوں کے جوہر قابل پر جو باوجود ناقص ماحول کی رکاوٹوں کے اپنا اظہار کئے بغیر نہیں رہا۔ برناڈ شا نے کہا ہے۔ "میں جیسا بھی کچھ ہوں باوجود اپنی تعلیم کے۔" غالباً ہندوستان کے بہت سے مایۂ ناز فرزند اس مقولہ کو اپنے پر صادق پائیں گے۔ ہمارے طریقۂ تعلیم کی اصلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے ایسے جوہر قابل خاک میں مل گئے جو مناسب تربیت ملنے پر چمکتے اور ملک کے لئے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوتے اور عملاً نعمت الٰہی کا شکریہ ادا کرتے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقتصادی حالت کا ردّ عمل کیا ہوا؟ ملک

میں صنعت وحرفت بہت کم ہے ۔ تجارت کے راستے اکثر اقوام پر بند ہیں ۔ زراعت ایسے نکمے اور پرانے طریقوں پر کی جاتی ہے کہ اس میں معقول اور حسب توقع فائدہ نہیں ہوتا ۔ عام تعلیم ایسی ہے کہ مختلف فنون اور صنعتوں کی جانب رغبت دلائے اور نہ ہی "اختصاصی تعلیم" اس قدر عام اور سستی ہے کہ بہت سے لوگ اس سے مستفید ہوسکیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے راستوں کے بند ہونے اور تعلیم کی غلط رہنمائی کی وجہ سے جو نوجوان تعلیم کا شوق اور استطاعت رکھتے ہیں انہی مدارس کی جانب رجوع کرتے ہیں جن سے گزرنے کے بعد ملازمت کی منزل آتی ہے ۔ لیکن دنیا کے کسی ملک میں بھی کوئی ایک شعبہ اتنا وسیع نہیں ہوسکتا کہ ملک کی قریب قریب ساری تعلیمیافتہ آبادی سما سکے ۔ نوکریوں میں تو گنجایش اور بھی کم ہے چنانچہ ملازمت کی شاہراہیں بہت جلد امیدواروں کے ہجوم کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ بھر گئیں ۔ ایک بے تحاشہ اور بے اعتدال مقابلہ شروع ہوگیا ۔ جس نے لوگوں کے اخلاق اور کیرکٹر پر بہت برا اثر ڈالا ۔ قوموں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہوگئے ۔ رواداری جاتی رہی ، معمولی معمولی ملازمتوں کی قیمتیں بڑھ گئیں ۔ جس جگہ کے لئے چند سال پیشتر انٹرنس پاس شخص موزوں خیال کیا جاتا تھا ۔ اس کا حصول امیدواروں

کی کثرت کی وجہ سے اب بی اے اور ایم اے پاس لوگوں کے لئے بھی مشکل ہو گیا ہے اور اکثر "تکمیل" تعلیم پائے ہوئے آدمی یا تو نہایت کم مایہ ملازمت پڑے ہوئے ہیں (اور وہ خود کو مقابلتہً خوش قسمت سمجھتے ہیں) یا محض امیدواری کی منزلیں طے کرنے میں بیکاری کے سال بسر کرتے ہیں۔

اس صورت حال کے معنی قومی نقطۂ نظر سے کیا ہوئے؟ یہی کہ قوم جو سرمایہ اور محنت اپنے افراد پر لگاتی ہے اس سے فراروافی منافع حاصل نہیں ہوتا معاوضہ کے طور پر قومی خدمت تو کجا یہ لوگ اکثر خود اپنا بوجھ بھی نہیں برداشت کر سکتے اور دوسرے لوگوں پر بار ہو کر تیرنے آدمی کے لئے گردن کے پتھر کا کام دیتے ہیں نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت اور بھی افسوسناک ہے افراد قوم کی جو طاقتیں قوم کی تعمیر میں صرف ہونی چاہیئے تھیں کم و بیش بے فیض طریقوں سے خرچ ہوتی ہیں یا بالکل بیکار رہتی ہیں تعلیم کے یک طرفہ اور محدود ہونے سے متنوع صلاحیتوں کا ارتقا نہیں ہوتا اور قومی زندگی مالامال نہیں ہو سکتی۔ اس طرح سے ایک ایسا مضر سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ملک کی حالت تعلیم پر برا اثر ڈالتی ہے اور تعلیم کے اثرات ملک کے لئے خراب ثابت ہوتے ہیں۔

یہ ہے مختصر خاکہ اس تعلیم کا جو گورنمنٹ کے زیر اثر ہندوستان میں رائج ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری تحریک کا ذکر بھی ضروری ہے جو ملک کی حالت کی بعض تبدیلیوں سے پیدا ہوئی ہے۔ تاریخی نظیروں سے اور ان سے زیادہ موجودہ سیاسی اور اقتصادی حالت اور آزادی کی فطری اُمنگ سے متاثر ہو کر لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ اپنے ملک کو غیر ملکی غلبہ سے خواہ وہ سیاسی ہو یا تمدّنی آزاد کرے۔ وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ ملک پوری طرح اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اسے اپنی فطرت کے قوانین پر عمل پیرا ہونے کا موقع نہ ملے، جب تک وہ اپنی زندگی کے نظام کو مرتب نہ کرے، غلطیاں کرے اور اس سے سبق سیکھے، ترقی کرے اور اس سے خود اعتمادی میں اضافہ ہو اور سب سے ضروری یہ ہے کہ ماتحتی اور بے بسی کی وہ ذہنیت دور ہو جائے جو ہر قسم کی ترقی کا سدّباب اور قوّت عمل کو شل کئے ہوئے ہے۔

ہمیں اس وقت اس عظیم الشان تحریک کے سیاسی اور ادبی پہلو سے بحث نہیں۔ یہاں اس کا تعلیمی رخ پیش نظر ہے بہت عرصہ تک سیاسی اور قومی رہنماؤں نے محض آئینی جد و جہد تک اپنی کوششوں کو محدود رکھا ان کا خیال تھا کہ اگر ملک کو پہلے سیاسی آزادی میسّر ہو جائے۔

تو اس کے بعد قومی زندگی کی تعمیر کامیابی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ یا زیادہ تنگ نظر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محض سیاسی اختیارات اور آزادی کا حاصل ہو جانا اس اندرونی اصلاح کے لیئے کافی ہے۔ جو قومی اور شخصی زندگی کی سلامت روی کی ضامن ہوتی ہے یعنی وہ چاہتے تھے کہ اپنا اصلاحی کام باہر سے اندر کی جانب کریں۔ حالانکہ پائدار کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اصلاح اندر سے شروع ہو اور اپنا زبردست اثر ڈال کر بیرونی حالات کو بدل دے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ سیاسی جدوجہد بیکار ہے نہیں، وہ بھی ضروری ہے جب تک وہ حاصل نہو۔ ہم ایسی فضا پیدا نہیں کر سکتے جو حقیقی اصلاح کے لئے پوری طرح سازگار ہو۔ لیکن صرف پر قناعت کرنا مصلحت اور ضرورت دونوں کے خلاف ہے کیونکہ ایک طرف تو سیاسی آزادی کا جائز استعمال سکھانے کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے اور دوسری طرف ہم ہر قسم کی اصلاح کے لئے اس خوش آیند وقت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہ سکتے ہیں جب آزادی حاصل ہو گئی تو ایسا کرنا ان نسلوں کے حق میں بے انصافی ہو گی۔ جو اپنی ایک لمبی زندگی اس وقت تک گزار چکیں گی اور مستقبل کے حق میں ظلم ہے جس کو ماضی کی بدعنوانیوں کا اور غلطیوں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے غرض اس خیال کو قبول کر کے

گذشتہ نصف صدی سے ملک کے بعض بہی خواہ اور رہنما ملک کی تعلیم کی جانب متوجّہ ہوئے اور بہت سی درسگاہیں قائم ہوئی ہیں۔ تاکہ ملک میں تعلیم پھیلائیں ۔ان مصلحین میں اوّلیت کا فخر سر سیّد کو حاصل ہے جنہوں نے بڑے پیمانے پر پہلی پرائیویٹ درس گاہ مغربی علوم اور مشرقی علوم دونوں کی ترویج اور امتزاج کے لئے قائم کی ۔اس کے بعد مختلف ہندوستانی قوموں نے اپنے اپنے خیالات اور احساس و ہمّت کے موافق تعلیم گاہیں بنائیں لیکن اس قسم کی تمام درس گاہیں حقیقی معنوں میں قومی تعلیم گاہیں نہیں بن سکیں۔ کیونکہ صرف چند مضامین کی کمی ،زیادتی ،یا انتظام کا غیر سرکاری جماعتوں کے سپرد ہونا تعلیم کی نوعیت بدلنے کے لئے کافی نہیں اس کے لئے نصب العین اور نقطۂ نظر کے بدلنے کی ضرورت تھی اور اس بات کی کہ آہستہ آہستہ نظام معاشرت میں ایسی ترمیم ہوتی جائے ۔کہ تعلیم جدید اپنا اثر پوری طرح دکھا سکے ۔علاوہ اس کے اس تحریک کا زیادہ تر زور "اعلیٰ تعلیم" پر رہا۔جس کے معنی یہ ہیں کہ قوم کی محنت اور دولت کا بیشتر حصہ مقابلتہً ایک بہت چھوٹی تعداد پر صرف ہوگیا۔ ابتدائی تعلیم کی نہ تو اصلاح ہونے پائی نہ اس کو عام طور پر رائج کیا جاسکا۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بہت غنیمت ہے کیونکہ ناقص

تعلیم، تعلیم نہ ہونے سے بدتر ہے۔ بہر حال اعلیٰ تعلیم کو زیادہ
اہمیت دینے کی موافقت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ اس
وقت ایک ایسا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ جو
ملکی ذمہ داریوں کو سنبھال سکے اور عام تعلیم کی تحریک کا حامل ہو سکے
لیکن اوّل تو اس مقصد میں جو کامیابی ہوئی وہ جزوی تھی دوسرے
اگر یہ طریقہ عمل فوری ضرورت کا خیال کر کے اختیار کیا گیا تھا۔ تو دور اندیشی
اور ملک کے تغیر پذیر حالات کا تقاضا تھا کہ اس کو بدل دیا جاتا لیکن صورت
حال یہ ہوئی کہ ابتدائی تعلیم جو عوام کے لئے ایک لازمۂ زندگی تھی ماہرین
تعلیم وغیرہ کی توجہ سے محروم رہی۔ تعلیم کی عمارت ایسی بنائی گئی کہ اس
کی ابتدائی منزل کمزور، تنگ اور معمولی رہ گئی۔ اوپر کی منزل بھاری،
ایسی صورت میں جو تعلیمی اور معاشرتی نتائج قدرتی طور پر پیدا ہونے
تھے پیدا ہوئے۔ تعلیم سطحی اور غیر مؤثر رہی۔ تعلیمیافتہ اور غیر تعلیمیافتہ
طبقہ میں ایک خلیج حائل ہو گئی، ان کے خیالات، امنگوں، مالی حالت،
اور دلچسپیوں غرض ہر چیز میں تفاوت بڑھتا گیا۔ اور اسی سبب سے
جو سیاسی یا معاشرتی تحریکیں تعلیمیافتہ طبقے نے شروع کیں وہ ملک
میں مضبوط جڑ نہ پکڑ سکیں۔ عوام کی جہالت اور خواص کی بے تعلقی سے
ان کے لئے مناسب فضا پیدا نہ ہوئی۔ قومی تعلیم میں پچھلے چند سال سے

ایک نئے باب کا آغاز ہوا ہے ملک میں جو سیاسی واقعات رونما ہوئے ان کا ایک ردعمل یہ بھی تھا کہ تعلیم کو گورنمنٹ کے اثر واقتدار سے نکالنے کی کوشش کی گئی اور اس کو اس طرح ڈھالنے کی خواہش پیدا ہوئی کہ اس کو ملک کی ضروریات اور مطالبات سے ہم آہنگ بنا دیا جائے۔ تاکہ وہ حال کی بہتری اور مستقبل کی امیدوں کی ضامن ہو سکے۔

خیال بہت اچھا تھا اور نصب العین صحیح۔ لیکن اس کو عمل میں لانے میں دشواریاں اور ناکامیاں ہوئیں۔ مقصد تو یہ تھا کہ تعلیم کو گورنمنٹ کے رسوخ سے علیحدہ کر کے اس میں ایک نئی روح پھونکی جائے لیکن اس میں کامیابی صرف اس قدر ہوئی کہ قومی مدرسوں میں گورنمنٹ سے امداد لینا بند کر دیا گیا اور گورنمنٹ کی یونیورسٹیاں ان کی ممتحن نہ رہیں۔ یہ کامیابی ایک منفی کامیابی تھی یعنی اس سے بعض ایسی رکاوٹیں دور ہو گئیں جو اصلاح تعلیم میں سدِّ راہ تھیں۔ لیکن اس سے کوئی دوررس نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اگر سرکاری امداد بند کر دینے سے تعلیم کے اخراجات بھی باقی نہ رہتے تو ہمیں بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتیں لیکن دراصل نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا بلکہ بہت سی درسگاہیں جو وقتی جوش اور ابھار کیوجہ

قائم ہوئی تھیں۔ تھوڑی سی گمنامی کی زندگی کے بعد ختم ہو گئیں، جن لوگوں کا ایثار اور دعوی زمانے کی ہوا دیکھ کر اور شہرت کی خواہش سے مجبور ہو کر پیدا ہوئے تھے۔ انہوں سے بہت جلد ان درسگاہوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لہذا اس مستعجل تعلیمی تجربہ کا انجام وہی ہوا۔ جو اکثر ہندوستانی تجربوں کا ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک دور کی یونیورسٹی سے جو محض ایک امتحانی مشین ہو قطع تعلق کر لینا مفید ہو سکتا ہے کیونکہ اب امتحانوں کو معقول اور قرین ضرورت بنانا زیادہ آسانی کے ساتھ ممکن ہے لیکن صرف ممکن ہی ہے لازمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے اپنے فاضلانہ مضمون "مسلمانوں کی تعلیمی جامعہ ملیہ" میں جو اصول اور طریقے امتحان کے یا عام نصاب اور تعلیم کے لئے بتائے ہیں۔ ان سے قومی درس گاہیں بھی اتنی ہی دور ہیں۔ جتنی سرکاری درس گاہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محض ایک سرکاری یونیورسٹی سے علیحدگی سے نصاب یا طریقۂ تعلیم بہتر نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے ماہرین فن کی کاوش اور سنجیدہ مطالعہ اور تجربہ کی ضرورت ہے اور یہ چیزیں بالعموم قومی درس گاہوں میں بھی مفقود ہیں۔ اس لئے قومی تعلیم کے ضمن میں جو کچھ نتائج پچھلے چند سالوں کے مختصر تجربے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ اپنی

عملی صورت میں ملک کے لئے کوئی قابل تقلید نظام پیش نہیں کر سکتے چنانچہ وہ لوگ جو تعصب و تنگ نظری یا محض کج دماغی سے قومی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو عارفانہ انداز سے سر ہلانے کا موقع ملتا ہے ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کوشش یقیناً نیک نیتی پر مبنی ہے۔ لیکن ہمیں اس کا انجام پہلے ہی سے معلوم ہے وہ ایک نصب العین کو صورت حال کے ساتھ خلط مبحث کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ سب سے زیادہ ضروری بات تو یہ ہے کہ رخ کس طرف ہے؟ ہم کدھر جاتے ہیں؟ یہ بات کہ ہم منزل پر تقریباً پہنچ چکے ہیں یا اس سے بہت دور ہیں مقابلتہً غیر اہم ہے۔

قومی تعلیم پر اس تنقید کے ضمن میں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ہندوستان میں چند قومی درس گاہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایسی ہیں جنہوں نے اپنے میں بعض ممتاز اور امید افزا خصوصیات پیدا کر لی ہیں۔ کسی مقتدر تعلیمی جماعت کو چاہئے کہ چند معقول اشخاص کا ایک وفد ان تعلیم گاہوں کے مطالعہ اور معائنہ کے لئے بھیجے تاکہ ان کی خوبیوں اور قابل تقلید خصوصیات سے پبلک کو اور ان کی قابل اصلاح باتوں سے خود ان کے کارکنوں کو آگاہی ہو۔

———— ❊ ————

جنگ کے نقصانات اور فوائد

بعض ارباب دانش کا قول ہے کہ تمام مصائبِ جسمانی اور آلامِ روحانی کے اجتماع کا نام جنگ ہے یعنی کوئی آفت اور کوئی مصیبت باقی نہیں جو لڑائی میں نہیں مجتمع۔ یوں تو ہر مصیبت اس کی ایک بلا ہے مگر موت سب سے زیادہ سخت بلا ہے کہ خدا کی پناہ۔ اس کا حال سنئے :۔

دنیا جو ایک بزمِ رواں ہے رزم اس کی وہ سخت دشمنِ جاں ہے، کہ ایک پلک جھپکانے میں لاکھوں کو فنا کر دیتی ہے، جیسے چھڑکاؤ کا پانی ادھر گرا، ادھر اڑا، پھر اکٹھا نہ ہوا۔ ایسا ہی چھڑکاؤ آدمیوں کا میدانِ جنگ میں ہوتا ہے کہ ادھر گرا، ادھر مرا۔ کل کی بات تھی کہ ہزاروں آدمی جو ہماری طرح رات دن بسر کرتے تھے۔ آج انہوں نے اپنی کہی نہ اور کی سنی، نہ کچھ تیاری کی۔ سارے ارمان اور تمنائیں دم کے ساتھ لے کر اس بزم سے سوئے عدم روانہ ہوئے۔ جن ملکوں میں لڑائیاں ٹھنتی ہیں ان کا حال دیکھئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی بھی قیامت کی چھوٹی بہن ہے کوئی گھر ایسا نہیں ہوتا جس میں ماتم و غم کے سوا کوئی اور شغل ہو

بوڑھے ماں باپ اپنی جوان اولاد کے غم کو پال رہے ہیں۔ بیوائیں اپنے شوہر کے داغ کو سینے سے لگائے بیٹھی ہیں۔ ننھے ننھے معصوم بچوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی ہیں۔ بہنیں بھائیوں کو چلاّ چلاّ کر چیخ رہی ہیں۔ کہ ہائے بھائی تم ہم کو چھوڑ کر کہاں گئے؟ کب صورت دکھاؤ گے اور ہم کو بلاؤ گے؟ تمہاری صورت کو ہم ترستے ہیں:-

کسی کا لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر
کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پر کوئی ہے خستۂ جگر
غرض کہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر

امن میں اکثر عمر رسیدہ اور ضعیف و ناتواں آدمیوں کو موت آتی ہے جو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکتے ہیں۔ مگر نبرد میں ان جوان مردوں کو موت آتی ہے جنہوں نے ابھی دنیا کا کچھ نہیں دیکھا۔ بقول ایک مورخ کے کہ امن کے زمانے میں اولاد اپنے بزرگوں کو زمین میں دفن کرتی ہے اور سچے دل سے ماتم کرتی ہے مگر ان کے تعلقات خود اپنی اولاد کے ساتھ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اس غم کو جلد بھول جاتی ہے اور ان کے دل پر سخت صدمہ نہیں ہوتا۔ مگر جنگ کے ہنگامے میں اولاد کا ماتم ماں باپ کو کرنا پڑتا ہے اور وہ ان کی جان کے ساتھ ہی جاتا ہے بعض جوانمردوں کا یہ قول ہے کہ میدان کارزار ہی میں مرد شہید ہوا کرتے ہیں۔ چارپائی پر بیمار ہو کر مرنا نامردوں کا کام ہے۔ مگر میدان جنگ کی موت بھی وہ موت ہے

کہ معاذاللہ! جس کے خیال ہی سے روح کانپتی ہے۔ تنہا زخمی پڑے ہیں نہ کوئی عزیز پاس ہے نہ کوئی دوست ساتھ ہے جو مرنے پر آنکھیں بند کر دے۔ گور گڑھے میں ڈال دے، کفن ہے تو وہی خون سے سنی ہوئی پوشاک، قبر ہے تو وہی خاک جو اڑ کر بدن پر پڑی ہے پیاس لگے تو پینے کے لئے اپنے لہو کے گھونٹوں کے سوا کچھ ملتا نہیں، اور اگر بھوک لگے تو سوائے گولیاں کھانے کے اور کوئی کھانا نہیں۔ نیم جان تڑپ رہے ہیں۔ یا اپنے خون کی پیوستگی کے سبب سے ایسے اس میں وابستہ ہیں، کہ ہل نہیں سکتے۔

میدان جنگ کو بھی دیکھ کر عجب عبرت پہ عبرت ہوتی ہے کہ کہیں سر کٹے پڑے ہیں، کہیں دھڑ بن سر کے پڑے ہیں ادھر گھوڑا پڑا دم توڑ رہا ہے ادھر سوار سسک رہا ہے۔ ہزاروں زخمی خون میں لت پت لوٹ رہے ہیں۔ کوئی یار و مددگار نہیں۔ کھلے ہوئے زخموں پر ہوا کیا لگتی ہے مرے پر سو درّے لگتے ہیں۔ گھوڑے روندر ہے ہیں، دشمن ان پر اپنے غصّے جوب نکال رہے ہیں۔ قلقاریاں مار مار کر بسملوں کو تلوار اور نیزے برچھیاں مارتے ہیں۔ اگر دشمنوں کو زخمیوں پر رحم آیا تو اور رنج و تکلیف کی مدّت دراز ہوئی۔ جب سواری پر پڑ کر اسپتال گئے وہ کچھ شکنجے سے کم نہیں ہوتی۔ جب دارالشفا میں گئے وہ دار الفنا سے بھی

بڑھ کر ہوتا ہے وہاں کب علاج کی طرح علاج ہوتا ہے اب یہاں پر چارپائی ہے اور وطن سے کوسوں دور عالم تنہائی ہے سوائے یاس کوئی آس پاس نہیں۔ کہ تسلّی وتشفی دے، وقت پر کھانے پینے کی خبر لے۔ یہ جنگ فقط مردہ ہی نہیں بناتی بلکہ زندوں کو بھی ایسا ستاتی ہے کہ وہ مرنے کی تمنّا کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ جو مر گئے وہ اچھے پردہ ڈھک گیا۔

اب ہم تم کو سپاہیوں کا حال سناتے ہیں کہ اوّل سے آخر تک ان پر کیا گذرتی ہے سپاہی کا پیشہ ایسا ہے کہ عمر بھر میں اس کو بہت تھوڑے دنوں میدان کارزار میں ہتھیار چلانے پڑتے ہیں۔ زیادہ دنوں تک اس کا فقط یہ کام رہتا ہے کہ کچھ دیر پہرہ چوکی دے اور کچھ قواعد سیکھنے میں صرف کرے یوں تو جیبن کرنا ہے مگر بُری اس پر اس وقت بنتی ہے۔ کہ غیر ملکوں کے فتح کرنے کے لئے جاتا ہے اوّل پر خطر راہوں میں سفر، دوم ہر وقت دشمن کی کمین کا خوف، سوم آب و ہوا کا حال نامعلوم، کہ بری ہے یا اچھی۔ گو اس کو گرمی سردی کی سختی اٹھانے کی اور بھوک پیاس کی تکلیف برداشت کرنے کی عادت ہوتی ہے مگر بعض اوقات یہ شدائد ہلاکت پر نوبت پہنچا دیتی ہیں۔ تلواروں سے جانوں کا زیاں اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ آب و ہوا کی خرابی سے اور وبا پھیلنے کے باعث

نقصان ہو جاتا ہے یہ تکلیفیں سفر کو سفر ہی کی صورت کا نہیں بناتیں
بلکہ سفر آخرت بنا دیتی ہیں۔

یہ تو سفر جنگ کی کیفیت ہے اب ملکوں کا حال جن میں لڑائیاں
ہوتی ہیں اور ان شہروں کا حال جو حملوں سے یا یونہی فتح کئے جاتے ہیں
سنئے۔ جو شہر حملوں سے تسخیر ہوتا ہے اس پر جو بلائیں انسان کی طرف
نازل ہوتی ہیں، نہ وہ جنگل کے درندوں سے، نہ زمین کے زلزلوں سے،
نہ آسمان کے ابر طوفاں بار سے، نہ قحط باراں سے انسان پر نازل ہو سکتی
ہیں۔ آئین جنگ کے مطابق پہلے زمانے میں قتل عام ہوتا تھا عورتیں
بچے لونڈی غلام بنا کے بازاروں میں بھیڑ بکری مرغی سے سستے بیچے جاتے
تھے۔ مکانات بلند و عمارات عالیشان جلا پھونک کر برابر کی جاتی تھیں
ان پر گدھے کا ہل پھرایا جاتا تھا گو اس زمانے میں پہلے زمانے کی سی سختیاں
نہیں ہیں مگر پھر بھی مومن کا شعر ان پر صادق آتا ہے :-

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

جو اہل جاہ سپاہ لے کر دشمن سے برابری کا دعویٰ کر کے لڑنے
جاتے ہیں وہ گرفتار ہو کر پابہ زنجیر ہوتے ہیں اور ہزار رسوائی کے ساتھ
دارالفنا کو بھیجے جاتے ہیں جو صاحب ثروت اپنے محلوں ہی میں بیٹھے رہتے
ہیں وہ محبس بھیجے جاتے ہیں کہ وہاں چکی پیسیں۔ رسیاں بٹیں، چرس

کھینچیں، سڑکیں کوٹیں، غرض سارے جوانوں کے کام کریں دولتمندوں سے سارا مال و اسباب چھین لیا جاتا ہے اور کاسۂ گدائی ہاتھ میں دیا جاتا ہے یوں لاکھوں کے گھر خاک میں ملتے ہیں ہزاروں مرد جیلخانوں کی ہوا کھاتے ہیں۔ ان کے بچے، ان کی عورتیں گھر سے ویران ہو کر بیابان کی راہ لیتی ہیں یا فاقے مرتی ہیں یا گدائی کرتی ہیں ان کی پردہ دری ہوتی ہے بچے ان کی گود میں گٹھڑی سر پر ہوتی ہے دو دو قدم چلتی ہیں، اور گر گر پڑتی ہیں۔ چادر تو کیا، خاک بھی سر پر ڈالنے کو نہیں ملتی۔ پردۂ ناموس چاک ہونے پر بھی خوراک پوشاک نہیں میسّر ہوتی۔ یہ دل گرفتہ جگر چاک فریاد دردناک ہر کس و ناکس سے کرتی ہیں اور دربدر خاک بسر پھرتی ہیں۔ مگر کوئی نہیں پوچھتا کہ کون ہو۔ شہر میں ہر گلی کوچہ ایک ہُو کا مقام ہوتا ہے۔ گل گلستاں کی شکل عجیب پریشان ہوتی ہے جدھر دیکھو خزاں نظر پڑتی ہے۔ درخت باثمر، بے ثمر ہوتے ہیں۔ چمن و گلزار میں خاک اڑتی ہے۔ کنوئیں، حوض، تالاب سب بے آب۔ معابد میں گدھے لوٹتے ہیں یا کتّے بھونکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مصیبتوں اور آفتوں کی وہ چوپائی ہوا چلتی ہے کہ سب چیزوں کی خاک اڑا دیتی ہے سلامتی کا جہاز ایسا ڈبوتی ہے کہ کہیں اس کا پتہ نہیں لگتا۔

یہ حال تو ان شہروں کا ہے جو حملوں سے فتح ہوئے اب ان

شہروں کا حال سنیئے جو یونہی دشمنوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں۔ وہاں بھی کوئی چیز سلامتی سے نہیں رہتی۔ جان و مال اور ننگ و ناموس کے قائم رہنے کا کوئی قانون اور اصول نہیں ہوتا فقط دشمنوں کے کرم اور تلوار کے رحم پر سلامتی موقوف ہوتی ہے قسمت پر سارے معاملے چھوڑے جاتے ہیں جو اپنی دھندلی جھلک، دشمن کی خونریزی کی خصلت اور اس کے انتقام کے حلم میں اور حرص کی قدرت میں دکھاتی ہے۔

یہ تو شہروں کا حال ہوا۔ اب ان ملکوں کا ذکر سنیئے جن میں لڑائی ہوتی ہے۔ دیہات کی زراعت جو خدا کی عنایت اور انسان کی محنت سے ہری بھری کھڑی ہوتی ہے سپاہ کے روندنے سے ایسی پامال ہوتی ہے کہ وہ کھیتی ہی نہیں رہتی اس زراعت کی بربادی سے قحط آنکھیں دکھاتا ہے اور تلوار سے جو بچ رہے تھے ان کو بھوکا مار کے جان سے سیر کرتا ہے بعض دیہات میں آگ بھی لگائی جاتی ہے وہاں کے بچے ماؤں کو لئے اور مائیں بچوں کو لئے پھرتی ہیں۔ ان آفتوں سے دہقانوں کی جان پر بن جاتی ہے اب ہزاروں مردوں کی لاشیں پڑی سڑتی ہیں جس سے ہوا میں عفونت اور سمیت پیدا ہوتی ہے اس سے وبا پاؤں پھیلاتی ہے۔ غرض جنگ کے ساتھ قحط اور وبا بھی ایسے

خادم ہیں کہ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

زراعت کی یہ کیفیت ہوئی اب تجارت کا حال سنیئے۔ جنگ اور تجارت میں آگ اور پھوس کا بیر ہے جہاں ہنگامۂ جنگ گرم ہوا، تجارت کا بازار ٹھنڈا پڑا۔ راستے رہزنوں کے خوف سے بے خوف و خطر ہوتے نہیں۔ اسباب تجارت ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا نہیں۔ جان و مال کی حفاظت ہوتی نہیں۔ کوئی اسباب مول لیتا نہیں۔

زراعت اور تجارت کے بعد صنعت و دستکاری کو دیکھیئے مصنوعات کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ کاریگروں کو اتنا مقدور نہیں ہوتا کہ اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو جب بیچیں کہ امن ہو کر بھاؤ بڑھے اس لئے وہ فاقوں مرنے لگتے ہیں۔ چہرے زرد رنگ ہو جاتے ہیں ہوش و حواس درست نہیں رہتے۔ غرض جس کسی کو دنیا میں جہنم کی مصیبتوں کا سمجھنا منظور ہو تو وہ لڑائیوں کی مصیبتوں کو دیکھ لے۔

اب سوال یہ ہے کہ لڑائیوں میں ایسی کیا منفعتیں ہیں کہ باوجود ان مصائب شدید کے وہ ہوئے بغیر نہیں رہتیں اور دنیا میں کیوں نہیں ایسا زمانہ آتا کہ ہنگامۂ نبرد برپا نہ ہو اس کا سبب یہ ہے۔ کہ انتظام گیتی بغیر جنگ و پیکار کے نہیں ہو سکتا۔ ایک انگریز مدبّر کا مقولہ ہے :-

PEACE IS A DREAM AND NOT EVEN A BEAUTIFUL DREAM, AND WAR IS THE WORLD-ORDER OF GOD.

"یعنی امن ایک خواب ہے وہ بھی سہانا نہیں اور جنگ خدا کا ایک اٹل قانون ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا ایک جنگ گاہ ہے۔ پرندوں، درندوں، گزندوں اور چرندوں میں دیکھئے۔ زبردست، زیردست کو کھا جاتا ہے اربعہ عناصر میں ایک دوسرے کو کھائے جاتا ہے۔ پانی آگ کو بجھاتا ہے اور آگ پانی کو بخارات میں بدل دیتی ہے اگر خوردبین سے پانی کے ایک قطرے کو دیکھیں تو اس میں بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے جانور آپس میں معرکہ آرائیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ وحشی قومیں بھی لڑائیوں کا تار کبھی ٹوٹنے نہیں دیتیں۔ یوں بھی دیکھیں تو اکثر لوگ پیشہ سپاہگری کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اور بہت سی قوموں کے نوجوان تو اس سے بہتر کسی پیشے کو نہیں جانتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی میں کچھ منفعتیں ضرور ہیں کہ انسان باوجود ان مصائب کے اسے اختیار کرتا ہے۔ ہم ان منفعتوں کی تفصیل کرتے ہیں:۔

اگر تم غور کر کے دیکھو تو یہ ایک نہایت ہی فائدہ مند اصول ہے اپنی

مدد آپ" کا اس لڑائی نے سکھایا ہے۔ انسان کا مقتضائے طبع یہ ہے کہ وہ دفع مضرت اور جلب منفعت کرتا ہے اسی کا نام ہم نے "اپنی مدد آپ" رکھا ہے۔ لڑائی انہی دو باتوں کے لئے ہوتی ہے کہ دفع مضرت ہو یا جلب منفعت۔ انسان کی جبلت میں قوائے سباعی رکھے گئے ہیں بچوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیتنے جانوروں کو ناحق مار ڈالتے ہیں۔ جانوروں کی کشتیوں اور لڑائیوں کو دیکھ کر کیسے خوش ہوتے ہیں۔ زیادہ تر انسانوں کو بھی ذکر پسند ہیں کہ وہاں کیا لاٹھی پونگے سے لڑائی ہوئی کیسی خانہ جنگی کی، کون پٹا، کس نے پیٹا، کس نے مردانگی دکھائی، منہ پر تلوار کھائی، کس نے پیٹھ دکھائی، لاٹھی پشت پر کھائی؟ اگر ان لوگوں کو مہذب اور شائستہ قوموں میں جن کو لڑائی سے نفرت ہے لاکر بٹھاؤ، تو وہ اس طرح گھبرائیں گے۔ جیسے کوئی طائر نو گرفتار قفس میں پھڑپھڑاتا ہے۔ اور تیلیاں توڑ کر باہر نکلنا چاہتا ہے لڑائی کا حامی ہونا جوانانہ طبیعت کا مقتضائے ہے مسلمانوں کا تو یہ قول ہے کہ "بہشت تلوار کے نیچے اور رزق نیزوں کے سائے تلے ہے" مگر غور کرکے دیکھو تو ساری دنیا کا عمل اسی آخری فقرے پر ہے۔

انسان کی جبلت و فطرت میں برتری کی خواہش ہے۔ جب ایک قوم یا آدمی دوسری قوم یا آدمی کی برتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ تو اس

کا فیصلہ ہمیشہ سیف قاطع ہی کرتی ہے جب اس برتری کی خواہش سے عناد فساد کھڑا ہوتا ہے تو ایک دوسرے کے سامنے تلوار لیکر کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے "تو میری برتری مان، نہیں آ لڑ لے" اگر دوسرے نے کہا مان لیا اور اپنی تلوار اس کے پاؤں پر رکھ دی۔ تو دوسرے نے کہہ دیا کہ "تم ہمارے محکوم و مغلوب ہو کر غلاموں کی طرح رہو" اور اگر یہ نہ ہوا تو لڑائی شروع ہوئی۔ جس کو تلوار نے جتا دیا وہ غالب ہو گیا دوسرا مغلوب۔ اس لئے دنیا میں نہ کوئی زمانہ ایسا ہوتا ہے، نہ ہے اور نہ شاید ہو گا۔ کہ کہیں نہ کہیں لڑائی کی آگ نہ سلگ رہی ہو۔ امن و امان بھی وہی بڑا اچھا ہوتا ہے جو لڑائی کے بعد ہوتا ہے:۔

بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

دنیا میں لڑائیوں ہی کی بدولت تہذیب و شائستگی پھیلتی ہے قاعدہ ہے کہ جو قوم حاکم ہوتی ہے وہ محکوم سے تہذیب و شائستگی، طاقت اور قدرت میں افضل ہوتی ہے مشہور ہے کہ "النّاس علیٰ دین ملوکہم" (آدمی اپنے بادشاہ کے دین پر ہوتے ہیں) محکوم قوم نے حاکم قوم کی شائستہ باتوں کو خود سیکھ لیا یا جن جوالمرد قوموں نے سپہ گری کو اختیار کیا۔ اور اپنے ہمسایہ پر حملہ آور ہو کر فتح پائی۔ تو انہوں نے اپنا یہ فن اور اپنی دوسری خوبیاں اپنی مغلوب قوموں کو سکھا دیں ملکوں کی آبادی

بڑھادی ان کی احتیاجوں کو وسعت دی اوران کے رفع کرنے کی تدبیریں بتائیں۔

مشہور مورخ پلوٹارک لکھتا ہے کہ "سکندر اعظم کی اقبالمندی کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور منوّر صفحے وہی ہیں جن میں اس کی مشرقی فتوحات کا بیان ہے"۔ اس نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ یونان میں جو چھوٹی چھوٹی جمہوری سلطنتیں آپس میں ہمیشہ جھگڑنے والی تھیں سکندر نے ان سب کو ملا کر ایک کردیا۔ اوران کے منتظموں کی عقل کو ایسا کردیا کہ وہ اچھی طرح خلائق کی خدمات انجام دینے لگے وحشی اور کاہل قوموں میں یونانی علوم وفنون اور زبان اور فلسفے کو پھیلادیا۔ جو قومیں شکار اور چرواہے پن سے اوقات بسر کرتی تھیں۔ ان کو زراعت پیشہ بنادیا۔ ایرانیوں اور تاتاریوں کو ظالمانہ حرکات اور اوباشی سے باز رکھ کر شائستگی سے زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتادیا بیاہ کی رسم کو متبرک جاننا سکھادیا۔ اس نے ستّر شہر آباد کیے ان میں یونانی قوانین وآئین کو رواج دیا۔ جو قومیں کہ باہم عداوت رکھتی تھیں ان کو ایک قوانین کا پابند کردیا مختلف نسل کے خاندانوں کو متحدّ بنادیا۔ آپسمیں صلح سے رہنا اور تجارت کرنا سکھادیا۔

زمانۂ حال میں جو سپاہیانہ تیاریوں اور لڑائیوں نے شائستگی

وتہذیب اور نیکیوں کو پھیلایا ہے اس کا جاننا تو نہایت آسان ہے زمانے کی تاریخ جہانتک ہم کو ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحشی قوموں کی حالت کا سدھرنا لڑائی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جب کسی قوم کا مزاج وحشت ناک، غضب ناک ہو اور وہ شتر بے مہار ہو اور مفلس ہو اور جسم قوی و توانا ہو، مذہب بھی لڑائی کی تائید کرتا ہو اور آتش جنگ پر تیل ڈالتا ہو، لڑائی کا ایک دیوتا بھی مقرر ہو۔ اس کے ہون ہوتے ہوں اور قربانیاں چڑھتی ہوں۔ تو کیونکر ممکن تھا کہ ایسی قومیں نچلی بیٹھی رہتیں اور زبردست ہو کر زیردستوں سے اپنا کام نہ نکالتیں۔ اب تاریخ پڑھنے والے جلدی سے مان لیں گے کہ پہلے زمانے میں جو خونریزیاں ہوئیں ان میں مذہب اور خدا کا نام بھی داخل تھا گو بہت دیرپا نہیں تھیں۔ مگر وہ انسان کی تعلیم و تادیب و تربیت کی ایک تمہید تھیں۔

لڑائی کیا کرتی ہے؟ قوموں کے ہوش و حواس کی تعلیم، ارادے اور ہمت کے کاموں کے لئے آمادہ، جسمانی قوتوں کی تکمیل وہ نازک وقتوں میں انسانوں کو آپس میں ملا کر ایسی مڈبھیڑ کراتی ہے کہ آدمی کا اندازہ آدمی کرنے لگتا ہے وہ انسان کی نیکیوں میں یہ امر داخل کرتی ہے کہ جس سے محبت ہو اس کو دغا اور رفض نہیں کرنی چاہیے۔ وہ

قوموں کے پیمانوں کو صفائی سے پُر کرتی ہے اور دُرد سے خالی۔ وہ پیش بینی اور دور اندیشی پیدا کرتی ہے وہ آدم زاد کے اجتماع کو ملا جلا کر اس کے سب افراد کو اپنی جگہ پر قائم کر دیتی ہے جس سے مضبوط قومیں بن جاتی ہیں۔ بہادر اور جوانمرد منتخب روزگار ہوتے ہیں ان کے اخلاق کی آزمائش ان لڑائیوں سے ہوتی ہے ان میں آپس میں یہ رشک ہوتا تھا کہ ہر ایک اپنا حسن اخلاق دوسرے سے زیادہ دکھائے جس سے خلائق آسائش و آرام پائے وہ تواضع و مدارات دشمنوں سے کرے۔ کہ جس سے اس کی شان و شکوہ کی نمود ہو اور شجاعت میں سخاوت کا ظہور ہو پس ایسے شجاعوں کے حسن اخلاق کی کسوٹی یہ لڑائیاں ہیں۔

زمانہ حال میں بعض صحیح العقل یہ خیال کرتے ہیں کہ لڑائی کیا ہے ایک دیوانگی کی وبا ہے جو ہیضے اور بخار کی طرح کبھی یہاں اور کبھی وہاں پھیلتی ہے یہ وبائیں تو آدمیوں کے رودوں اور آنتوں پر اثر کرتی ہیں۔ اور لڑائی کی وبا دماغوں میں خلل ڈالتی ہے غرض وہ امن کے حامی اور لڑائی کے دشمن ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کیا محبت سے وہ کام نہیں نکل سکتا جو عداوت سے نکلتا ہے؟ کیا لڑائی کی نسبت محبت سے زیادہ نتیجہ نہیں نکلے گا؟ کیا امن میں وہ خوبیاں پیدا نہیں ہوتیں جو لڑائی کا نتیجہ ہیں؟ غرض اس زمانے میں صلح پسند عاقل ایسی باتیں بہت بناتے

ہیں۔ مگر امن کی خیالی باتیں بنائی اور ہیں اور ان پر عمل کرنا اور ہے۔ یورپ کی طویل لڑائیوں کے سلسلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صلح پسند محض باتیں ہی بناتے ہیں قوانین قدرت امن قائم ہونے کے مانع ہیں۔ فرض کرو کہ ایک قوم ایسی نیک ہو جائے کہ وہ امن سے رہنے لگے، اور لڑائی کی خواہاں نہ ہو اب غیر قوم اس پر حملہ کرے تو کیا وہ چپ چاپ اپنا سر کٹوا دے گی؟ اپنی عورتوں اور معصوم بچوں کو گرفتار کرا کے لونڈی غلام بنوا دے گی؟ یہ وہ ہرگز نہیں کرے گی۔ ضرور اپنی حمایت کریگی۔

تم جو یہ کہتے ہو کہ بعض مہذّب ممالک میں ایسا امن و امان ہوتا ہے، کہ لوگ نہایت اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کوئی سونا اچھالتا چلا جائے تو کسی کی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی مجال نہیں۔ سارے گھر چوپٹ بے قفل و زنجیر کھلے پڑے رہتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں چراتا۔ سڑکوں پہ رات دن لاکھوں کروڑوں کا مال آتا جاتا ہے کچھ خوف و خطر نہیں اس سے تم انسانوں کے اخلاق نیک کا تخمینہ کرتے ہو۔ تو یہ غلط ہے یہ نیکی طبعی نیکی نہیں ہے بلکہ یہ بندوق، توپ، تلوار، جیل اور پھانسی کا ڈر ہے جو چوروں اور ڈاکوؤں کو لوٹ مار سے، اور امن و امان میں خلل اندازی سے روکے ہوئے ہے ہاں اگر سب آدمی نیک ہو جائیں اور ہر شخص دوسرے کی ذلّت کو اپنی ذلّت سمجھنے لگے تو لڑائی کا موقوف ہونا ممکن ہے مگر یہ کام

کسی ایک قوم سے نہیں ہو سکتا اس میں سب قوموں کو متحد ہونا پڑیگا۔ اور ایسا ہونا قطعاً ناممکن ہے۔

اگر دنیا کے امن و امان کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کیا کچھ اس کے حصول کے لئے خرچ ہو رہا ہے۔ اسلحہ خانے، توپوں کے ڈھلنے اور بندوقوں کے بننے کے کارخانے، قلعے، خندقیں، غرض ہزاروں چیزیں اس کے لئے تیار رکھنی پڑتی ہیں لاکھوں سپاہیوں سے قواعد میں آدمیوں کے مارنے کی جھوٹی مشق کرانی پڑتی ہے۔ قوموں کی شرافت یہی ہے کہ وہ اوروں کے ملکوں کی ہوس نہ کریں۔ ہاں اگر کوئی اور حملہ آور ہو تو اس سے اپنے بچانے کی تدبیر کریں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ اس حالت میں چپکے بیٹھے رہیں۔ اگر وہ نیک بن جائیں تو بد لوگ ان کو تباہ و خاک سیاہ بنا دیں۔ یہ فقط خیالی بات ہے کہ غیروں کو ان کی نیکی کا ادب اور لحاظ ایسا ہو، کہ ان پر ہاتھ نہ اٹھائیں اور نہ ستائیں۔ غرض یہ تین حالتیں ہیں :۔

اوّل خود حملہ آور ہونا، دوم کوئی حملہ آور ہو تو اسے روکنا، تیسرے کوئی حملہ کرے تو خاموشی اختیار کر لینا یعنی اپنے بچاؤ کی تدبیر نہ کرنا ان میں سے پہلی حالت بلاشبہ مذموم ہے اور تیسری ناممکن العمل، البتہ دوسری معتدل ہے، وخیر الامور اوسا طہا۔

اب تم نے لڑائی کی مضرتیں اور منفعتیں اور امن کی صورتیں دیکھ لیں۔

ان سے تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ امن لڑائی سے اچھا ہے مگر غور کر کے دیکھو تو امن بھی درحقیقت لڑائی ہی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا۔ کہ جس میں لڑائی نہ ہو گو انسانوں کے اخلاق میں اب تغیر آرہا ہے اور ملک گیری کی ہوس کم ہو رہی ہے لوگ نیچر کے فتح کرنے، تجارت کے بڑھانے اور اس قسم کے دیگر مفید کاموں کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں۔ تاہم لڑائی دنیا سے بالکل مفقود نہیں ہو سکتی۔

———(۴۰)———

قومی زبان

ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط، اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کے بقا و فنا میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجیے رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی اس کی آنے والی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا، اور وہ نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لے کر اٹھیں گی جن جن لوگوں نے قومیتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے ان سب نے یہ ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے زار روس کی حکومت نے اپنے امپیریلزم کی بنیاد مستحکم کرنے کے لیے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ سب قومیں روسی بن جائیں اور اس کی مملکت میں کوئی قوم ایسی نہ رہ جائے جو اپنی زبان بولنے والی اور اپنے مذہب کی اتباع کرنے والی اور اپنے رسوم پر چلنے والی ہو اصطلاح میں اس کو (RUSSIFICATION) یعنی "روسی بنانے" کی پالیسی

کہا جاتا ہے بعد میں اسی پالیسی کی پیروی اشتراکی جماعت نے بھی کی۔ لینن نے انقلاب کے بعد ہی مشرقی قوموں کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ان کے رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل دیا اور اب تازہ اطلاع ہے کہ روس کی ۲۹ قوموں کا رسم الخط لاطینی کے بجائے روسی کر دیا گیا ہے تاکہ اس علیحدگی کے احساس کو بالکل مٹا دیا جائے جو ان کے روسی بن جانے میں مزاحم ہوتا ہے۔ ازبک، ترکمان، تاجیک، کرغیز وغیرہ اور داغستانی مسلمان جن کو عربی رسم الخط نے اسلامی روایات سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اس ضرب کے اثرات کو ابھی سے محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی ایک چوتھائی صدی بھی اس انقلاب پر نہیں گزری ہے اور وہ دیکھتے ہیں، کہ ان کی قومیت تحلیل ہو کر اشتراکی سوسائٹی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی ہے وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے کے لئے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے کہ عربی زبان اور رسم الخط کو مٹا دیا جائے۔ اسی پالیسی کا تختۂ مشق ہندوستان میں ہم کو بنایا جا رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال کے بقول ہندوستان میں نیشنلسٹ جماعت کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ "یہاں ایک متحدہ قوم پیدا ہو"۔ اس غرض کے لئے زبان کی وحدت ناگزیر ہے۔ زبانیں الگ ہوں گی تو الگ قومیں بھی رہیں گی۔

الگ قوموں کو فنا کر کے ایک قوم میں تبدیل کرنا ہو تو الگ زبانوں کو مٹا کر دولت تنظیم اور حکومت کی طاقت سے ایک زبان تمام ملک میں پھیلانی ہی پڑے گی۔ یہاں تک تو بات کھلم کھلا ہے۔ اس کے بعد کام تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ باتیں دکھانے کے لئے ہیں اور کچھ کرنے کے لئے۔ دکھانے کیلئے تو یہ ہے کہ "قومی زبان" "ہندوستانی" ہے جس کا اطلاق اردو اور ہندی دونوں پر ہوتا ہے۔ فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط ہیں۔ اور دونوں کو نشو ونما کا پورا موقع ملنا چاہیے لیکن فی الواقع کیا کیا جا رہا ہے؟ اس کے لئے ذیل کی تفصیل ملاحظہ ہو :-

۱۔ فارسی اور عربی کے وہ عام فہم الفاظ بھی جو "ہندوستانی" کے مشترک سرمایہ میں مدتوں سے داخل ہو چکے ہیں جن کو ہر ہندو اور مسلمان بولتا اور سمجھتا ہے قصداً ترک کئے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ٹھیٹھ سنسکرت اصل کے یا بالکل نامانوس ہندی زبان کے الفاظ پھیلائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر :-

سمے	بجائے	وقت	شکشا	بجائے	تعلیم
منش یا پرش	"	آدمی	جبت پرانت	"	صوبجات متحدہ
سٹا	"	مقدمہ	اوشک	"	ضروری
مترتا	"	دوستی	بھارت ورش	"	ہندوستان

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ اس فہرست کو بہت زیادہ طویل کیا جا سکتا ہے مگر اتنی ہی مثالیں یہ اندازہ کر لینے کے لئے کافی ہیں کہ یہاں "ہندوستانی" کے پردے میں دراصل ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہندوستانی قوم" کے بدلے دراصل "ہندو قوم" میں اس ملک کی قوموں کو جذب کرنا مقصود ہے۔ ہندوستانی زبان وادب سے ہمارے حصّہ کو اس طرح نکال پھینکنے کی کوشش کی جارہی ہے جس طرح کوئی قوم کسی ظالم قوم کی حکومت سے آزاد ہونے کے بعد جوشِ انتقام میں اس کے باقی ماندہ آثار کو مٹایا کرتی ہے۔

۲:۔ متحدہ قومیت کے علمبردار جو زبان اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کر رہے ہیں اس کے نمونے ملاحظہ ہوں۔ گاندھی جی بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں فرماتے ہیں :۔

"اس سبھا پتیتوں مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں، تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں ایک میرا ساہتیہ کا رنہ ہونا اور اس کے لئے کم سے کم دولیش کا کارن ہوتا ہے تنفا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریںگے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائینگے، یدی ہم منتری نگر سے لے کر کنیا کماری

تک اور کراچی سے لے کر ڈیرہ وگڈھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری ایناوی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی ہیچھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں"۔

بابو موہن لال سکسینہ صدر صوبہ کانگرس کمیٹی کے خیر مقدم میں پیلی بھیت کی کانگرس کمیٹی حسب ذیل اعلان شائع کرتی ہے :۔

"ہمارے صوبہ کے پرسد نیتا شری یت موہن لال جی سکسینہ ایم ایل اے جو پرانتی کانگرس کمیٹی کے پردھان ہیں ۲۷ رمئی ۱۹۳۸ء کو پرات کال ۵ بجے کی گاڑی سے پدھار رہے ہیں جنتا کو چاہیے کہ اس سنہرے اوسر سے لابھ اٹھانے کے لئے لوب دلیش کے پرت اپنے سچے کرتو کو جاننے کے لئے ۲۶ رتاریخ کی شام کو ادھکا دھک سنکھیا میں راشٹر ساکاؤں کے ساتھ میں آجانا چاہیے اور ۲۷ رمئی ۳۸ء کی صبح کو ۵ بجے ان کے سواگت کے جلوس کی رونق بڑھائیے ۔ پروگرام ۲۷ رمئی کا

پرت کال ۷ بجے سے ۹ بجے تک جلوس

" ۹ " ۱۰ " جل پان

مدھنان " " ۲ " بھوجن وشرام

۲ " ۵ " کاریہ کارتاؤں کی بیٹھک۔

نوید ک

دستخط پریزیڈنٹ دستخط ادپ منتری

شہر منڈل کانگرس کمیٹی، پیلی بھیت"

اس حمام میں سوشلسٹ ہندو بھی بے تکلف کپڑے اتار دیتے ہیں۔

یہ محض چند نمونے ہیں ورنہ یہ زبان جس طرح ذمہ دار لیڈروں اور ذمہ دار قومی مجلسوں سے لے کر اخبارات، رسائل اور سنیماؤں تک ہر آلہ نشر و اشاعت کے ذریعہ پھیلائی جا رہی ہے اس کا مشاہدہ ہر آنکھوں والا کر رہا ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت کی باگیں ان لوگوں کے ہاتھ میں پوری طرح آ گئیں تو یہ کیسی "ہندوستانی" زبان بنائیں گے۔

۳:۔ اگرچہ ابھی سیاسی اقتدار پوری طرح ان کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے لیکن جس قدر بھی اقتدار انہیں مل چکا ہے اس کو انہوں نے عملاً اس کام میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اقتدار تو حاصل کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم مشترک وطنی اغراض کے لئے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر اقتدار کو استعمال کیا جاتا ہے اس کام میں کہ وطن کی ایک جماعت پر دوسری جماعت کی زبان کو بزور مسلط کر دیا جائے۔ صوبۂ بہار میں ۳۵ ہزار سے زیادہ مسلمان ہندی مدرسوں (پاٹھ شالاؤں) میں جانے پر

مجبور ہیں کہ ان کے لئے تعلیم کا کوئی دوسرا انتظام ہی نہیں پٹنہ دویژن
میں ۷۵ فیصدی، چھوٹا ناگپور ڈویژن میں ۸۰ فیصدی، بھاگل پور
ڈویژن میں ۷۱ فیصدی اور ترہت ڈویژن میں ۵۵ فیصدی مسلمان
طلبہ ہندی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں مجموعی طور پر جو مسلمان بچے
صرف ایک صوبہ میں ہندی اللسان بنائے جارہے ہیں ان کی تعداد ۲۵
ہزار کے قریب ہے یعنی کل مسلمان طلبہ کا ۷۵ فیصدی حصہ۔ اور
ان کو پڑھایا کیا جاتا ہے؟ متعدد کتب نصاب میں یہ چیز آپ کو ملے گی۔
کہ "نبی" کے معنی "رام اوتار" کے ہیں۔ ایک چاول سے اندازہ کر لیجئے کہ پوری
دیگ میں کیا ہے۔

پروفیسر عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ "اردو" کی ایک
قریبی اشاعت میں اپنے ایک دوست کا خط نقل کیا ہے جو یوپی میں ڈپٹی
کلکٹر ہیں وہ لکھتے ہیں۔ کہ اس سال مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے
مدرسوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان میں عموماً میں نے دیکھا کہ اردو پڑھانے
والے مدرسوں کی بہت کمی ہے مسلمان بچوں کو عموماً ہندی پڑھنی پڑتی
ہے اور وہاں زبان کے واسطے سے ان پر ہندویت کا گہرا رنگ چڑھ رہا ہے
مثلاً ایک ابتدائی مدرسے میں بچے کو پکاریئے تو وہ "حاضر جناب" کہنے کے
بجائے "السیحقت شریمان" کہے گا۔ یہ اس صوبہ کا حال ہے جو صدیوں سے

ہماری قومی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے ان سب سے زیادہ بدتر حالت صوبہ متوسّط کی ہے ضلع بیتول کی دسٹرکٹ کونسل نے پورے ضلع میں جبری تعلیم نافذ کرنے کی جو سکیم بنائی ہے اس میں تعلیم کی زبان لازمی ہندی رکھی گئی ہے اور حکومت نے اس شرط کے ساتھ اس کو مالی امداد دی ہے کہ تمام تعلیم ہندی میں ہو اس جدید اسکیم کے ماتحت ۱۰۰ ہندی اسکول قائم کیے گئے اور پورے ضلع میں اردو کا ایک اسکول تھا۔ سو وہ بھی بند کر دیا گیا۔ یہ صرف ابتدا ہے ودیا مندر اسکیم جب نافذ ہو گی تو آپ دیکھیں گے کہ دیہات کی مسلمان آبادی کو ۲۵ سال کے اندر قریب قریب کلیتہً ہندی اللسان بنا دیا جائیگا۔ ابتدائی تعلیم تمامتر لوکل بورڈوں کے قبضہ میں ہے اور وہاں حال یہ ہے کہ ۱۵ سو انتخابی حلقوں سے نصف درجن مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکے۔ یہ عصبیت جہاں کام کر رہی ہو وہاں کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ پبلک کے خزانہ سے کہیں اُردو ودیا مندر (بیت العلم) بھی قائم کیا جائیگا۔ لوکل بورڈوں میں تو پھر بھی محدود نظر اور لپست ذہنیت کے لوگ جاتے ہیں۔ صوبہ کی حکومت جن اعلی التعلیم یافتہ اور ذمہ دار کانگرسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے خود ہی کانگرس کے اس زبانی دعوی کو جھوٹا اور منافقانہ دعوی ثابت کر دیا ہے۔ ہندوستانی زبان اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں کے ساتھ تسلیم شدہ ہے۔

سی پی اسمبلی میں خود صدر مجلس کے زیر ہدایت رولز کمیٹی نے جو قواعد بنائے ہیں ان میں ۸ لاکھ مسلمانوں کی زبان کا نام تسلیم شدہ زبانوں کی فہرست میں کہیں نظر نہیں آتا۔ عبدالرحمٰن خاں صاحب ایم ایل اے نے جب اپنے سوالات اردو زبان لکھ کر بھیجے تو اسمبلی کے سیکرٹری نے انہیں واپس کر دیا کہ انگریزی زبان میں سوالات بھیجئے۔ اسمبلی کی کاروائی قلمبند کرنے کے لئے ہندی رپورٹر تو رکھا جا سکتا ہے مگر اردو رپورٹر رکھنے اور اردو میں کاروائی شائع کرنے کے لئے بجٹ میں گنجائش نہیں نکلتی اسمبلی میں کانگریس کے کراچی ریزولیوشن کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ کاروائی ہندی اور اردو دونوں میں لکھی جائے تو کانگریسی حکومت کا وزیر عدل و انصاف جواب دیتا ہے کہ :-

"جو لوگ کانگریس کو ایک قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے۔ انہیں کانگریس کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں کیا حق ہے کہ اس تجویز کا حوالہ دے کر وہ ہم پر نکتہ چینی کریں ہم اقلیتوں کے معقول مطالبے ماننے کو تیار ہو سکتے ہیں لیکن اس ترمیم میں مسلمانوں کی طرف سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ نہ تو معقول ہے اور نہ قابل عمل۔ کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ ایوان اکثریت سے نامعقول مطالبے منوانے کی کوشش کرے۔

مسلمان ممبروں کو اب بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو اردو میں تقریر کرلیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اردو خط صوبہ کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں بھی رائج نہیں۔ اسمبلی میں بھی اسے رائج نہیں کیا جاسکتا اس سے بے انتہا مصارف بڑھ جائیں گے۔"

۴:۔ عمل کے ساتھ زبانوں پر بھی بیساختہ یہ بات آگئی ہے کہ "قومی زبان" حقیقت میں "ہندی" ہے نہ کہ وہ ہندوستانی جو محض دھوکے کی ٹٹی بنائی گئی ہے۔ اس تخیلی زبان کے متعلق تو ابھی حال میں گاندھی جی نے خود فرمادیا ہے کہ خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں ہے بلکہ وہ آئندہ پیدا کی جانے والی ہے اب مقابلہ رہ جاتا ہے اردو اور ہندی میں تو اس کے متعلق "متحدہ ہندوستانی قوم" کے لیڈر کا فیصلہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہے۔ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر "راشٹر بھاشا سمیلن" (قومی زبان کی کانفرنس) کا ساتواں اجلاس مسٹر جمنالال بزاز کے زیر صدارت ہوتا ہے اور کانگریس کا صدر اس کو پیغام بھیجتا ہے۔ کہ:۔

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے اور وہ زبان ہندی یا ہندوستانی ہی ہوسکتی

ہے جن لوگوں نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنی چاہیے کہ یہ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ہوگی"۔

یو پی کا وزیر تعلیم ۱۹ راگست ۳۸ء کو ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے :۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے. ہمارے جنوبی ہند کے ہم وطن آسانی سے سیکھ لیں، تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں"۔

اسی صوبہ کی اسمبلی کا صدر اسی وزیر تعلیم کے پاس وفد لیجاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ ہندی ذریعہ تعلیم بنانے سے پہلے اس کو سرکاری زبان قرار دیا جائے اور محکموں اور خصوصاً عدالتوں میں سارا کام ہندی کے ذریعہ سے ہو۔

یہ لوگ ہیں جنہوں نے متحدہ ہندوستان کے نام سے سیاسی طاقت حاصل کی ہے اور اب یہ اس طاقت کو ہندوستان کی ایک قوم کی زبان مٹانے اور دوسری قوم کی زبان سارے ملک پر مسلط کر دینے میں استعمال کر رہے ہیں۔

(٭)

حفیظؔ کی شاعری

حفیظؔ پنجاب کے مشہور استاد غلام قادر گرامی کے شاگرد ہیں انہیں کی صحبتوں میں اور انہیں کی راہنمائی میں حفیظؔ نے غزل سرائی سیکھی اور شعری صنعت گری پر عبور حاصل کیا۔ دوسری طرف وہ اقبال کی طرز فکر سے بھی متاثر ہیں۔ چنانچہ ان کی بعض نظموں اور غزلوں میں اقبالؔ کا انداز صاف نمایاں ہے۔

حفیظؔ شعراء کے اس دبستاں سے تعلق رکھتے ہیں جس کا ارتقاء عظمت اللہ خاں کے نقطۂ خیال اشاعت کے بعد ہوا۔ اس دبستاں کی بڑی خصوصیت ہندی بحروں کو اردو میں رائج کرنا اور شعر میں الفاظ کی نشست اور ترکیبوں سے ترنم اور حسن خیال کی آفرنیش ہے۔ حفیظؔ کی نظموں کے مجموعہ "نغمہ زار" میں بہت سی نظمیں ایسی ملتی ہیں جن میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔ حفیظؔ نے اس نئی طرز میں بعض پسندیدہ جدتیں بھی کی ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں ترنم ریز تصویریں ہیں۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے :-

اٹھی حسینۂ سحر　　　پہن کے سر پہ تاج زر

لباس نور زیب بر

چڑھی فراز کوہ پر

وہ خندۂ نگاہ سے　　　پہاڑ طور بن گئے

وہ عکس جلوہ گاہ سے　　　سحاب نور بن گئے

نوائے جوئبار اٹھی

صدائے آبشار اٹھی

ہواؤں کے رباب اٹھے　　　خوش آمدید کے لئے

اٹھی حسینۂ سحر　　　پہن کے سر پہ تاج زر

حفیظؔ کی شاعری کا ایک دوسرا رُخ ان کے جذبات کی فراوانی اور خیال کی رعنائی ہے وہ شباب کے مدح سرا شاعر ہیں اور ان کی اکثر نظمیں ان کے شباب کی چغلی کھاتی ہیں۔ اس خصوصیت سے متاثر ہوکر پروفیسر تاثیر، حفیظؔ کی شاعری کو "نغمۂ شباب" کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں حفیظؔ موسیقیانہ شاعری کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ نگاری میں بھی انہیں مہارت ہے اس کی شاہد ان کی طویل نظمیں خصوصاً شاہنامۂ اسلام ہے :۔

حفیظؔ نے اقبالؔ کی شاعری کی روشنی میں حیات کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کی نظم "زندگی" یا "آزادوادی" اور

بعض غزلیں اقبال کے نقطۂ خیال ہی کی تفسیریں ہیں۔

جب سے اقبال کی شاعری کا رخ اسلامی شائستگی کے احیا کی طرف پھر گیا ہے اکثر شاعروں کے لیۓ ایک نیا موضوع ہاتھ آ گیا ہے۔ حفیظ نے اس موضوع کا استعمال جس طریقہ سے کیا ہے انیس و دبیر اور حالی کے بعد سے آج تک کوئی نہ کر سکا۔ لیکن حفیظ نہ تو انیس کی طرح مرثیہ نگاری کرتے ہیں اور نہ حالی کے ساتھ مسلمانوں کے تنزل پر آنسو بہاتے ہیں اس خصوص میں وہ اقبال سے بھی الگ ایک نئے راستے پر گامزن کر رہے ہیں۔ حفیظ نے بھی اسلامی شائستگی کے احیا پہ کمر ہمت باندھ لی ہے اس سلسلہ میں ان کا اولین کارنامہ "شاہنامہ اسلام" ہے۔ جو اردو میں ایک نئے راستے کو ہموار کر رہا ہے۔

"شاہنامہ اسلام" کے ذریعہ حفیظ اسلامی تاریخ مدوّن کر رہے ہیں۔ پہلا حصہ آفرینش حضرت آدمؑ سے لے کر غزوۂ بدر تک کے واقعات پر مشتمل ہے یہ اس قدر وسیع زمانہ ہے کہ اس پر ہزاروں مبسوط تاریخیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن شاعر نے اس میں اجمال سے کام لیا ہے وہ روایات اعتقادات اور واقعات کے انبار سے صرف شاعرانہ زاویئے تلاش کر لیتا ہے اور انہیں جوڑ کر ایک مکمل نظم تیار کر دیتا ہے۔

یہ نظم اردو شاعری کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے قصوں کو چھوڑ

کہ اردو میں کسی معیّن مقصد کے تحت مربوط طویل نظمیں شاید ہی لکھی گئی ہونگی۔ حاؔلی کا مسدس انیسؔ کی طرح کا مرثیہ نہ سہی مگر ایک قومی مرثیہ ہے اس میں مربوط خیالی کی ضرورت مسلّم ہے لیکن واقعات کے ارتقا کی گنجائش نہیں۔ یہی امتیاز شاہنامہ کی وقعت کا باعث ہے

شاہنامہ اپنی طرز کی پہلی نظم ہونے کے سبب بعض خامیوں سے خالی نہیں ہے واقعات کے فشار نے نظم کو بعض نفیس بیانات اور مرقعوں سے محروم کر دیا ہے۔ جیسے بازار عکاظ یا آنحضرت صلعم کی ولادت باسعادت کی تفصیلات وغیرہ۔ بحالت موجودہ نظم کے واقعات ناکافی اشارے ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم "شاہنامہ اسلام" کے بعض پاروں کے متعلق یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اردو ادب میں عرصہ تک باقی رہیں گے۔ مثال کے لیے نظم کا آغاز، حضرت ابراہیمؑ کا قافلہ یا حضرت ہاجرہؑ کی اپنے فرزند کے لئے پانی کی تلاش کا نقشہ وغیرہ۔ یہ ایسے پارے ہیں جو درحقیقت اس شاہنامے کے وجود کو اردو میں موثر بنا رہے ہیں۔ حضرت ہاجرہؑ کے قافلہ کا یہ منظر بیحد موثّر ہے :۔

خدا کے حکم سے مرسلؑ نے جب رختِ سفر باندھا

جناب ہاجرہؑ نے دوش پر لختِ جگر باندھا

پیمبرؑ اپنا بیٹا اور بیوی ہم عناں لے کر

چلا سوئے عرب پیری میں بجنت نوجواں لے کر
خدا کا قافلہ جو مشتمل تھا تین جانوں پر
معزز جس کو ہونا تھا زمینوں آسمانوں پر
چلا جاتا تھا اس تپتے ہوئے صحرا کے سینے پر
جہاں دیتا ہے انساں موت کو ترجیح جینے پر
وہ صحرا جس کا سینہ آتشیں کرنوں کی بستی ہے
وہ مٹی جو سدا پانی کی صورت کو ترستی ہے
وہ صحرا جس کی وسعت دیکھنے سے ہول آتا ہے
وہ نقشہ جس کی صورت سے فلک بھی کانپ جاتا ہے
جہاں اک اک قدم پر سو طرح جانوں پہ آفت تھی
یہ چھوٹی سی جماعت بس وہیں گرم مسافت تھی
پیمبرؑ بیوی بچے کو لئے، قطع سفر کرتے
خدا کے حکم پہ لبیک کہتے اور دکھ بھرتے
بالآخر چلتے چلتے آخری منزل پہ آٹھہرے
پئے آرام زیر دامن کوہ صفا ٹھہرے
یہ وادی جس میں وحشت بھی قدم دھرتی تھی ڈر ڈر کے
جہاں پھرتے تھے آوارہ تھپیڑے باد صرصر کے

یہ وادی جو بظاہر ساری دنیا سے نرالی تھی
یہی اک روز دین حق کا مرکز بننے والی تھی
وہ وادی جس میں سبزہ تھا نہ پانی تھا نہ سایہ تھا
اسی کی جستجو میں اس طرف پیمبر آیا تھا
یہیں ننھے سے اسماعیل کو لا کر بسانا تھا
یہیں اپنی جبینوں سے خدا کا گھر بسانا تھا

یہ مثنوی جس بحر میں لکھی گئی ہے بیحد رواں اور مترنم ہے۔ اس بحر کو اقبال کی نظموں سے ایک خصوصیت حاصل ہو گئی ہے اقبال کی بعض بہترین نظمیں اسی بحر میں لکھی گئی ہیں جیسے "تصویر درد، محبت، خطاب بہ نوجوانان اسلام، طلوع اسلام" وغیرہ۔ بحر کے علاوہ نظم کی ترتیب، تناسب، سلامت اور بیانات کی سادگی نظم کی خوبی میں اضافہ کر رہی ہیں۔

محبّت پر ایک اجمالی تبصرہ

دل کا آئینہ صرف شدّت گداز سے چمکتا ہے اور گداز پیدا ہوتا ہے جی کی ساری آلائشوں، ساری کثافتوں اور تمام خوشگواریوں کو یک قلم جلانے اور پھونک دینے سے۔ اپلے اور خشک لکڑی کے ٹکڑوں سے اسی وقت آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں جب ان کی کثافت جل کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ جب تک من کے افق پر ہوس پرستی کی گھٹائیں چھائی رہیں گی۔ سچی محبّت کا آفتاب نظر نہیں آسکتا۔ یہ کسی حد تک صحیح ہے کہ ابتداءً محبّت کی پرورش، بیقراری، ناشکیبائی اور سخت الجھن کے آغوش میں ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے اس کی نشو و نما ہوتی جاتی ہے ناشکیبائی ثبات سے اور بیقراری مسرّت انگیز سکوں سے بدلتی جاتی ہے اس کی ابتدائی منزلیں سخت صبر آزما، جگر گداز اور ہمّت فرسا ہوتی ہیں۔ جہاں اکثر جذبۂ محبّت اپنی حقیقی راہ سے بھٹک کر بہت مہلک ہو جاتا ہے اور آج جو محبّت کے مقدّس نام پر قتل و غارتگری ہو رہی ہے وہ سب اسی بھٹکے ہوئے اور فریب خوردہ جذبے کا حسن نظر اور پرتو فیض ہے اور یہ مثل کہ

"محبت اندھی ہوتی ہے" اسی مسلک کے پیروؤں کا خود ساختہ نظریہ ہے۔ جذبۂ محبت اسی وقت ہوتا ہے جب انانیت، ابتذال اور فریب نفس شامل ہو کر اس کی تپش اندوز روشنی کو بجھا دیتا ہے۔ ایک شاعر، ایک مصور، ایک نقاش، ایک صنّاع بلکہ ہر ذی حس انسان اپنے گوشۂ قلب میں کسی نہ کسی چیز کی ضرور خلش رکھتا ہے لیکن ان سب میں بہت کم ہیں جن ابدی زندگی ملتی ہے اس لئے کہ فریب نفس ہمیشہ ان کے جذبۂ محبت کی رہنمائی کرتا ہے شاعر نظری ہجر و وصال کے تخیلات میں مقید رہتا ہے۔ مصور مصنوعی پیکر کی تزئین ذہنی رنگینیوں سے کرتا ہے۔ نقاش فرضی مجسمے کو دماغی افکار سے سنوارتا ہے۔ صنّاع خیالی نقوش کو اپنی صنعتوں میں بھرتا ہے ہر چند ان میں سے ہر ایک کو پورا یقین ہوتا ہے کہ اس کا جذبۂ محبت قطعی کامیاب ہے لیکن حقیقتاً اس میں جذب محبت کو جو روح کو بیدار اور دل کے گوشوں کو ضیا بار کرتا ہے بہت کم حصہ ہوتا ہے فرانس کے ایک مصور نے کئی سال کی پیہم سعی و محنت سے ایک پیکر تیار کیا۔ جو اس کی حقیقی محبت کا شاہکار تھا لیکن جب وہ اس کو بالکل مکمل کر کے ایک پرسکون رات کے حصے میں بغور دیکھنے کے لئے گیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ بولتا اور نقل و حرکت کرتا ہے ظاہر ہے کہ ایک بے جان مجسمہ کو کبھی جنبش کرنے کی قوت نہیں ہو سکتی لیکن

یہ جان صرف اس کے سچے پریم میں اس نے ڈال دی تھی۔

اسی طرح ایک قدیم ہندوستانی سنگ تراش نے اپنی قوت ذہنیہ اور حسن ادراک سے نہیں بلکہ اپنے اصلی محبت کے شعلوں سے دس سال کی جانفشانی کے بعد ایک بت بنایا اور جب وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا تو اس کے بت کے ہونٹوں پر تبسم اور چہرہ پر انبساط کی لہر دوڑتی نظر آئی۔ یہ چیز ہی ایک رکیک محبت کے علمبردار کو بے معنی اور مضحکہ خیز محسوس ہوگی۔ اس لئے کہ اس کی محبت اس چمنستان میں جہاں روح کے خاکستروں اور چنگاریوں میں ایک لگداز اور حیات پرور تپش پیدا ہو کر مدعی محبت کو پیکر خاموش بنا دیتی ہے۔ باریاب ہونے سے پہلے آلودۂ عصیاں ہو کر اپنے روح پرور زمزموں اور برق پاش تجلیوں کو کھو دیتی ہے کوئی جذبۂ محبت ابتداءً ناقص اور ناتواں نہیں ہوتا۔ اس میں طوفان سے زیادہ طاقت ہوا کی سے زیادہ تیزی اور کوہ سے زیادہ استحکام ہوتا ہے لیکن جب اس کی شورشیں محبت کرنے والے کو مغلوب کر دیتی ہیں تو اس شکست کے ساتھ اس جذبہ کی ساری قوت اور استقامت بھی زائل ہو جاتی ہے۔ اور وہ سوائے ہوس پرستی اور فسق و فجور کے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ مجازی اور حقیقی محبت صرف نظر کا فیض ہے۔ ہر محبت مادی ہوتی ہے اور آخری منزل تک

مادی ہی رہتی ہے لیکن چونکہ پاکیزہ جذبۂ محبت ایک مرکزی شکل اختیار کرکے روح اور قلب کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اس لئے اس کو روحانیت، حقیقت اور تصوف سے تعبیر کرتے ہیں۔

شاما کی میگوں نشیلی آنکھیں، لانبی لانبی پلکیں، درخشاں پیشانی، پھول کی پنکھڑی جیسے ہونٹ، صبیح رخسار، لطیف اور دلگداز تبسم، شانوں پر بکھری ہوئی سیاہ سیاہ زلفیں، محشر خیز سنجیدہ ادائیں، ہرلیش کے دل میں تلاطم برپا کر کے اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں انسانی فطرت خود حسین اور خوبصورت ہے اور ہر خوشنما چیز پر فریفتہ ہو جاتی ہے، ہرلیش ان حسین جلوؤں کو اپنی عارضی اور سطحی مسرت کے لئے مجروح نہیں کرتا، بلکہ انہیں بتدریج آنکھوں سے چن چن کر اپنے گوشۂ قلب میں جمع کر کے ایک ایسی یادگار قائم کرنا چاہتا ہے جس کے نقوش ابدی اور لازوال ہیں بالآخر وہ اپنی روح کو ایک مرکز کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ہرلیش کی محبت کی ابتدا مادی چیز سے ہوئی اور اب بھی مادی ہے۔ لیکن اس کے جذبۂ محبت میں جو روحانی سرور، جو قلبی کیف اور جو درد آگیں نشاط، جو مسرت خیز موج خلش پیدا ہوئی وہ صرف پرتو ہے احترام محبت اور آداب الفت کا، جس سے اس نے رفتہ رفتہ اپنی روح اور دل کو آشنا کیا یہ بھی بالکل غیر فطری حقیقت ہے کہ محبت کرنے والا انتہائے ہجوم

شوق محبت میں از خود رفتہ ہو کر مرکزِ محبت کو بھول کے خود اپنے آپ کو محبوب سمجھنے لگتا ہے کشش کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ اپنے محور کے گرد گھومنے والی چیز کو جدا نہیں ہونے دیتی۔ آفتاب کی شعاعوں میں، چاند کی کرنوں میں، شفق کے گوناگوں رنگوں میں ہزاروں لاکھوں ذرّات ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کو تارِ کشش باہم ایسا پروئے ہوئے ہے کہ ان میں کوئی بے ربطگی، کوئی انتشار اور کوئی خلا نہیں محسوس ہوتا اور ہر ایک، ہر وقت اپنے مرکز کی طرف مائل ہوتا ہے اسی طرح جذبۂ محبت بھی جو اپنا مرکز اور محور بنا چکا ہے کبھی اس جذب، اس کی کشش، اس کی مقناطیسیت سے باہر نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اس مرکزِ جمال کی تجلیاں ذرّے ذرّے کو بارگاہ حسن بنا دیں۔ لیکن مرکز کی کشش کی نگاہ سے وہ کبھی بھی دور نہیں ہٹ سکتے۔ یعنی شناسا کی لطیف انگڑائی، شیریں تبسم، نزہت آگیں تکلّم، خود فراموشانہ انہماک، بے نیازانہ سکوت، ہنگامہ زا چال، ذرّوں، تنکوں، کنکریوں میں ہر لیش کی نگاہ تصوّر کو نظر آ سکتی ہے۔ لیکن خود ہر لیش جو اس مرکزِ جمال کا پرستار ہے کبھی سراپا جمال نہیں بن سکتا۔ گداز شمع کی لپٹ پر خود بخود ہزاروں پروانے ٹوٹ ٹوٹ کے گرتے اور خاکستر ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ شمع کا تشکّل ہیکل اختیار کر لیں ہوتا یہ

ہے کہ اکثر حریم حسن کے جلوے محبت کی آنکھوں کو اتنا خیرہ کر دیتے ہیں کہ محبت کرنیوالا مبہوت ہوکر از خود رفتگی میں ان تجلیوں کو ڈھونڈتا ہے حالانکہ وہ اس کی نگاہوں کے سامنے اسی طرح ضو فشاں رہتی ہے لیکن نظروں کو چونکہ تاب نظارہ نہیں رہتی اس کی نگاہیں کچھ دیر یا کچھ عرصے تک بھٹکتی رہتی ہیں اگر مدعی محبت فرط تصور میں اپنے اندر مرکز ہی حسن کو جذب کر کے خود مرکز بن جائے تو اس کو روح کی تشنہ کامیوں کی لذت اور سرور کیسے حاصل ہو سکتا ہے اس لئے کہ سرمایۂ کیف و نشاط کے لئے ضروری ہے کہ کوئی مرکزی کشش اس کی نگاہ تصور کو اپنی طرف مائل کرے اور جب وہ کشش روپوش ہوگئی تو لذت محبت بھی یقیناً مجروح ہو جائے گی۔ غرض انتہائے محبت میں خود فراموشانہ انہماک اور مجذوبانہ محویت ضرور ہوتی ہے لیکن مرکزیت کبھی فنا نہیں ہوتی اور خود مدعی محبت اس مرکزیت کو اپنے اوپر طاری کر لینے کی دسترس نہیں رکھتا۔ وفور جذبۂ محبت میں بے قابو اور مجبور ہوکر اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاک کر لینا بوالہوسی اور شدید ہوسناکی کے علاوہ اس امر کا بھی ثبوت ہے کہ مدعی محبت کی الفت کا دامن انانیت کے دھبوں سے داغدار ہے۔ جمیلؔ، شانتاؔ کی خود دارانہ تمکنت، خسروانہ شوکت، شاہانہ بے نیازی اور ہوشربا سادگی پر فریفتہ ہے، اتفاق

سے وہ دوسرے کو بیاہ دی جاتی ہے یا مرجاتی ہے. جمن خودکشی کر لیتا ہے گیا اس کی یہ خودکشی اس کے جذبۂ محبت کو زندگیٔ دوام دے سکتی ہے بادی النظر میں اس کو قربانگاہ محبت کا بیش بہا ایثار کہا جائیگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی ہلاکت نے نہ صرف اس کے جذبۂ محبت کو پامال کیا بلکہ محبت کے لطیف اور نازک ترین حسیات کو پھونک کر ایک بڑی معصیت کی مرتکب ہوئی۔ اگر جمن کی روح کی نظروں کے سامنے شانتا کے جمال کا کوئی گہرا اور ابدی نقش قائم ہوتا۔ تو وہ اس کے فانی جسم پر کبھی اپنے آپ کو ہلاک کر کے اپنی محبت کی رسوائی اور بیخکنی نہ کرتا۔

محبت بیقرار نہیں، ایک خاموش، ساکت اور پرسکون خلش ہے جو نالہ و فغاں، گریہ وزاری اور خودکشی سے مٹ جاتی ہے اس لئے محبت کرنے والے کا جذبۂ محبت صرف اسی وقت غیرفانی ہوسکتا ہے جب وہ آداب محبت کی بقا کے لئے اپنے دل، اپنی روح، اپنی نظر اور اپنے تصور کو اس مرکز حسن کے سامنے سربسجود کر کے ایک درد انگیز لذت اور نشاط اندوز سرور سے ہمکنار ہوجائے۔

عجم اور عرب کی تاریخ ادب نے اگرچہ قیس و فرہاد کی محبت کو ابدی زندگی دے دی۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو دونوں کا جذبۂ محبت ہوس

پرستی پر مبنی تھا۔ فرہاد، شیریں شیریں چیخ چیخ کر بالآخر اس کے مرنے کی خبر سن کر جان دے دیتا ہے۔ قیس، لیلیٰ کی موت پر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے حالانکہ ان دونوں کی روحیں شیریں اور لیلیٰ کے مرکزی حسن کے سامنے جھکی ہوئی تھیں تو ان کے جذبۂ محبت کو آہ و فغاں، اشکباری اور خودکشی کا منت کش نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ جب دل نظر اور روح اپنے سامنے ایک شکل مرتسم کر کے اس کی پرستش کرنے لگی تو ظاہری نقوش بالکل اوجھل ہو جاتے ہیں۔ آتش محبت جب باطن کی آلائشوں کو جلا کر روح کو تجلی زار اور دل کو آئینہ بنا دیتی ہے اس وقت جذبۂ محبت میں خاموش شعلے کی طرح اور دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح سلگنے کی ایک بے پناہ آرزو اور تمنا پیدا ہو جاتی ہے اور محبت کرنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ایک حسن کی شمع روشن ہے۔ جس کے سامنے روح ایک سرور آفریں کیف میں جھکی ہوئی اس شمع کے ملتہب شعلوں کو آنکھوں سے لگا رہی ہے اگر فرہاد اور قیس کی محبت کو رفعت اور فروغ حاصل تھا تو ایک شیریں کے حصول کے لئے کوہ کنی اور دوسرا لیلیٰ کے فراق میں آہ و بکا کیوں کرتا تھا۔ جذبۂ محبت اس منزل میں فراق و وصال، التفات و تغافل، قربت و دوری کی تمام لغویات سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے اس کو اس سے مطلق واسطہ نہیں ہوتا کہ شیریں

یا لیلیٰ، اپنے جسمانی، فانی، وقتی، ظاہری اور عارضی رعنائیوں کو لے کر اس کے آغوش میں آئے۔ انسان کا خاکی پیکر قطعاً مٹ جانے والی چیز ہے۔ اس لئے اگر کوئی جذبۂ محبت صرف اسی خاکی پیکر کے جمال ظاہری کا رہین منت ہے تو اس خاکی پیکر کے چھپ جانے اور حسن ظاہری کے انحطاط پذیر ہونے کے بعد لازماً اس جذبۂ محبت کو بھی نحیف و ناتواں بلکہ معدوم ہونا چاہئے اور اکثر ہوتا بھی یہی ہے کہ محبت کرنے والے کا جذبہ محبت دراصل صرف کالبد خاکی کے ظاہری نقش و نگار کی پرستش میں محو رہتا ہے اور محبت کرنے والا فریب نفس کے باعث اس کو حقیقی پاکیزہ جذبہ سمجھتا ہے۔ لیکن جب وہ ظاہری حسن اس کی نگاہ تصور یا خود اس کی مادی آنکھوں سے چھپ جاتا ہے اس وقت وہ ساری دنیا کو چیخ چیخ کر سر پر اٹھا لیتا ہے اور اس کو رفتہ رفتہ خود محسوس ہونے لگتا ہے۔ کہ اس کی محبت صرف فریب نفس کی ایک جھلک تھی۔

ازدواج بر بنائے محبت کا نظریہ بھی سخت فریب خوردہ نظریہ ہے یعنی اگر شوکت، ذکیہ کی ہنگامہ زا چال، فسوں انگیز طرز تکلم، قیامت خیز تبسم اور جان آفریں انگڑائی کا کشتہ ہے۔ تو اس کے لئے کیا یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایک عارضی و سطحی کیف و سرور کے حصول کے لئے ذکیہ

کی دائمی معیت پر اپنی محبت کی ابدی و غیر فانی زندگی قربان کردے؟ جب ذکیہ کی قربت اس کی محبت کو حاصل ہوگئی تو پھر وہ بیقراری اور ناشکیبائی اور وہ روح پرور تشنگی جس سے محبت کی برتر اور ارفع سیرت اور مزاج کی تعمیر ہوتی ہے کیونکہ قائم رہ سکتی ہے؟ چنانچہ ازدواج بر بنائے محبت کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جوں جوں مدعی محبت کی ہوسناکی جس کو وہ ابتداً غریب نفس کی شدت کی بنا پر حقیقی جذبۂ محبت سمجھتا ہے سیراب ہوکر روبہ انحطاط ہوجاتی ہے اس کی محبت اپنے حقیقی مرکز سے دور ہوتی جاتی ہے یہانتک کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پاتا کہ جذبۂ محبت میں ایک مہلک قسم کی بیگانگی پیدا ہو کر اس جذب اور کشش کو یک قلم منقطع کر دیتی ہے جو جذبۂ محبت کو اس کی مرکزیت سے ادھر ادھر ہٹنے سے روکتی اور باز رکھتی ہے۔

اپنی مدد آپ

"خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے جب کہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹ جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے غیرت اور بے عزت ہو جاتی ہے آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں خواہ اپنی بھلائی

اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (یہ امر بدیہی اور لابدی ہے) کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں اے میرے ہموطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں ہمیشہ یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعیت کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کرکے ان کا درجہ سب سے اعلیٰ اور بیش بہا سمجھتے تھے مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں ایک شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آئرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے یا کلکتہ میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جائے اس سے قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیونکر ہو سکتی ہے برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دیدینے سے گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا گیا ہو۔ قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے بلکہ خواہش کے چال چلن پر اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر

پیدا نہیں تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا ہو سکتا ہے ہاں یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قومی کی کمیں اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جبکہ قانون کا عملدرآمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی نقصان کم ہوتا ہے مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہو سست آدمی کو محنتی، فضول خرچ کو کفایت شعار، شرابخور کو تائب نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ باتیں شخصی محنت، کفایت شعاری نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی، قومی عزت، قومی اصلاح، عمدہ عادتوں عمدہ چال چلن، عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حاصل کرنے سے۔

پرانے لوگوں کا مقولہ ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکہم۔ اگر اس مقولہ میں "الناس" سے چند خاص آدمی مراد لیے جائیں جو بادشاہ کے مقرب

ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے اور اگر یہ معنی لئے جائیں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے۔ رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی۔ بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے، عکس ہوتی ہے جو رنگ ان کا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اس کو زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھینچ جاتی ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا کہ انگلستان کی رعایا تہذیب وشائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھینچتی۔ بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لاتی ہے۔

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے، یقینی اسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے جس طرح کہ پانی خود اپنی ہنسال میں آجاتا ہے اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا

پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادات، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے ایمانی، شخصی بے عزتی، شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا، ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے دراصل وہ خود اس شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوششوں سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں تو یہ برائیاں کسی نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جائینگی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کی ترقی نہ کی جائے۔

اے میرے عزیز ہموطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی ہی زندگی

اور شخصی چال چلن کس طرح عمدہ ہوتا کہ تم بھی ایک معزز قوم ہو گیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا، بات چیت کا، وضع و لباس کا، سیر سپاٹے کا شغل اشغال کا تمہاری اولاد کے لئے ہے اسی سے ان کی شخصی چال چلن اخلاق و عادات، نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلاّ۔

جب کہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی قوتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک نا خدا ترس نے جو اس ظالم کا آقا کہلاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بد اخلاقی و خود غرضی، جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں

پیدا نہیں ہو سکتا گو کیسی ہی تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جائیں وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں۔ جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

مستقل اور مضبوط آزادی، سچی عزت، اصلی ترقی، شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے اور وہی شخصی چال چلن، معاشرت و تمدن کا محافظ اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔ جان اسٹیورٹ مل جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گذرا ہے اس کا قول ہے کہ ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی شے اس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے پھر اس شے کو جس نام سے چاہو پکارو۔ اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ حکومت کیوں نہ قائم کی جائے وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اس اپنے مقولہ کی تصدیق کو ہندوستان کی اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کی مثال میں پیش کرتا ہوں۔

اے مسلمان بھائیو! کیا تمہاری یہی حالت نہیں ہے؟ تم نے اس عمدہ گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے کیا فائدہ اٹھایا ہے تمہاری آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے، ہیچ، ہیچ، ہیچ۔ اس کا سبب یہی ہے کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں۔ کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جائے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جائے تو تمام قوموں کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسا کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے کیا لالہ اشرفی لال جو ہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں۔

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی مدد آپ کرنا ہے جس وقت لوگ اس کو اچھی

طرح سمجھیں گے اور کام میں لائینگے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جائینگے اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ، یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے، اور پہلا خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈارگن نے ڈبلن کی نمایش گاہ دستکاری میں کہا تھا۔ جو ایک بڑا خیر خواہ آئر لینڈ کا تھا۔

اس نے کہا کہ جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت، ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جائیں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ کوئی واقعہ یا آئندہ کی توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے اگر ہم دلی ولولہ اور محنت سے کام کئے جائیں گے تو پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و

خوشی و آزادی کی ہو جائیگی۔

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں، زمین کے جوتنے والوں کانوں کے کھودنے والوں، نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں، مخفی باتوں کو ڈھونڈھ کر نکالنے والوں، آلات جر ثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں، ہنرمندوں، شاعروں، حکیموں، فلسفیوں اور ملکی متکلموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے ایک ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے۔ اور اس کو ایک اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب اور شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی۔ اور وہ جائداد ہم کو اس لئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل "مار سر گنج" اس کی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں

کے لئے چھوڑ جائیں۔ مگر افسوس! صد ہزار افسوس! ہماری قوم نے ان پرکھوں کی پرکھوں کی جوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا۔

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزت کرتے تھے۔ مگر کم درجہ اور غیر معروف آدمیوں کے گروہوں سے بھی اس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے گو کسی لڑائی اور میدان کارزار کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں۔ لیکن وہ فتوحات ان کو زیادہ تر انہی محنتی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب حاصل ہوئی۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں بہت سے ایسے شخص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہ دیکھا لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی پر ان کا بھی ایسا ہی قومی اثر ہوا ہے جیسا کہ ان خوش نصیب مشہور، نامور آدمیوں کا ہوا ہے۔ جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں۔

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے اس شخص کا اس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اس کے ملک میں اس کی قوم کی بھلائی

پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخص ہی کی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسے و مدرستہ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کا نام جس کو انگریزی میں "سیلف ایجوکیشن" کہتے ہیں انسانی قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے مکتب و مدرسہ و مدرستہ العلوم کا علم طاق میں یا صندوق میں یا المباری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے اور زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں، گھر کے رہنے سہنے میں، شہر کی گلیوں میں، پھرنے میں، صرافہ کی دکان کرنے میں، ہل جوتنے میں، کپڑا بننے کے کارخانہ میں، کلوں سے کام کرنے کے کارخانہ میں اپنے ساتھ ہوتا ہے اور بھیر بے سکھائے اور بے شاگرد کئے لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

یہ علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے اسی پچھلے علم سے عمل چال چلن، تعلیم نفسی، نفس کشی، شخصی خوبی، قومی مضبوطی، قومی عزت حاصل ہوتی ہے یہی پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو اپنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجہ کے علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے "علم سے علم نہیں آجاتا، علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل کر دیتا ہے۔ علم کی نسبت عمل اور سوانحمری کی نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے

اکبر الہ آبادی کا رتبہ شاعری

اکبرؔ کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا ان کا ابتدائی کلام بھی کلیات میں موجود ہے۔ ملازمت کے زمانہ میں انہوں نے انگریزی پڑھی جس کا ان کی شاعری پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اکبر اپنی طرز کے آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم ہیں۔ لسان العصر ہونے کے علاوہ بے مثل شاعر۔ ناصح قوم اور صوفی صافی تھے، حکومت پر نہایت ظریف پیرائے میں تنقید کرتے اور سیاسیات کو ظرافت میں رنگ کر اپنے دل کی بات ایسے مزے میں کہہ دیتے ہیں کہ دیکھنے والے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اکبرؔ نے خود اپنی شاعری کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا ہے:۔

پہلا دور ۱۸۶۶ء تک:۔ یہ زمانہ ان کی نومشقی کا تھا اس وقت کا کلام دہلی اور لکھنؤ کے مستند اساتذہ کی تقلید میں ہے وہی فرسودہ مضامین اور تصنع۔ مگر پھر بھی جذبات میں صفائی، زبان میں سادگی اور روانی آنے والے خوش آیند مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔

دوسرا دور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۴ء تک:۔ اس دور میں تصنع کی جگہ

بے تکلفی نے لے لی ہے اور نسبتاً اصلیت کلام میں زیادہ ہو گئی ہے۔ فرسودہ مضامین اور حشو وزوائد کی بھی معتد بہ کمی ہے، درد واثر، بندش اور طرز ادا میں صاف فرق دکھائی دیتا ہے۔

تیسرا دور ۱۹۰۸ء تک :- اس دور میں ان کے کلام میں استادانہ رنگ آ گیا ہے نومشقی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ غزلیں زیادہ لکھتے ہیں۔ پرانے رنگ کی بجائے اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے کلام میں ظرافت کا عنصر بڑھ رہا ہے کہیں کہیں روحانیت اور تصوف بھی جلوہ گر ہے اس دور کا کلام ان کی پہلی اور دوسری کلیات میں چھپا ہے۔

چوتھا دور ۱۹۱۲ء تک :- اگرچہ گذشتہ دور سے یہ دور الگ نہیں لیکن پھر بھی بہت ترقی کا دور ہے اب اکبر حقیقت میں لسان العصر ہو گئے ہیں قدیم رنگ کی غزل گوئی گھٹتی جاتی ہے اور فلسفہ بڑھتا جاتا ہے مذاق اور ظرافت میں ترقی ہو رہی ہے واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت بیباکی اور شوخی سے نکتہ چینی کرتے ہیں اخلاقی، روحانی اور فلسفیانہ رنگ کا زور ہے۔ عاشقانہ رنگ اگرچہ مدھم ہو چکا ہے لیکن اس کو بھی بھولے نہیں۔

خیالات میں اب ایسا زور پیدا ہو گیا ہے کہ قواعد شعری کے قیود

ٹوٹ چکے ہیں اپنے خیالات کا اظہار نئے انداز سے کرتے ہیں، کہیں انگریزی کے قافیے لاتے ہیں اور کہیں جدید استعارے اور تشبیہیں اس دور میں اکبرؔ اپنے فن کے کامل صناع ہیں۔

پانچواں دور ۱۹۲۱ء تک :۔ اس زمانہ میں عاشقانہ رنگ بہت کم ہے اشعار پر ظریفانہ، سیاسی، اخلاقی اور روحانی رنگ چڑھا ہوا ہے اس دور کو ان کی شاعری کی معراج سمجھنا چاہیئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑھاپے کا کلام ہے اس میں ایامِ شباب کی شوخی اور جوش نہیں۔ وسیع تجربے اور طویل عمر نے ان کے کلام کو فلسفیانہ بنا دیا ہے اس دور کے اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ انسان ان کو اپنا دستور العمل بنا سکتا ہے۔

اکبرؔ کا سارا کلام تین حصوں میں چھپا ہے۔ چستیٔ بندش، روزمرّہ، سلاست، روانی، بے تکلّفی، بلند تخیل اور عمدہ تشبیہیں ان کی غزلوں کی جان ہیں۔ اکثر غزلیں اخلاقی، روحانی اور دنیا کی بے ثباتی کے مطالب، اور ظریفانہ، فلسفیانہ اور تصوّفانہ مضامین سے مملو ہیں حزن ویاس کے مضامین ان کے ہاں بکثرت ہیں۔ لیکن ان کی شہرت غزلوں کی وجہ سے نہیں ان کے مخصوص ظریفانہ انداز کے باعث ہے۔ ہر رنگ کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو :۔

نگاہ پڑتی ہے ان پر تمام محفل کی
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

یہی نظر ہے کہ اب فاتح زمانہ ہوئی
یہی نظر ہے کہ اٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
شدت یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سنے
دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا

اکبرؔ کی خوش طبعی اور ظرافت

اکبر کی شہرت، ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے۔ ان کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا۔ اور بہت جلد ترقی کر کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گیا۔ ظریفانہ رنگ سے ان کی طبیعت کو اوائل عمر ہی سے خاص لگاؤ تھا آخری زمانہ کے کلام میں بھی مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہیں کہیں پائے جاتے ہیں گویا سوسائٹی کے رنگ کے ساتھ ان کے اس رنگ میں پختگی اور ترقی ہوتی گئی۔ ان کی شوخ طبیعت نے اپنے لئے نئے راستے بنا لئے۔ اس رنگ میں انہوں نے ایسا کمال پیدا کیا کہ کوئی ان کی نقل نہ کر سکا۔ اکبر کی ظرافت کے اجزاء حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جدید و لطیف عام فہم تشبیہوں کو نہایت دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔

۲۔ غیر زبانوں کے الفاظ بطور قافیہ استعمال کرتے ہیں۔

۳۔ معمولی الفاظ بالکل انوکھے طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ بعض سبک الفاظ جو عام شعرار استعمال نہیں کرتے شعر میں نہایت خوبی اور شوخی سے صرف کرتے ہیں۔

اکبر کی ظرافت کو محض تمسخر نہیں سمجھنا چاہیئے اس کی تہ میں نہایت لطیف اور عمیق معنی ہوتے ہیں ان کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور ان کا مذاق بھی سوقیانہ نہیں ظرافت نہایت جامع اور وسیع ہے۔ واقعات حاضرہ، سیاسیات، مغربی طرز تعلیم، اور تہذیب ان کی خاص دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ ہندوستانی سوسائٹی کی تعلیمی اور مذہبی خرابیوں کی خوب ظریفانہ پیرائے میں خبر لیتے ہیں امیر، غریب، عالم، جاہل اور ہر مذہب و ملت پر ان کی ظرافت کے تیر چلتے ہیں۔ مثلاً مذہبیات :۔

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

سیاسیات :۔

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو ملک کو دیکھو اپنے حق پہ لڑو

کہہ دیا ہم نے صاف اے مہراج ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج

ما مقیمان کوئے دلدار یم
یا ڈپوٹیشن ست یا غم ہیم

کامیابی کا سُودیشی پر ہر اک دربستہ ہے   چونچ طوطار اس نے کھولی مگر پر بستہ ہے

تعلیم و تہذیب جدید :-

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں   کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

تعلیم جو دیجاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

پردہ و تعلیم نسواں :-

غریب اکبر نے بحث پردے کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب اُلٹ ہی دی اس نے کہکر کہ کر ہی لیگا مرا ہوا کیا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی   اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ظرافت الفاظ :-

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

پکائیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

ح حکومت کی جب یہاں نہ رہی   حنفی نفی ہیں، معتزل ہیں

ہر طرح اب ہے عاجزی ہم ہیں　　　اب ہمارے امام حنبلؒ ہیں

طنزیات :-

آنز اگر ملے جو ہے نام و نمود میں　　　کیا ہرج زندگی ہو اگر حال زشت میں

دوزخ کے داخلے میں نہیں انکو عذر کچھ　　　فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

استحصال بالجبر :- یعنی وہ اشعار جو بادنیٰ تغیر اکبرؔ نے اپنے کر لئے ہیں :-

کبریا بہ بخشائے بر حال بندہ　　　کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

رشتۂ در گردنم افگندہ پیٹ　　　مے برد ہر جا کہ کیک ست و پلیٹ

در پس ہر گریہ آخر خندہ الیست　　　بعد ہر اسپیچ آخر چندہ الیست

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست

گفت ما را خوف فیس و ٹکیس در ایں کار داست

اکبرؔ کی سیاسی نظمیں

اکبرؔ کی سیاسی نظمیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کا مقصد محض خوش طبعی ہے۔ دوسری وہ ہیں جن میں ظرافت کے پردے میں سیاسیات مضمر ہیں۔ ایسے اشعار کی تلخی ظرافت کی وجہ سے بالکل دور ہو گئی رہے۔ لیکن سامع کے دل پر وہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔

اکبرؔ کو ماہر سیاسیات نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اکثر ان کے مقولوں میں اختلاف نظر آتے ہیں۔ اکبرؔ سرکاری پنشن خوار تھے اس لئے سیاسیات سے ہمیشہ اجتناب ہی کرتے تھے۔ پھر بھی جنگ عظیم اور مسجد کانپور کے بلوے کے ایام میں گورنمنٹ نے بعض اشعار پر ان کو متنبہ کیا۔

اکبرؔ مشرقی طرز معاشرت کے حامی، انگریزی تعلیم کے مخالف اور روحانی تعلیم کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک احکام خداوندی کی بجا آوری سیاسی اور اقتصادی مشکلات کا بہترین حل ہے۔

اکبرؔ نے کانگریس کی کارروائیوں، انتہا پسند جماعتوں، جابرانہ حکومتوں، مغربی تہذیب اور تعلیم کا خوب دلکش انداز میں خاکہ اڑایا ہے یہ مضامین نہایت نادر استعارات اور لطیف اشارات کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ جو سطحی نظروں کے لئے زعفران زار اور دور بیں نگاہوں کے لئے معنی خیز ہیں۔

سوسائٹی کی نکتہ چینی

اکبرؔ کی شاعری کے ہونے وہ زمانہ پایا جب ہندوستان نیا جنم لے رہا تھا گویا ہندوستانی مغربیت کے ایسے دیوانے ہو رہے تھے۔ کہ ہر ہندوستانی چیز کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے یہ اثرات مذہب

اور فرسودہ رسم و رواج پر بھی پڑ رہے تھے۔ اس زمانہ میں چند قدامت پسند لوگ کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بنکم چندر چیٹر جی نے ناول لکھ لکھ کر انگریزی تہذیب کا خاکہ اڑایا۔ ادھر اکبرؔ نے نظم کا میدان سنبھالا اور انتہا پسند ہندوستانیوں کی خوب خبر لی۔ اکبرؔ قدامت پسند واقع ہوئے تھے اس لئے نئی تہذیب ان کو اپیل نہیں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سر سید مرحوم سے جو مغربی تعلیم کے زبردست حامی تھے ہمیشہ چشمکیں ہوتی رہتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اکبرؔ مغربی تعلیم کے بالکل مخالف نہ تھے۔ وہ اس کی تحصیل میں اعتدال چاہتے تھے کیونکہ مذہب کو مغربی تعلیم سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا وہ مذہب پر ہزار تہذیبوں کو قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے۔ پرانی وضعداری اور سچائی، ہمدردی، قناعت، خودداری، سادگی وغیرہ کے مداح اور موجودہ زمانہ کی دو دلی، خود غرضی، بے حمیتی، مغربی تعلیم، بے پردگی اور مادہ پرستی کے سخت نکتہ چین تھے۔

اکبرؔ علاوہ شاعر ہونے کے ناصح مشفق، ریفارمر، واعظ اور فلسفی بھی تھے۔ وہ خدا کی وحدانیت کے قائل تھے اور ان کا اعتقاد تھا، کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے اس میں فلسفہ، سائنس اور منطق کو مطلق

دخل نہیں۔ مذہبی تعصبات سے بالکل بری تھے مگر مذہب کے خلاف
کسی قسم کی نکتہ چینی برداشت نہ کرتے تھے۔ اعتقاد کو مذہب کی جان
خیال کرتے تھے۔ آخر عمر میں فلسفہ اور تصوف میں بہت کہتے اور دنیا
کی بے حقیقتی اور ناپائداری کا نہایت عمدہ پیرایہ میں ذکر کرتے تھے۔

(ملخص تاریخ ادب اردو)

یارانِ وطن

وطن کی محبّت ہر ایک کی فطرت میں پائی جاتی ہے۔ طبائع انسانی کے تفاوت سے اگرچہ اس میں بھی کمی یا زیادتی ہو جاتی ہے لیکن یہ سمجھنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہ خواہش بھی انسان بلکہ حیوان کے نیچرل تقاضوں کی فہرست میں شامل ہے۔

ہر انسان خواہ وہ امیر ہو یا غریب، دولتمند ہو یا مفلس، بادشاہ ہو یا فقیر اپنے مالوف وطن کو ہمیشہ محبّت کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ لیکن حیرت کی یہ بات ہے کہ محبت وطن کا اثر خاص وطن میں اس قدر محسوس نہیں ہوتا جتنا کہ غریب الوطنی اور تعلقات وطن کے منقطع ہو چکنے کی حالت میں محسوس ہوتا ہے۔

ایک وہ مسافر جو اپنے وطن مالوف سے منہ موڑ کر، پیارے دوستوں اور اعزّہ و اقربا کو روتا چھوڑ کر دشت غربت میں ٹھوکریں کھانے کے لیے گھر سے نکلا ہے۔ دیکھیے، چلتے وقت اس کے چہرے سے کیسی حسرت برس رہی ہے اور آئندہ تنہائی کے خیال نے اسے کس قدر

مضطرب و بیتاب بنا رکھا ہے وہ گلے مل مل کر اپنے دوستوں سے جدا ہو رہا
ہے آنکھیں خونی آنسو بہا رہی ہیں دل قابو سے باہر ہے روتے روتے
ہچکی بندھ گئی ہے کبھی اپنی جان سے زیادہ عزیز فرزند کو رو رو کر
چھاتی سے لگا لیتا ہے کبھی اپنے شفیق والدین سے جو اس سے بھی زیادہ
اس کی جدائی سے بیقرار ہیں چمٹ جاتا ہے کبھی پیاری بی بی کے پرحسرت
چہرے پر اشک مفارقت بہتے دیکھ کر کلیجہ تھام لیتا ہے آخر مجبوراً صبر
کی سل سینہ پر رکھ کر اور ان سب کو خدا کے سپرد کر کے گھر سے نکلتا ہے مگر
اس قطع سے کہ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں دل سینے میں تڑپ رہا ہے،
پاؤں کو بار بار لغزش ہوتی ہے اور گھر کو منہ پھیر پھیر کے عجب حسرتمندانہ
نگاہوں سے دیکھتا جاتا ہے۔ آخر جب گھر بھی آنکھوں سے اوجھل ہوا
تو جب تک سواد وطن نظر کے سامنے ہے اسے دیکھ دیکھ کے دل کو کسی
قدر تسکین ہوتی ہے لیکن جب وہ تمام چیزیں جو وطن اور اس کے
خصوصیات سے تعلق رکھتی تھیں کوئی بھی آنکھ کے سامنے نہ رہی۔ تو
چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور ڈھونڈتا ہے کہ وطن کی
کوئی چیز بھی مل جائے تو اسے دیکھ کر کچھ آنسو پونچھے۔ مگر افسوس ہر مرتبہ
ناکامی ہوتی ہے۔

وہ غریب الوطن جو کسی امید و آرزو کے خیال سے صحرائے مصیبت

اور دشت ادبار کی خاک اڑاتا ہے اور قدم قدم پر نئی مصیبت جھیلتا ہوا
اگرچہ وطن کو خیرباد کہہ کے گھر سے نکلا ہے مگر وطن کا نقشہ اس کے
آنکھوں کے سامنے کھچا ہوا ہے ۔

بار بار وطن کی محبت جوش مارتی ہے ۔ گھڑی گھڑی یاران وطن
کی پرلطف صحبت یاد آکے ستاتی ہے اور وہ ضرورتیں جنہوں نے اس
کا گھر اس کے ماں باپ اور اہل و عیال کو چھڑایا ہے اسے ترک وطن پر
مجبور نہ رکھیں تو اسی دم لوٹ کھڑا ہو اور پیارے یاران وطن کی جدائی
ایک لمحہ کو بھی گوارا نہ کرے ۔

وہ زبردست مسافر جس کے ہاتھوں میں حکومت کی باگیں ہیں ۔
جس کے ایک اشارہ پر صدہا خدمتی حاضر ہوتے ہیں زمانہ اس کی اطاعت
میں ہاتھ باندھے کھڑا ہے ثروت و حکومت ، دولت و امارت سبھی موجود ہیں
مہ جبیں حوروش کنیزیں ہر گھڑی دلداری و دلجوئی کو آمادہ رہتی ہیں ۔
نوکر چاکر اس کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں مگر آہ ! اس
کے دل میں بھی وطن کی یاد کانٹا بن کر آٹھ پہر کھٹکتی رہتی ہے ۔

یہ سارے سامان اسے ہیچ معلوم ہوتے ہیں اور وطن کی دلچسپیاں
یاد آآ کر اس کے عیش و عشرت کو غم و الم سے بدل دیتی ہے اور جب
اسے اس عیش سے خاک لطف نہیں آتا تو نہایت حسرت کے ساتھ

منہ پھیر کر یہ شعر پڑھتا ہے :-

حب وطن از ملک سلیماں خوشتر خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر پادشاہی مے کرد میگفت گدا بودن کنعاں خوشتر

محبت وطن کی عام جلوہ گری کا خیال ہر دل میں پا کے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب اس عالم عناصر کے سفر کے لیے ہم نے اپنے اصلی وطن چھوڑنے کا قصد کیا ہو گا تو غالباً اس وقت ہمیں ان صدمات سے بھی کہیں زیادہ بڑھے ہوئے صدموں کا مقابلہ کرنا پڑا ہو گا۔ اور نازک بے موت طبیعت نے بہت کچھ مصیبت اٹھائی ہو گی اس عالم روحانی کو چھوڑتے وقت سخت بے چینی ہوئی ہو گی اور عالم قدس والوں کی جدائی نے بیحد ستایا ہو گا۔ لیکن اگر قدرت کے انتظامی مصالح ہیولانی تاریکیوں اور مادی ظلمتوں میں مبتلا کر کے ہماری یاد پر فراموشی کا پردہ نہ ڈال دیتے تو آج عالم کے دلفریب مناظر، ور دنیا کی دلچسپیاں بجائے اس کے، کہ ہمارے عیش و سرور کا سامان ہوں ہمارے لیے وحشت و نفرت کے اسباب بن جاتیں۔ نہ کسی حسین کا حسن ہماری دلبستگی کا باعث ہوتا نہ کسی کی زلف پریشان ہمیں پریشان بنا سکتی۔ نہ ہم کسی کی چشم فتاں پر شیدا ہوتے اور نہ کسی کے تیر مژگاں کے گھائل۔ نہ قدرتی سبزہ زاروں کی سیر میں یہ فرحت و کیفیت ہوتی اور نہ باد بہاری کے جھونکے کسی کمہلائے

ہوئے غنچہ دل کے شگفتہ کرنے پر قادر ہوتے۔ دنیا کی ہر حالت سے یہی معلوم ہوتا کہ ہمیں پھاڑے کھاتی ہے اور یہ جسمانی قید جسے لوگ زندگی کہتے ہیں ہمیں کال کوٹھڑی سے زیادہ غیر قابل برداشت نظر آتی۔ مگر خدا کی حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ نے ہمیں جسمانیت کی تیرگی اور کثافت سے اس قدر مانوس کر دیا ہے کہ اصلی وطن کے کل دوست اور وہاں کی عام دلچسپیاں خواب فراموش ہو گئیں۔ نہ وہ لطف یاد ہے جو عالم وحدت و بساطت کے ہم صحبتوں یا عالم روحانیت کے ہموطنوں سے ملنے جلنے میں آتا تھا نہ وہ کیفیت خیال میں ہے جو وہاں کی سادگی و بے پروائی میں حاصل تھی لیکن انسانی فطرت اس بھول جانے پر بھی مختلف حالات میں صاف کہہ دیتی ہے کہ :-

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند

از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

دیکھئے وہ بچہ جو ہنوز ماں کے پیٹ میں ہے اور ابھی ابھی روحانی وطن کی جدائی کا تازہ داغ کلیجے پر لے کے عالم مادی میں آیا ہے۔ اپنے اس پہلے زندانخانۂ شکم میں کیا تڑپ تڑپ کے اور پھڑک پھڑک کے رہ جاتا ہے بیشک یہ وطن کی محبت ہی کا اثر ہے کہ اس قید سخت کا کاٹنا اسے وبال ہو گیا ہے اور اس نئی مفارقت کا جھیلنا دشوار ہے۔

اس کے بعد جب وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو سخت بھیانک اور متحیر ہو ہو کر دیکھتا ہے کہ " ایں ! میں کہاں آ گیا یہاں تو کچھ اور ہی سامان ہے عجیب عجیب قسم کی چیزیں ہیں نہ ویسے لوگ ہیں جیسے کہ اس روحانی وطن میں تھے نہ ان میں وہ نورانیت، لطافت اور پاکیزگی ہے جو اگلے روحانی ہمنشینوں میں تھی نہ ان میں وہ حسن و جمال ہے جو یاران وطن میں تھا نہ ان میں وہ تجرّد و ملکوتیت ہے، جو اس پہلے عالم والوں میں پائی جاتی تھی۔ آخر وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور وطن مالوف کے چھوٹنے پر نہایت حسرت سے اپنی اس غربت و بیکسی پر چیخ مار کے رو اٹھتا ہے۔ لیکن آہ! وہ لاکھ چیخے، چلائے، روئے، غل مچائے - ع

کون سنتا ہے فغان درویش

افسوس، کوئی یہ بھی تو نہیں سمجھتا کہ یہ کیوں رو رہا ہے لیکن چند روز بعد جب اس دنیا میں رہتے رہتے اسے یہاں کی چیزوں سے انس ہونے لگتا ہے۔ بہیمی اور سبعی قوتیں بڑھتی ہیں ملکوتی آثار فنا ہوتے ہیں، کثافت مادہ اپنے رنگ میں رنگتی ہے اور امتداد زمانہ اگلی صحبتوں کو بھلا دیتا ہے تو وہ دنیا کی چیزوں میں لطف اٹھانے لگتا ہے یہاں کی کیفیتیں اپنی طرف محو کر لیتی ہیں تاہم پھر بھی وہ کبھی پرانے دوستوں

کو تلاش ہی کرتا رہتا ہے ازلی تعلقات کبھی کبھی یاد آجاتے ہیں، اور پرانی دوستی اور شناسائی کا خیال آتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ بعض طبائع کو بعض کے ساتھ ایک فطری لگاؤ اور سچی محبت ہوتی ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ازل کے دوست ہیں اور پرانی وضعداری کو نباہ رہے ہیں۔ ان میں آج کے نہیں برسوں کے راز و نیاز ہیں۔ خدا نے پرانے بچھڑے ملا دیئے ہیں اور ایسے مسرور ہیں کہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

دنیا کی ہوا کھانیوالوں میں سے اکثر اسی غلطی میں مبتلا ہو گئے، کہ اس سرا کو گھر سمجھ لیا اور مسافر سے مقیم بن بیٹھے مگر ہاں وہ چند سمجھدار لوگ جن کی ملکوتی قوت اور روحانیت کو بہیمیت اور سبعیت تباہ و برباد نہ کر سکی ان کو یہ عالم مسافرت ویسا ہی ستاتا رہا جیسا کہ عموماً غریب الوطن و بیکس مسافروں کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے قدیم روحانی صحبتیں اگرچہ ان کے ذہن سے فراموش ہو گئی تھیں۔ مگر یہ نہ بھولا کہ ہم کسی دوسری بستی کے رہنے والے ہیں اور یہاں بطور سیر و سیاحت آئے ہیں۔ اور جہاں سے آئے ہیں پھر وہیں جانا بھی ہے اور اسی سبب سے اس طبقہ کے اشخاص نے اپنی خلقت کے اغراض پر غور کر کے دنیا پر لات ماری اور ہر دم اس مبارک ساعت کے منتظر رہے جس میں ان کی ترسی

ہوئی آنکھیں اپنے ہم وطن بھائیوں کے دیکھنے سے محظوظ ہونگی لیکن وہ لوگ جنہوں نے اپنے پیارے وطن کو ایسا بھلایا کہ کسی کے بتانے سے بھی انہیں یاد نہیں آتا کہ ہم کسی اور جگہ سے آئے ہیں وہ البتہ اس بے ثبات اور ناپائیدار ہستی کے جلد مٹ جانے والے منظروں کے دیکھنے میں ایسے منہمک ہوئے کہ کبھی بھولے سے بھی قدیم وطنی دلچسپیوں کو یاد نہیں کرتے ان لوگوں کو دوہری مصیبت کا سامنا کرنا پڑا نادانی اور غلطی سے جسے گھر سمجھ رکھا تھا جب اس کے چھوڑنے کا وقت آیا۔ تو وہ پاک ولطیف روح جو جسمانی کثافتوں اور چند روزہ لذتوں میں مبتلا تھی۔ ذائقہ مرگ کو تلخ سمجھ کے گھبرا اٹھی اور کالبد خاکی میں ادھر ادھر پناہ ڈھونڈھتی پھرتی ہے عالم کے فانی عیش وعشرت کے چھوٹنے سے پریشان، اعزہ واقارب کی جدائی سے بیقرار، لڑکے بالوں کی یتیمی سے مضطرب اور بی بی کے رنڈاپے سے بیچین۔ الغرض عجیب آفت میں مبتلا ہے اور کسی حال میں قرار نہیں پاتی۔

اے اہل دل ناظرین! جب مصنوعی وطن کی مفارقت سے یہ جانفرسا کلفتیں پیش آتی ہیں تو تمہیں سوچو اور انصاف کرو کہ اپنے اصلی وطن یعنی اس پاک اور بے غل وغش عالم تجرد کے چھوڑتے وقت کیا کچھ مصیبتیں نہ پیش آئی ہونگی اور کون ناقابل برداشت وجانکاہ صعوبات ہیں جن

سے مقابلہ نہ کرنا پڑا ہوگا۔

وطن کی محبت کی آگ ہماری ہی طبیعتوں میں مشتعل نہیں، بلکہ بے زبان جانور، وحشی طیور اور صحرائی درندوں میں بھی اسی تیزی کے ساتھ بھڑک رہی ہے۔

ان ہواہیں اڑنے والے پرندوں کو دیکھو جو کچھ دیر پہلے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے آشیانوں میں سے نکلتے تھے اور بڑی مسرّت کے ساتھ فضائے عالم کی وسعت میں خوش فعلیاں کرتے تھے لیکن اتفاقاً ظالم و بیرحم صیاد کی دست درازی سے محبوس قفس ہو گئے۔ اب کس یاس و حسرت سے اس آسمانی فضا کو دیکھ رہے ہیں جس میں بلا ناغہ سیر و تفریح کیا کرتے تھے اور اپنے ان سادے مگر آرام دہ آشیانوں کا خیال کرکے جو نہایت کدوکاوش سے خود انہیں کی ذاتی محبّت سے تیار ہوئے تھے اور جن میں وہ بلا خوف و خطر آنکھیں بند کرکے آرام اور آسائش سے اپنی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ تڑپ تڑپ کر رہ جاتے ہیں اور اس تنگ قید خانے سے نجات نہیں پاتے جو ظالم شکاری کی بیرحمی سے ان غریبوں کو نصیب ہوا ہے آہ بے رحم صیاد! ان کی واجب الرحم حالت پر ذرا بھی ترس نہیں کھاتا اور نہ کوئی ان کے دردناک شیون اور جگر پاش فریاد اس کے پتھر کے بنے ہوئے دل پر

کوئی اثر کرتی ہے۔

ان وحشی اور صحرائی بہائم کی حالت بھی قابل ملاحظہ ہے جو قبل اس کے سرسبز مرغزاروں، قدرتی آبشاروں اور نیچر کی دلفریب بہاروں کو جنگل میں دیکھ دیکھ کر کلیلیں کرتے پھرتے تھے لیکن اب بدقسمتی نے ان بدنصیبوں کو ایسے قسی القلب ظالم کے پھندے میں پھنسایا جس نے ان بدبختوں کی آزادی چھین لی۔ اور نہایت بیدردی کے ساتھ بغیر کسی خطا اور قصور کے صرف جلاوطن ہی کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان بیکسوں اور بے بسوں کی جھکی ہوئی گردن میں بھاری زنجیر بھی ڈال دی ہے تاکہ نہ کبھی اپنے ہمجنسوں سے مل سکیں اور نہ انہیں پھر وہ اگلی آزادی حاصل ہو۔ افسوس! رونے کا مقام ہے کہ پیارے وطن کی یاد میں ان آفت رسیدوں کی جان پر کیا بنی ہوگی۔ اور کیسے کیسے جانسوز صدمات برداشت کرنے پڑتے ہونگے مگر آہ! کون ہے، جو غریب الوطنی کی مصیبت کا خیال کرے اور ان بے زبانوں پر رحم کرے اور انہیں جلاوطنی کے عذاب سے نجات دلوا دے۔

ہماری زبان کے نام

اردو، ہندی یا ہندستانی

زبان کو متحدہ قومیت کی بنا قرار دینے والے ہندوستان کے لئے ایک ایسی مشترکہ زبان کے متلاشی ہیں جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جا سکے۔ زبان ان کے سامنے ہے اس میں تھوڑے بہت ردّ و بدل سے کام بن سکتا ہے البتہ کسی ایسے مشترک نام کی ضرورت ہے جسے ہر طبقہ اور ہر جماعت قبول کرے۔ ہندوستان میں اس وقت قومی زبان بنائے جانے کے قابل صرف دو زبانیں ہیں۔ اردو اور ہندی۔ اور یہی دو زبانیں معرض بحث میں آتی ہیں۔

ہندی قدیم ہے یا اردو، اردو اصل ہے یا ہندی۔ اردو قومی زبان بنائے جانے کی صلاحیت رکھتی ہے یا ہندی؟

یہ سوال انتہائی قوم پرست اور انتہائی فرقہ پرست دونوں کے نزدیک یکساں اہمیت رکھتا ہے اور اسی کے حل کے لئے ہر سوسائٹی

اور ہر مجلس میں بحث کا بازار گرم ہے اور ہر جماعت چاہتی ہے کہ اس کی منظور نظر زبان مشترکہ زبان بننے کا شرف حاصل کرے۔ مسلمان اردو کی حمایت میں ہیں اور ہندو، ہندی کے حق میں۔ مسلمان اردو کی حمایت اس لئے کر رہے ہیں کہ اس زبان میں ان کے کلچر اور تہذیب میں بیحد دخل حاصل ہے۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ زبان ختم کر دی گئی تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ان کے کلچر کا اہم جزو مٹا دیا گیا۔ مسلمان اپنے اس خیال میں حق بجانب ہیں کہ اردو ان کے ہندوستان طبعی طور پر ان کے یہاں بسنے، پھلنے اور پھولنے کی ایک زندۂ تاریخ ہے اور اصل بات بھی یہی ہے کہ مسلمان ہندوستان آئے۔ یہاں کے باشندوں کے ساتھ اٹھے بیٹھے میل جول بڑھایا۔ تو ان کے اس راہ و رسم نے ایک ایسی زبان پیدا کر دی جو ہندو اور مسلمان دونوں کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے میں بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہوئی کہ دونوں نے اس زبان کو برابر چاہا۔ اور اس وقت تک چاہتے رہے جب تک ان دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف رہے۔ مگر جونہی دلوں میں میل پیدا ہوا۔ زبان میں اختلاف پیدا ہونے لگا۔ اور اردو ہندی کی بحثیں چھڑ گئیں یہ بحثیں ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے لئے کتنی خطرناک ہیں اس کا اندازہ حال کے تلخ تجربات سے کیا جا سکتا ہے۔

دونوں قومیں ایک دوسرے سے دور ہورہی اور اگر یہی لیل ونہار رہا تو ڈر ہوتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہ آجائے کہ ان دونوں کا باہم ملنا محالات سے ہو جائے اس لئے ضرورت ہے اس بات کی کہ حال کے تلخ تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے جو ایک طرف تو باہمی تلخیوں کو ختم کر دے اور دوسری طرف مستقبل کے متعلق اطمینان ہو جائے اور آئندہ یہ بحثیں ختم ہو جائیں۔

علامہ سیّد سلیمان ندوی کی تجویز

اس سلسلہ میں علامہ سیّد سلیمان ندوی کے اس خطبہ کا ذکر نہ کرنا ظلم ہو گا جو آپ نے حال ہی میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کی صدارت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے اس خطبہ میں آپ نے قوم کے سامنے ایسی تجاویز رکھی ہیں۔ کہ ہمارے خیال میں اگر قوم اس طرف توجہ کرے تو اردو ہندی کی ناگوار بحث بہت جلد ختم ہو جائے۔

سیّد صاحب اردو یا ہندی کا جھگڑا ختم کرنے کے لئے زبان کا نام ہی بدل دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ نہ بانس رہے اور نہ بجے بانسری کے ماتحت نام کی یہ تبدیلی اردو اور ہندی کے جھگڑے کو ختم کر دے۔

آپ اردو اور ہندی کی بجائے ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام ہندوستانی رکھنا چاہتے ہیں۔

اور آپ نے اپنے پورے خطبہ میں اسی چیز پر زور دیا ہے کہ اردو اور ہندی کی جگہ ہماری زبان کا نام ہندوستانی رکھا جائے کہ اس سے ایک تو ہماری زبان، زبانہائے عالم کی طرح اپنے ملک سے منسوب ہو جائیگی اور دوسرے ہر شخص اسے سن کر یہ جان لیگا کہ یہ ہندوستان کی زبان ہے۔

سیّد صاحب کی یہ تجویز نہایت مبارک تجویز ہے اور ہمارے خیال میں پورے ملک کو سیّد صاحب کی اس تجویز کو عملی صورت دینے کے لئے سعی بلیغ کرنی چاہیئے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر ہندی اور اردو کی بجائے ہماری زبان کا نام ہندوستانی مشہور ہو گیا تو زبان کے مسئلہ نے دونوں قوموں کے درمیان جو خلیج حائل کر دی ہے وہ بہت جلد ختم ہو جائے گی اور متحدہ قومیّت کا نظریہ بھی زندہ حقیقت کی صورت اختیار کرے گا۔ مگر اس کے لئے ضرورت ہے کہ تمام لسانی جھگڑے جو اس وقت مسلمانوں اور ہندؤوں میں موجود ہیں۔ انہیں ختم کر دیا جائے اور سب سے پہلے نیشنل کانگرس اس طرف توجہ کرے وہ اپنی دفتری زبان کا نام

ہندوستانی رکھے خواہ رسم الخط کا اختلاف موجود رہے اور اردو ٹائپ اور ہندی ٹائپ علی حالت قائم رہے کہ اس سے زبان کے اتحاد پر برا اثر پڑنے کا کوئی شدید احتمال نہیں۔ اس سے کانگرس کو دو فائدے ہونگے ایک تو متحدہ قومیت کے لئے زمین تیار ہو جائے گی۔ اور دوسرے اس کے اثر و اقتدار میں بھی اضافہ ہو جائے گا ممکن ہے اس موقع پر کانگرس کی وہ جماعتیں جو سخت قسم کی متعصب ہے۔ اس سلسلہ میں روڑے اٹکائے مگر ان تمام روکاوٹوں کو دور کر دینا کانگرس کا فرض اولین ہے اور ہم اسے یقین دلاتے ہیں کہ اگر اس نے یہ تحریک نیک نیتی سے جاری کی تو یہ روکاوٹیں خود بخود دور ہو جائینگی کانگرس کے علاوہ ہم اس سلسلہ میں تمام ان ہندوستانی رسائل، اخبارات اور ان سے دلچسپی رکھنے والے عوام سے بھی درخواست کرینگے کہ اردو، ہندی کی بجائے ہندوستانی رائج کریں اور آج سے بھول ہی جائیں کہ ہندی اور اردو بھی ان کی زبان کے نام تھے۔ بلاشبہ شروع میں یہ نام ان کو نامانوس معلوم ہوگا۔ مگر یہ اجنبیت بہت تھوڑی دیر تک قائم رہے گی۔ اس کے بعد زمین ہموار ہو جائے گی۔ کان آشنا ہو جائیں گے اور یہ تمام مشکلات دور ہو جائینگی۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظریہ بھی اختلافی رنگ اختیار کر سکتا ہے مگر

اس صورت میں جبکہ ہماری نیتیں صاف نہ ہوں اور ہم اختلافات کو کم کرنے کے بجائے انہیں بڑھانے کے خواہشمند ہوں۔ مگر اس صورت میں جبکہ ہم نیک نیتی سے یہ تحریک جاری کریں گے ہماری راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو گی۔ اور ہم منزل مقصود تک نہایت آسانی سے پہنچ جائیں گے۔

البتہ ایک چیز ہمیں بھی کھٹکتی ہے وہ ہندی کے پرستاروں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں ہیں۔ اگر یہ لوگ ہندی الفاظ ترک کر دیں اور اس کی جگہ ہندوستانی استعمال کریں اور بجائے ہندی کے ہندوستانی کا پرچار کریں اور یہ ہندوستانی وہ ہو جسے اردو یا ہندی دونوں کہا جا سکے۔ مگر ایسا ہونا بظاہر محال ہے نہ تو کانگرس اس قسم کی تحریک کے لئے تیار کی جا سکتی ہے اور نہ ہی ہندی کے سیوک اس بات کو قبول کریں گے۔ باقی رہے مسلمان البتہ ہمیں ان سے توقع ہے کہ وہ جس زبان کو آجتک اردو کہتے آئے ہیں اب اسے ہندوستانی کہنا شروع کر دیں اس سے ان کی زبان جو ان کے کلچر اور تہذیب و تمدن کا ایک اہم جزو ہے محفوظ ہو جائے گی اور دشمن اسے قطعاً تباہ نہ کر سکے گا، اور ایک دن وہ آئے گا کہ مخالف ان کی زبان کو ہی تسلیم کرنے پر مجبور ہونگے۔

ہندی اور ہندوستانی مرادف نہیں

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا۔ شاہ عبدالقادرؒ کے زمانہ تک اردو کا نام ہندی متعارف تھا۔ اور سرسیدؒ نے آثارالصنادید کے طبع اوّل میں اردو کے لئے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسی کو ہندی کہتے تھے۔ ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپ کو اس نام پر سے ملکیت کا دعویٰ اٹھا لینا پڑا اب ایک لفظ "ہندوستانی" رہ گیا تھا جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے۔ اگر آپ اس کو بھی چھوڑ دینگے تو دوسروں کے قبضہ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا۔ یہی وقت ہے کہ آپ معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھیں اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھا لینے کا گناہ نہ کریں۔ لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی طفل تسلی کے لئے رکھا گیا ہے اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے۔ ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مرادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی ہے غلط طور سے سیاسی بنایا جا

رہا ہے جذبات سے خالی ہو کر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہئے اور وہ قدم اٹھانا چاہیئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو۔

یہ تجویز کسی تحریک وتائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کی جارہی ہے اور نہ اس طرح سے ادبی اور لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں یہانتک کہ وہ رائے عامہ کو متاثر کر لیتی ہیں۔ اردو کا نام اردو کس ایک شخص یا کانفرنس نے رکھا؟ یہ تو پہلے کسی کسی کی زبان پر آیا پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا یہانتک کہ سب پر چھا گیا غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کو کہ اردو کا موزوں نام ہندوستانی ہے آپ کے درمیان پیش کیا گیا۔ اور کبھی کبھی مضمونوں میں ادھر اشارے کئے گئے اتنے پر یہ نام مدارس وغیرہ کے رسالوں میں چھپنے لگا اور کہیں کہیں اس کا چرچا ہونے لگا۔ یہانتک کہ آج اس کھلے اجلاس میں اس پر بحث تک نوبت پہنچ گئی۔ غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کردیں اس

سلسلہ میں ہماری مدد سب سے زیادہ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر کر سکتے ہیں امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کر کے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کرینگے۔ اور ثابت کرینگے۔ کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام ہندوستانی ہی ہونا زیادہ موزوں ہے اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہندوستانیوں کی بول چال میں ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آجکل کی کشمکش کا نتیجہ ہے بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگپور میں جس میں ساہتیہ پرشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا آج سے ۲۶ برس پہلے ۱۹۱۱ء کی مسلم لیگ کے اجلاس میں عزیز مرزا مرحوم نے یہی تحریک پیش کی تھی۔ اور اس کے بعد ساہتیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کی یونین میں یہی تجویز دوبارہ پیش کی گئی۔

ہندوستانی پورے ہندوستان کی زبان ہے

یہ سمجھنا ہی درست نہیں کہ اس تجویز کے پیش کرنے والوں کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان میں کوئی ایسی تبدیلی کر لیں جس سے وہ

ہندی یا ہندی کے قریب بن جائے۔ حاشا و کلا اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ بعینہٖ اسی زبان، بول چال کو جو ہم بولتے ہیں۔ ہم ہندوستانی کہتے ہیں ہم اس سے بھی اختلاف نہیں کرتے کہ ہم اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے لیکن عمومی طور پر اس کے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے بزرگوں نے اس زبان کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی اور دوسرے کا نام ہندی بتایا جاتا تھا جو عام بولچال کی زبان تھی۔ ہندی کا لفظ چھین گیا۔ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اس کے پرانے نام ہندی کی جگہ اس کے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجیے خواہ اپنی غزلوں کا نام ریختہ کی جگہ اردو ہی رکھیے۔ اس میں کچھ ہرج نہیں مگر اپنی علمی، تعلیمی، وطنی اور سیاسی تحریکات میں عام طور سے اس کو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کر کے ثابت کیجیے۔ کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے اور اس کا یہی نام اس کے پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے۔

ہم اس فریب میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دینے سے ہماری ساری مشکلیں ختم ہو جائیں گی۔ گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے گھماتے ہی ساری بلائیں دور ہو جائینگی۔

بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اس کے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کر رہے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کو اس کے نام سے روشناس کرائیں جس سے اس کی اصلیت واضح ہوتی ہو اور پورے ملک کی اس کے اندر سمائی ہوئی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے۔ اور جو اس پورے ملک کی زبان سے فائدہ ہو۔ اس کا یہی نام ہونا چاہیئے۔

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے بہی خواہ اس تحریک کی تائید کرینگے اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر مفید تحریک میں ہماری عادت ہو گئی ہے عملاً اس کے رواج دینے کی کوشش کرینگے تاکہ اس کا نام جو صرف خواص کو معلوم ہے۔ وہی عوام میں بھی پھیل جائے۔

ابھی مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے اس میں انگریزی کے جتنے اقتباسات انہوں نے پیش کئے ہیں آپ نے خیال کیا ہوگا کہ ان میں ہر جگہ اس زبان کا نام یورپ کے سیاحوں، تاجروں، کمپنی کے حاکموں اور لکھے پڑھے ہندوستانیوں کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے، اس سے

معلوم ہوگا اس کا اصلی نام پہلے یہی مشہور و معروف تھا جواب عام طور سے متروک ہو رہا ہے ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اس مرے ہوئے نام کو دوبارہ جلانا ہے۔

—————(۰)—————

فلسفۂ تصوّف

تصوّف اصل میں زبان و قلم کی حدود سے باہر ہے وہ وجدان ذوق و مشاہدہ کا نام ہے جو بیان میں نہیں آسکتا تاہم جس قدر زبان قلم سے ادا ہو سکتا تھا ارباب تصوف نے تصنیفات کے ذریعہ سے ادا کیا اور یہ پورا سرمایہ شاعری میں بھی آگیا۔ لیکن اس کی تفصیل سے پہلے تصوّف کی تعریف سمجھ لینی چاہیئے۔

اہلِ فلسفہ کے نزدیک تمام چیزوں کے ادراک کا ذریعہ حواسِ ظاہری ہیں۔ حواس کے مدرکات دماغ میں پہنچتے ہیں اور دماغ ان پر مختلف طریقوں سے عمل کرتا ہے۔ جزئیات سے کلیات بناتا ہے۔ مقدمات سے نتائج نکالتا ہے تحلیل وترکیب سے کام لیتا ہے۔

غرض ہمارا علم اور ادراک جو کچھ ہے صرف حواس اور دماغ کی مجموعی عمل کا نام ہے۔ لیکن ارباب تصوّف کے نزدیک ان سب کے علاوہ ایک اور حاسۂ باطنی ہے جو مشق اور ریاضت سے پیدا ہوتا ہے اور ترقی کرتا ہے اس کو حواس کے توسّط کی کچھ ضرورت نہیں بلکہ حواس کا تعطّل اس کے لئے مفید ہوتا ہے اس حاسہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کو مختلف ناموں یعنی کشف، مشاہدہ، الہام سے تعبیر کرتے ہیں اس کی نسبت مولانا روم فرماتے ہیں :۔

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک نقش ہا بینی بروں از آب و خاک
پنج حسے ہست جز ایں پنج حس آں چو زر سرخ وایں حس ہا چو مس

عالم غیب یعنی خدا، ملائکہ، آخرت، بہشت، دوزخ وغیرہ کے متعلق اہل شریعت اور فلسفہ جو کچھ جانتے ہیں قیاس اور استدلال کے ذریعے جانتے ہیں لیکن صوفی جانتا نہیں بلکہ دیکھتا ہے شیخ بوعلی سینا جب سلطان ابوسعید ابوالخیرؒ سے ملا اور فلسفیانہ تحقیقات ظاہر کیں تو اس کے جانے کے بعد سلطان صاحب نے لوگوں سے کہا "جو کچھ وہ جانتا ہے ہم دیکھتے ہیں۔"

یہ تصوّف کا علمی حصّہ ہے۔

شریعت اور علم الاخلاق میں جن احکام کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مثلاً صبر، رضا، توکّل، استغنا، قناعت وغیرہ وغیرہ ان پر انسان عمل کرتا ہے تو اس بنا پر کرتا ہے کہ شریعت نے اس کی تعلیم دی ہے اور شریعت کی سرتابی عذاب قیامت کی مستوجب ہے لیکن تصوف میں ایک حالت طاری ہو جاتی ہے جس سے خود بخود اخلاق پیدا ہوتے ہیں. صوفی دل پر جبر کر کے صبر اختیار نہیں کرتا بلکہ طبعًا اس سے صبر سرزد ہوتا ہے وہ نماز اس لئے نہیں پڑھتا کہ نہ پڑھونگا تو دوزخ میں جانا پڑے گا۔ بلکہ اس لئے کہ نہ پڑھنا اس کے اختیار میں نہیں۔ یہ تصوّف کا عملی حصّہ ہے۔

ابتدا میں انہی دو چیزوں یعنی اسی علم و عمل کا نام تصوّف تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں اور چیزیں بھی شامل ہوتی گئیں۔ چنانچہ موجودہ تصوّف، تصوّف، فلسفہ اور اخلاق کے مجموعہ کا نام ہے مثنوی مولانا روم میں سیکڑوں ایسے مسائل ہیں جو خالص فلسفہ کے مسائل ہیں۔ اسی طرح حدیقہ اور دوسری صوفیانہ مثنویوں میں اخلاق کے تمام مسائل آگئے ہیں۔ یہاں ہم مسائل تصوف سے مختصر طور پر بحث کرتے ہیں۔

وحدت وجود یا ہمہ اوست :۔ یہ مسئلہ صوفیانہ شاعری کی روح رواں ہے، صوفیانہ شاعری میں جو ذوق، شوق، سوز و گداز، جوش و

خروش، زور و اثر ہے سب اسی بادۂ مرد افگن کا فیض ہے اس خیال کی ابتداء عشق حقیقی کے استیلاء سے ہوئی۔ یعنی ارباب عرفان پر جب نشۂ محبت کا غلبہ ہوتا تھا تو ان کو معشوق حقیقی (صانع کل) کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ شاعری نے اسی حالت کی تصویر کھینچی! وحدی کرمانی نے نفس انسانی کے جو مدارج لکھے ہیں آخری درجہ فنا کا قرار دیا ہے۔

شیخ سعدی ایک تمثیلی حکایت میں لکھتے ہیں کہ کسی نے جگنو سے پوچھا کہ تم دن کو کیوں نہیں نکلتے؟ اس نے کہا میں تو دن رات ایک ہی جگہ رہتا ہوں لیکن آفتاب کی روشنی کے ہوتے ہیں لوگوں کو نظر نہیں آتا۔ یہی حال تمام عالم کا ہے کہ خدا کی ہستی کے مقابلہ میں ان کا وجود اہل حال کو نظر نہیں آتا۔

اس وحدت کو وحدت شہود کہتے ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال وحدت وجود کی حد تک پہنچا یعنی یہ کہ درحقیقت خدا کے سوا کوئی اور چیز سرے سے موجود ہی نہیں۔ یا یوں کہو کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اسلام میں یہ خیال کیونکر آیا۔ آج کل کے ارباب تحقیق کی رائے ہے کہ یونان اور ہندوستان اس خیال کے ماخذ ہیں۔ کیونکہ ہندو اور یونانی دونوں ہمہ اوست کے قائل تھے۔ لیکن اس کا تاریخی ثبوت ملنا مشکل ہے۔

زیادہ شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یونانی علوم و فنون کی توسیع واشاعت کا جو زمانہ تھا یعنی پہلی دو تین صدیاں اس وقت یہ خیال نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس مسئلہ کی ابتداء یا ظہور شیخ محی الدین محمد اکبر کے زمانہ سے ہوا جو شیخ سعدیؔ اور عراقی وغیرہ کا زمانہ ہے۔

بہرحال ہم کو اس وقت اس سے چنداں غرض نہیں کہ یہ خیال کب آیا اور کہاں سے آیا بلکہ یہ بحث کرنی چاہئے کہ اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے؟

حکماء میں اہل مادہ (میٹر یلیسٹ) اس بات کے قائل ہیں کہ عالم کا بنانے والا عالم سے کوئی الگ چیز نہیں۔ بلکہ ازل سے ایک مادہ ہے جس نے مختلف صورتیں اختیار کیں اور اختیار کرتا رہتا ہے۔ ابتداء میں چھوٹے چھوٹے ذرات تھے جن کو "اجزائے دیمقراطیسی" کہتے ہیں۔ یہ اجزا باہم ملے اور ان کے ملنے سے زمین، آسمان، ستارے وغیرہ وجود میں آئے۔ چونکہ ان ذرات میں حرکت اور قوت بھی ازل سے موجود ہے اسلئے یہ تغیرات خود اس کی ذات سے وجود میں آئے ہیں۔ کسی اور خالق یا صانع یا محرک کی ضرورت نہیں۔

اس قسم کی وحدت وجود دہریوں اور مادیوں کا مذہب ہے حضرات صوفیہ اس وحدت کے قائل نہیں ہو سکتے۔ بااینہمہ اس قدر قطعی سمجھتے

ہیں کہ "جو کچھ ہے، ایک ہی ذات ہے۔ موجودات خارجیہ سب اسی کے شیونات ہیں"۔ اس صورت میں یہ مسئلہ اس قدر مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کی تعبیر سخت مشکل ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر شیخ محی الدین اکبر کی تحریریں دیکھی ہیں۔ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اور غلام یحییٰ نے جو مستقل رسالے اس مسئلہ پر لکھے ہیں وہ بھی ہمارے پیش نظر ہیں لیکن ہم ان کے سمجھنے سے عاجز ہیں جو کچھ ان بزرگوں نے لکھا ہے ہمارے صوفی شعراء نے اس سے زیادہ صاف اور روشن لکھا ہے اور ہم انہی کے خیالات کی نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں شعرائے صوفیہ نے اس مسئلہ کی مختلف تشریحیں کی ہیں۔ لیکن پہلے ان کا دعویٰ انہی کی زبان سے سننا چاہیئے۔ کیونکہ یہ پر مزہ داستان ہے لیکن اسی وقت تک جب انہی کے لہجہ میں ادا کی جائے:۔

بکشود در صورت و معنیٰ بر ما بگرفت رہ دینی و عقبےٰ بر ما
خود را دیدیم و محو او گردیدیم ہم از ما کرد حق تجلّی بر ما

ولہ:۔

تا محو شدم آں رخ مہر آئیں را ہر ذرّہ چو من نمود جسم و دیں را
خواہم کہ ہمیشہ راز او فاش کنم عالم ہمہ او ست باکہ گویم ایں را

فلسفہ میں یہ مسئلہ محض ایک بے اثر اور مادی بحث ہے یعنی ازل

میں اجزائے دیمقراطیسی تھے وہ مل کر مادہ بنا، مادہ نے مختلف صورتیں اختیار کرلیں۔ لیکن تصوف میں یہ مسئلہ ہمہ تن روحانیت ہے تصوف کی نظر میں تمام عالم شاہد حقیقی کا جلوہ ہے یہ جو کچھ نظر آتا ہے اس کے کرشمے اور ادائیں ہیں ایک روح ہے جو تمام اشیاء میں ساری ہے ایک نور ہے جس سے تمام فضائے ہستی روشن ہے ایک آفتاب ہے جو ہر ذرہ میں چمک رہا ہے۔

عالم طبیعیات میں انسان ایک کمزور اور حقیر مخلوق ہے لیکن تصوّف میں یہ وہ ذرّہ ہے جو آفتاب سے ٹوٹ کر آیا ہے اور پھر آفتاب بن جائیگا۔ قطرہ ہے جس نے دریا کو آغوش میں چھپا رکھا ہے، نقطہ ہے جو دائرہ سے ہمدوش ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر مشکل ہے کہ فلسفہ کو اس کے ثابت کرنے میں نہایت دقتیں پیش آتی ہیں تاہم جس قدر فلسفہ ثابت کر سکا تصوّف نے اس سے زیادہ روشن اور مدلل طریقہ سے ثابت کیا۔ تصوّف نے اس مسئلہ کی مختلف تعبیریں کی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

۱۔ خدا ہستی بحت یعنی وجود مطلق ہے۔ یہی وجود مقید ہو جاتا ہے یعنی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اور مختلف نام سے پکارا جاتا ہے تمام عالم اور موجودات عالم اسی وجود مطلق کے تشخصات ہیں۔ اسی بنا پر حضرت

فریدالدین عطارؒ فرماتے ہیں کہ التوحید اسقاط الاضافات۔

۲۔ آفتاب کی روشنی ایک ہے لیکن آئینہ میں، پانی میں، ذرہ میں اس کی صورتیں بدل جاتی ہیں کہیں تیز ہو جاتی ہے کہیں دھندلی، کہیں اس قدر روشن کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اگر آئینہ، پانی، ذرہ فنا ہو جائیں، تو روشنی میں کچھ نقصان نہ آئے گا۔

۳۔ اعداد جس قدر ہیں اکائیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ مثلاً دس چند اکائیوں کے مجموعہ کا نام ہے لیکن اکائی اور دس میں کوئی فرق نہیں یعنی کوئی نئی چیز اس اکائی میں شامل نہیں ہوئی بلکہ اسی اکائی کو دس دفعہ شمار کیا تو دس بن گیا اسی طرح تمام عالم ذات واحد ہے مرتبہ اکثریت میں مختلف اور متعدد معلوم ہوتا ہے ؎

این همه وحدت ست به تکرار آمده

۴۔ انسان کے جسم میں مختلف اعضا ہیں۔ ہر عضو کا کام جدا ہے، صورتیں جدا ہیں لیکن ایک روح ہے جو تمام اعضا میں ساری ہے اعضا کا ایک ذرہ بھی اس روح سے خالی نہیں تاہم روح کی کوئی خاص جگہ ہرگز نہیں اور کہیں نہیں، سیکڑوں اعضا اور ہزاروں لاکھوں رگیں اور اعصاب الگ الگ کام کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہی ایک روح سب کچھ کر رہی ہے وہ نہ ہو تو کچھ نہیں، سب خاک کا ڈھیر ہے اسی طرح تمام عالم ایک

ہستی خاص ہے اس کے لاکھوں کروڑوں اجزا ہیں۔ سب گوناگوں اور مختلف الصورۃ ہیں۔ سب الگ الگ ہیں لیکن درحقیقت اس جسم اکبر میں ایک ہی روح ہے اور وہی سب کچھ کر رہی ہے وہ ایک ایک ذرہ میں ساری ہے وہ ہر جگہ ہے اور کہیں نہیں اس کا نہ کوئی چیز ہے نہ جہت نہ سمت اور پھر سب کچھ ہے یہی دہ روح ہے جس کو ہم خدا کہتے ہیں اور وحدت وجود کے یہی معنی ہیں ؎

حق جان جہان ست جہاں جملہ بدن ارواح و ملائکہ حواس ایں تن
افلاک وعناصر و موالید اعضا توحید ہمین ست دگر ہا ہمہ فن

۵۔ آئینہ میں جب کسی چیز کا عکس پڑتا ہے تو گویہ عکس مجسم ہو کر نظر آتا ہے لیکن وہ درحقیقت کوئی چیز نہیں جس چیز کا عکس ہے وہ ہٹ جائے تو پھر وہاں کچھ بھی نہیں جس کا عکس تھا وہ تو اب بھی موجود ہے لیکن عکس کا پتہ نہیں۔ اسی طرح دھوپ میں آدمی کا جو سایہ نظر آتا ہے یہ سایہ درحقیقت کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح اصل میں ایک ذات واحد موجود ہے یہ تمام عالم، گوناگوں مخلوقات اس کے اظلال اور پرتو ہیں ؎

ہر چیز کہ آں نشان ہستی دارد یا پرتو روئے اوست یا اوست ہمیں

یہ سب اس مسئلہ وحدت وجود کی فلسفیانہ تعبیریں ہیں لیکن فارسی شاعری نے اس مسئلہ کو جس جوش و خروش اور گوناگوں تخیلات کے

ذریعہ سے ادا کیا وہ شاعری کا انتہائی کمال ہے۔

حاسۂ باطنی :۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں تصوّف کی اصلی بنیاد علم باطن ہے اہل باطن کے نزدیک تمام اشیاء اور خصوصاً "معارف الٰہی" کے ادراک کے دو ذریعے ہیں ایک عقل جو حواس کے ذریعہ سے معلومات بہم پہنچاتی ہے اور پھر ان کو تجزیہ، تحلیل اور ترکیب دے کر نتائج کا استنباط کرتی ہے اس کو علم ظاہر کہتے ہیں۔ دوسرے قلب یا روح جو مشق، ریاضت اور تصفیہ سے بغیر حواس کی اعانت کے ادراک کرتی ہے یہ ادراک نہایت راسخ ہوتا ہے اور وہ ایک تسلی بخش کیفیت پیدا کرتا ہے اور شک اور احتمال کے خدشہ سے پاک ہوتا ہے۔ عارف کی آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن وہ دل کی آنکھوں سے علانیہ اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے اس کے ساتھ ایک لذّت محسوس ہوتی ہے یہ کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی۔ اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے ؎

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

شیخ بو علی سینا جب سلطان ابو سعید ابو الخیر سے ملا اور اپنی تحقیقات بیان کیں تو آپ نے فرمایا۔ "جو کچھ وہ جانتا ہے ہم دیکھتے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو اصطلاح تصوّف میں مشاہدہ، کشف اور الہام کہتے ہیں یہ قوت بعض انسانوں میں کامل اور فطری ہوتی ہے یہ لوگ انبیاء کہلاتے ہیں

بعضوں میں مشق اور ریاضت سے پیدا ہوتی ہے تاہم استعداد میں نہایت فرق مراتب ہوتا ہے اور اسی فرق مراتب کے لحاظ سے اولیاء کے طبقات قائم ہوتے ہیں۔ مولانا رومؒ نے اس ادراک باطنی کو مثنوی میں جا بجا نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ روح کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک جانور اور انسان دونوں میں مشترک ہے یہ روح حیوانی ہے۔ ایک وہ ہے جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے ؎

غیر عقل و جاں کہ در گاؤ خراست　　آدمی را عقل و جان دیگر است

اس سے بالاتر ایک روح ہے جو انبیا اور اولیا کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ انسانی روح سے اسی قدر بلند ہے۔ جس قدر انسانی روح، روح حیوانی سے بالاتر ہے ؎

باز غیر عقل و جان آدمی　　ہست جانے در نبی و در ولی

فلسفیوں کے نزدیک انسان کلی متواطی ہے یعنی تمام انسان، انسانیت کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ لیکن حضرات صوفیہ کے نزدیک انسان کلی مشکک ہے یعنی جس طرح سردی گرمی کے مراتب میں اختلاف ہے کوئی چیز نہایت گرم ہے اور کوئی کم۔ اسی طرح خود انسانیت کے مراتب مختلف ہیں انسان کی اصلی حقیقت ادراک اور تعقل ہے اس لئے جس میں زیادہ ادراک ہے وہ زیادہ انسان ہے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

جاں نباشد جز خبر در آزموں ہر کرا افزوں خبر، جانش فزوں

(جان صرف ادراک کا نام ہے اس لئے جس کا ادراک زیادہ ہے۔ جان بھی زیادہ ہے)۔

انسانیت کا اعلیٰ مرتبہ نبوت ہے۔ عام انسانوں میں اور انبیاؑ میں ہی فرق ہے جو مختلف حیوانات میں ہے۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک انسان نوع نہیں بلکہ جنس ہے اور اس کے افراد میں وہی تفاوت ہے جو جنس کے انواع میں ہوتا ہے۔ انسانوں میں یہ اختلاف مراتب اسی روح کی بنا پر ہے جو روح انسانی سے بالاتر ہے۔ کشف والہام اسی روح کا خاصہ ہے اسی بنا پر حضرات صوفیہ کے نزدیک جو علم قیاسات اور استدلالات سے حاصل ہوتا ہے، ہیچ ہے ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

گر به استدلال کار دیں بدے فخر رازی راز دار دیں بدے

جو معلومات استدلال اور قیاس سے حاصل ہوتے ہیں گو کتنے ہی یقینی ہوں شک اور احتمال سے خالی نہیں ہو سکتے۔ فلسفہ کے مسائل میں سخت اختلاف ہے اور دونوں طرف نہایت بڑے بڑے فلسفی ہیں، یہ رائیں اکثر باہم متناقض ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ دو متناقض مسائل میں سے ایک ہی صحیح ہوگا۔ یورپ اس درجہ کمال تک پہنچ چکا لیکن ہر فلسفی کی رائے

دوسرے فلسفی سے مختلف ہے بخلاف اس کے کشف اور مشاہدہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے قطعی ہوتا ہے اور قطعی ہو یا نہ ہو لیکن دل کو اس سے تسلی ہوجاتی ہے وہ طبیعت کو کامل سکون اور دل میں ایک مطمئن خوشی اور ذوق پیدا کرتا ہے جس پر خود یہ حالت طاری نہ ہو وہ اس علم (باطن) پر بھی طرح طرح کے شبہے قائم کرسکتا ہے لیکن کشف اور مشاہدہ کے بعد تمام شکوک اور احتمالات دفعتہً فنا ہوجاتے ہیں۔ عقل اور کشف کے فرق کو خواجہ حافظ نے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

آں ہمہ شعبدہ ہا عقل کہ مے کرد آنجا
سامری پیش عصا و ید بیضا مے کرد

جب یہ علم حاصل ہوجاتا ہے تو تمام ظاہری علوم حقیر اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں اور بیساختہ اس قسم کے الفاظ زبان پر آتے ہیں ؎

چند چند از حکمت یونانیاں   حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

جو علم استدلال سے حاصل ہوتا ہے صوفیہ اس کو عقلی کہتے ہیں اور جو علم مجاہدہ و ریاضت سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام عرفان ہے۔

کشف حقائق :۔ تصوف کی اصل یہی مسئلہ ہے تصوف کا دوسرا نام حقیقت ہے اور اسی بنا پر ہے کہ تصوف کی غرض و غایت یہی ہے اگرچہ تصوف کو براہ راست تمام اشیاء سے بحث نہیں یہ حکما کا کام ہے تصوف

کو صرف اس بات سے غرض ہے کہ انسان کا مطلوب اصلی کیا ہے؟ لیکن چونکہ اس نتیجہ تک پہنچنے اور اس کے حاصل کرنے کے لئے عام طور پر حقائق اشیاء سے بحث کرنی پڑتی ہے اس لئے یہ دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اس کو ایک خاص مثال میں سمجھنا چاہیئے مثلاً تصوّف میں عشق حقیقی کی تعلیم دی جاتی ہے یعنی یہ کہ جمال صرف شاہد حقیقی میں پایا جاتا ہے اس لئے وہ عشق و محبّت کے قابل ہے باقی جن اشخاص یا جن چیزوں کو ہم حسین و جمیل سمجھتے ہیں یہ واقع میں حسین اور جمیل نہیں یہ بات بظاہر خلاف عقل معلوم ہوتی ہے ایک حسین خوبرو یا ایک خوشنما پھول کے حسن کا کیونکر انکار ہو سکتا ہے؟ اس شبہ کے رفع کرنے کے لئے حسن وجمال کی عام حقیقت سے بحث کرنی پڑتی ہے اور ثابت کرنا پڑتا ہے کہ ان چیزوں میں اصلی جمال نہیں۔ اس طرح یہ بحث زیادہ وسیع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح تصوّف کی تعلیمات میں اکثر باتیں عام مسلمات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اسلئے حقائق اشیاء کی بحث تصوّف کا ایک مستقل عنوان ہوگیا ہے جس کو ہم اجمالی طور سے لکھتے ہیں:-

ا۔ تصوّف میں یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اکثر چیزوں کی نسبت لوگوں کا جو علم ہے وہ صحیح نہیں۔ حقائق اشیاء کے متعلق عام غلطیاں پھیلی

ہوئی ہیں جن چیزوں کو ہم جس طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں حقیقت میں اسطرح نہیں ہیں اس مسئلہ کی تلقین کے وقت علم تصوّف سفسطہ کے قریب آجاتا ہے یعنی ہر چیز کی نسبت شک پیدا کر دیتا ہے۔

غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ جو چیزیں بظاہر محسوس اور مشاہد اور زیادہ نمایاں ہیں وہ اصلی نہیں ہیں بلکہ اصلی وہ چیز ہے جو مخفی اور کم نمایاں ہے۔ مثلاً جب ہوا چلتی ہے تو ہم کو جو چیز آنکھ سے متحرک محسوس ہوتی ہے وہ خاک اور غبار ہے ہوا کو ہم بالکل نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ ظاہر ہے، کہ دراصل متحرک ہوا ہی ہے خاک میں اسی نے حرکت پیدا کی ہے۔

طبیعیات میں تمام مسائل کی بنیاد محسوسات پر رکھی جاتی ہے اس لئے اس میں زیادہ تر مصروف ہونے سے محسوسات کا اس قدر دل پر اثر چھا جاتا ہے کہ یقین ہو جاتا ہے کہ جو چیز محسوس نہیں وہ خیالی اور وہمی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ طبیعیات جاننے والے مجردات اور روحانیات کے منکر ہو جاتے ہیں۔ یہانتک کہ انکار کا یہ سلسلہ خدا تک پہنچتا ہے کیونکہ وہ اعلے المجردات ہے لیکن تصوّف میں سب سے مقدّم اور ضروری یہی مسئلہ ہے کہ ظاہری حس کا اعتبار نہیں۔ غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ خود محسوسات میں فرق مراتب ہے یعنی بعض چیزیں علانیہ مشاہد اور محسوس ہوتی ہیں بعض آثارات اور علامات کے ذریعہ سے اور بعض صرف دلائل اور نتائج سے

اور بعض صرف دلائل اور نتائج سے ثابت ہوتی ہیں اب اگر محسوس ہونے پر مدار ہوتا تو چاہیئے تھا۔ کہ جو چیز زیادہ محسوس ہوتی زیادہ اصلی ہوتی لیکن حالت برعکس ہے پھول آنکھ سے نظر آتا ہے لیکن اصلی چیز خوشبو ہے وہ نظر نہیں آتی۔ جسم زیادہ محسوس ہے لیکن اصلی چیز جان یا روح ہے جو نظر نہیں آتی۔ افعال اور اعمال علانیہ محسوس ہوتے ہیں لیکن جو چیز افعال و اعمال کا سبب ہے یعنی ارادہ یا فکر، وہ دیکھنے یا سننے کی چیز نہیں۔ الفاظ زیادہ محسوس ہیں لیکن اصلی چیز معنی ہیں جو کسی حاسہ سے محسوس نہیں ہو سکتے۔ غرض جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا محسوسات میں بھی وہی چیزیں اصلی وجود رکھتی ہیں جو کم محسوس اور مجرّد ہیں، اور جس قدر کم محسوس ہیں اسی قدر ان میں زیادہ اصلیت اور قوت ہوتی ہے ہوا آنکھ سے نظر نہیں آتی لیکن ہوا کا ایک طوفان عالم کو زیر وزبر کر دیتا ہے فکر اور ارادہ محسوس چیزیں نہیں لیکن دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے انہی کی بدولت ہوتا ہے آج کل علمائے طبیعیات محسوسات پر زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں معتزلہ کا بھی یہی حال تھا۔ اسی بنا پر حضرات صوفیہ ہر شخص کو جو مادہ پرست اور حاسہ پرست ہو معتزلی کہتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مادہ سے مجرّد ہونا حقیقی وجود ہے اور جس قدر زیادہ تجرّد ہوگا اسی قدر وجود حقیقی کا زیادہ ظہور ہوگا۔ چنانچہ

موجودات کی ترتیب یہ ہے کہ سب سے کم رتبہ جسم، اس سے بالا تر جان پھر روح پھر مجرد ذات پھر باری تعالیٰ۔

تمام موجودات پر غور کرنے سے یہ امر یقینی طور سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہر چیز کی دو حالتیں ہیں۔ حقیقی و مجازی۔ یا واقعی اور نمایشی اور تصوف کا تمامتر ماحصل اور منتہائے مقصد حقیقت کی جستجو اور حقیقت پرستی ہے یہی حقیقت پرستی خدا کا اذعان دل میں پیدا کرتی ہے۔ جب زیادہ غور سے نظر آتا ہے کہ موجودات کا وجود غیر مستقل ہے۔ عارضی ہے تغیر پذیر ہے تو اس وجود کی تلاش ہوتی ہے جو اصلی اور حقیقی ہو، ازلی اور ابدی ہو۔ اس یقین سے تمام فانی چیزیں بے حقیقت نظر آتی ہیں اور صرف ایک ذات واحد کی عظمت اور محبت دل میں پیدا ہو جاتی ہے ؂

ہر چیز کہ در جہاں اسکاں دیدم با او ہمہ ہیچ بود و بے او ہمہ ہیچ

ذات باری :۔ دہریے خدا کے منکر ہیں، سوفسطائیوں کو شک ہے فلسفی استدلال کے محتاج ہیں لیکن ارباب حال کے نزدیک استدلال کی ضرورت نہیں۔ تمام عالم، زمین و آسمان، آفتاب ماہتاب، ثابت، سیارے دشت و چمن، گل و خار، برگ و بار سب اس کی شہادت دے رہے ہیں، وہ پوشیدہ ہے لیکن اسی وجہ سے کہ بہت کھلا ہوا ہے۔ عطار ؂

اے ز پیدائی تو از بس ناپدید

بے شبہ وہ این و آں دونوں سے بالاتر ہے لیکن اس لئے کہ وہ ایک ہی ساتھ این بھی ہے اور آں بھی،

معرفت باری میں عقل بیکار ہے۔ عقل کے تمامتر ادراکات حواس کے مدرکات پر مبنی ہیں لیکن ذات باری حواس کے مدرکات سے بالاتر ہے اسی بناپر ارباب حال کے نزدیک عقل کے مدرکات ادنیٰ مرتبہ کی چیزیں ہیں۔

تزکیہ نفس اور مجاہدہ سے روح کو ایک ادراک غیبی حاصل ہوتا ہے۔ عرفان الٰہی کا یہی ذریعہ ہے اس کو علم باطن، مشاہدہ، القا، کشف وغیرہ کہتے ہیں اس سے بھی گو خدا کی ذات اور حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی کیونکہ وہ ہر حالت میں انسان کی دسترس سے بالاتر ہے لیکن صفات اور شیونات الٰہی کی تجلّیاں روح پر پڑتی ہیں اور ہر شخص بقدر استعداد عرفان کا مرتبہ حاصل کرتا ہے۔

روح اور روحانیات :۔ تصوف کی زبان اس سے زیادہ کسی چیز سے آشنا نہیں۔ روح کی نسبت ہمیشہ اختلاف رہا ہے ایک فریق بالکل منکر ہے جو معترف ہیں ان کو اس کی ماہیت اور حقیقت میں اختلاف ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

متکلمین : روح ترکیب عنصری سے پیدا ہوتی ہے اور مرنے کے ساتھ

فنا ہو جاتی ہے۔ قیامت میں جب دوبارہ جسم پیدا ہوگا تو روح بھی ساتھ پیدا ہوگی۔

حکمائے اسلام: جسم کے ساتھ پیدا ہوتی ہے لیکن پھر فنا نہیں ہوتی۔

اشراقیئین: قدیم ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

حضرات صوفیہ کے نزدیک روح ازلی اور ابدی چیز ہے لیکن وہ ایک جوہر واحد بسیط ہے افراد انسانی میں اس کا تعدد اس طرح ہے جس طرح آفتاب کا نور ہے جو تمام عالم میں چھایا ہوا ہے۔ لیکن جن چیزوں پر منعکس ہوتا ہے ان کے اختلاف حالت سے اس کی کیفیت اور صورت بدل جاتی ہے۔

انسان عالم کبریٰ ہے: حضرات صوفیہ انسان کو عالم اکبر کہتے ہیں۔ تمام عالم موجودات کی جو ترتیب بیان کی گئی ہے یہ ہے، جماد، نباتات، حیوان، انسان۔ اہل مذاہب اور بعض حکما ایک درجہ اور قرار دیتے ہیں یعنی مجردات (فرشتہ)۔ انہی موجودات کے مجموعہ کا نام عالم ہے حضرات صوفیہ کہتے ہیں کہ انسان جماد بھی ہے، نبات بھی، حیوان بھی، فرشتہ بھی، اور چونکہ کوئی مخلوق ایسی نہیں جو ان تمام مراتب کا مجموعہ ہو اس لیے انسان سب سے بڑا عالم ہے اسی بنا پر تصوف کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو بیرونی علوم و فنون کے سیکھنے اور عالم کے مشاہدہ کی ضرورت

نہیں۔ انسان خود ہی تمام عالم اور صانع عالم کا مظہر ہے وہ اپنے کو جان لے تو اس نے سب کچھ جان لیا۔

رسوم و قیود و بت پرستی :- انسان کے مدرکات چونکہ تمامتر حواس سے ماخوذ ہیں اس لئے وہ کوئی کام محسوسات کے سہارے کے بغیر نہیں کرسکتا۔ تمام مذاہب نے خدا کو بیچون و بیچگون مانا ہے لیکن تمام مذاہب میں بت پرستی یا بت پرستی کا شائبہ موجود ہے مسلمانوں سے زیادہ کسی مذہب نے تنزیہ کی تعلیم نہیں کی۔ یعنی یہ کہ خدا کو زمان و مکاں، فوق و تحت، سمت و جہت سب سے منزّہ سمجھا جائے لیکن عام مسلمان عرش و کرسی کے متعلق جو خیال رکھتے ہیں اور جس تخیل سے کعبہ کا طواف کرتے ہیں وہ بت پرستی کے اثر سے خالی نہیں۔ یہانتک کہ ان میں ایک خاص فرقہ پیدا ہو گیا جو خدا کو جسیم مانتا ہے محدثین بھی خدا کے جلوس عرش اور وجہ اور ید کے قائل ہیں صرف یہ کہتے ہیں کہ خدا کا منہ اور ہاتھ ایسے نہیں جیسے ہمارے ہیں۔

لیکن تصوف تمامتر تنزیہ ہے حضرات صوفیہ اگرچہ ہمہ اوست کے قائل ہیں لیکن وہ اسی شاہد حقیقی کے طالب ہیں جو تعین اور تشخص بلکہ اطلاق کی قید سے بھی آزاد ہے۔ صوفی کو حرم اور کعبہ سے انکار نہیں لیکن وہ جانتا ہے کہ یہ پسماندگان کی منزل ہے۔

رضا بالقضا :- یہ مقام، مقام عشق ہی کا اثر ہے عارف جب معشوق حقیقی کے نشہ میں چور ہوتا ہے تو اس کو دنیا کی مصیبتوں اور تکلیفوں کا احساس نہیں ہوتا بلکہ تمام حوادث اس کو شاہد حقیقی ہی کی ادائیں اور کرشمے معلوم ہوتے ہیں زہر بھی اس کو تریاق کا مزہ دیتا ہے

ابلیس و شیطان :- حضرات صوفیہ کے نزدیک عالم اکبر خود انسان ہے اور فرشتہ و شیطان خود اس کی قوت خیر و شر کا نام ہے۔ ع

در تو یک یک آرزو ابلیس تست

وحدۃ فی الکثرۃ :- حضرات صوفیہ چونکہ زیادہ تر مراقبہ اور مجاہدہ کرتے ہیں اس لئے اکثر عزلت اور گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں۔ کہ خیال کی یکسوئی میں فرق نہ آئے۔ لیکن جب عارف زیادہ ترقی کر جاتا ہے تو کوئی چیز اس کے اطمینان اور یکجہتی میں خلل انداز نہیں ہو سکتی زن و فرزند، اہل و عیال سب ہوتے ہیں مگر وہ کسی سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اس کو "وحدۃ فی الکثرۃ" کہتے ہیں۔

اشتراکی زندگی

مہذّب و متمدّن ممالک کے جمہور اپنے اپنے حالات کے مطابق مختلف قوانین، قواعد اور رسم و رواج پر عمل پیرا ہو کر اشتراکی زندگی گزارتے ہیں وہ ان قوانین وغیرہ کو منظم کر کے ان کے الگ الگ حصّے کر دیتے ہیں اور مختلف حصوں کو اشتراکی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے وسائل کار یا کام کے وسیلے بناتے ہیں۔ ظاہر ہے کوئی کام اسی وقت سر انجام پا سکتا ہے جب ہم اس کو کسی خاص ترتیب یا قاعدہ کے موافق کریں۔

اشتراکی زندگی میں انواع و اقسام کے مقاصد حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر مقصد مقتضی ہوتا ہے کہ اس کے لئے خاص قانون وضع کئے جائیں۔ اشتراکی زندگی میں جن جمہوری وسائل کار سے جمہور کو سابقہ پڑتا ہے انہیں انگریزی میں پبلک انسٹیٹیوشنز" PUBLIC INSTI TUTIONS) کہتے ہیں۔

اصول شہریت کے نقطۂ خیال سے وہی جمہوری وسیلۂ کار اختیار

کرنا چاہیئے۔ جو جمہور کے لئے سود و بہبود کا باعث ہو سکے۔ کیونکہ ایک جماعت اسی وقت خوشحال ہو سکے گی جب اس کا ہر فرد خوشحال ہو اگر انسانی جسم کا ایک عضو بیمار ہو تو تمام جسم بیچین ہو جاتا ہے۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

چو عضوے بدرد آورد روزگار ٭ دگر عضوہا را نہ ماند قرار

خدا نے ہر فرد واحد کو جماعت جمہور کا ایک مفید رکن بننے کے لئے پیدا کیا ہے لہذا ہر شخص کا فرض ہے کہ ایک کارآمد شہری بننے کے علاوہ دیگر شہریوں کو جمہور کے لئے مفید بننے میں ہر ممکن طریقے سے مدد دے۔

انگلستان کا ایک فلسفی کہتا ہے کہ " جمہور کا فرض ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد کے لئے زیادہ سے زیادہ خوشی و خرمی حاصل کریں"۔

جمہور کی بھلائی کے لئے عملی جمہوری وسائل کار کی ضرورت ہے جس وسیلہ کار سے تمام افراد کا مستفید ہونا ممکن ہو وہ شہریت کی رو سے اچھا وسیلہ ہوگا۔ جمہوری وسائل کار کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد وسیع حب الوطنی اور جذبۂ خدمت خلق پر رکھی جائے اور اس طرح اتفاق و اتحاد کی عالیشان عمارت بنائی جائے۔

اب مثال کے طور پر چند جمہوری وسائل کار کا ذکر کیا جاتا ہے :۔

ڈاک خانہ :۔ تمام مہذب حکومتوں نے اس وسیلۂ کار کو بڑی اہمیت دے رکھی ہے اور اسے فرائض ثانوی کا ایک ضروری جزو قرار دیتے ہیں۔ ڈاک خانہ کا وسیلۂ کار ہمارے لئے بہت باعث برکت ہے ہم اس کے ذریعہ سے نہ صرف اپنے عزیزوں اور دوستوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرتے ہیں بلکہ دنیا بھر کی خبریں سنتے ہیں۔ ڈاک خانہ ہماری ذاتی الفتوں کو تر و تازہ کرتا ہے اس سے دنیا کی تمام قومیں جو ایک دوسرے سے بہت دور زندگی بسر کرتی ہیں۔ تبادلۂ خیالات کر لیتی ہیں۔ ڈاکخانہ نے ذرائع آمد و رفت کے ساتھ مل کر دنیا کو ایک بڑا خاندان بنا دیا ہے۔

تار برقی :۔ تار برقی کا سلسلہ ڈاکخانہ کا ایک جزو ہے اور وہی خدمت بجا لاتا ہے۔ زندگی کے اس وسیلۂ کار کا انتظام حکومت کا ایک فرض ہے جو کام ڈاک خانہ دنوں میں کرتا ہے سلسلہ تار برقی منٹوں میں کر ڈالتا ہے یہ سلسلہ ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح خدا نے انسان کے دل و دماغ کو قدرت کے راز دریافت کرنے کی طاقت دی ہے۔

ریلوے :۔ ریلوے کا ایک ایسا جمہوری وسیلۂ کار ہے جس کی معاشرتی قدر و قیمت بے حد و بے شمار ہے اس سے مختلف مقامات کے مابین مسافتیں بہت چھوٹی ہو گئی ہیں، وقت کفایت شعاری کے ساتھ خرچ ہوتا ہے۔ دنیا کے لوگ ملکوں ملکوں کی سیر و سیاحت کرتے ہیں اور اس طرح غیر قوموں

کے اوضاع واطوار، رسم ورواج اور دیگر سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور دنیاوی ترقی کے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ طلباء اور صناع علم وہنر سیکھتے ہیں تو ملکی مدبر اور معاشرتی مصلحین دوسروں کے تجربوں سے اپنے ملک وقوم کو مستفید کرنے کی سبیل نکالتے ہیں ریلوے کے ذریعہ مذہبی تعصبات دور ہوجاتے ہیں لوگوں کی نظر، خیالات اور دل ودماغ وسعت پاتے ہیں۔ ریلوے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اناج، اشیائے خوردنی اور انسانی ضروریات کی دوسری چیزیں مختلف مقامات میں آسانی سے پہنچ جاتی ہیں اس سے زندگی کی دلچسپیاں بڑھتی اور ضرورت کے وقت قحط اور فاقہ کی مصیبتیں دور ہوجاتی ہیں۔

ریلوے کی تعمیر کا آغاز ۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں ہوا ۱۸۵۹ء تک ۵ ہزار میل سڑک بن گئی اور ۷۰ کروڑ روپیہ کا سرمایہ خرچ ہوا اور اس کی توسیع کا کام برابر جاری رہا۔ ۱۹۲۳ء تک وہ سرمایہ جو ریلوے کے انجنوں، سڑک، گاڑیوں اور عمارتوں وغیرہ پر صرف ہوا ۶۵۶ کروڑ ۴ لاکھ روپیہ تک پہنچ گیا اور ۳۵۰۲۹ میل لمبی سڑک پر ریل گاڑیاں چلنے لگیں۔

۱۹۲۳ء میں ۵ ارب ۵۰ کروڑ مسافروں نے ریل گاڑیوں میں سفر کیا اور ۸ کروڑ ۰۴ لاکھ ٹن مال ریلوے کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ

پہنچا۔ ہندوستان میں ریلوے کے مالکان دو قسم کے ہیں۔

۱۔ حکومت ہند۔

۲۔ سوداگروں کی کمپنیاں۔

صرف تین ریلوے یعنی نارتھ ویسٹرن ریلوے، اودھ روہیلکھنڈ ریلوے اور ایسٹ انڈین ریلوے حکومت ہند کی ملکیت ہیں حکومت کے اپنے ملازم ان کا انتظام کرتے ہیں اور ان کا مالی منافع حکومت ہند کے خزانہ میں جاتا ہے۔ باقی تمام ریلوے کے مالک سوداگروں کی کمپنیاں ہیں۔

اس وقت ریلوے کی سڑکیں تمام ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں تک پہنچتی ہیں اور حکومت ہند جہاں چاہے بلا دقت فوجیں بھیج سکتی ہے۔ غرض ریلوے اشتراکی زندگی کا ایک زبردست وسیلہ کار ہے۔

۱۸۳۷ء سے پہلے ہندوستان میں ڈاک خانہ کا انتظام انتہا درجہ کا غیر تسلی بخش تھا اس سال ڈاک کا ایسا سلسلہ جاری ہوا جس سے عوام الناس اور حکومت دونوں کو بہت فائدہ پہنچا اس وقت وزن اور فاصلہ کے لحاظ سے ڈاک پہنچانے کی اجرت لی جاتی تھی ریلوے کے جاری ہونے سے یہ صورت حالات بالکل تبدیل ہو گئی۔ آج ہندوستان کے

مختلف حصوں میں خط اور پارسل پہنچانے کی اُجرت ایک ہی شرح سے لی جاتی ہے۔ روپیہ اور قیمت طلب پارسلوں، وی پی پارسلوں کا بھی انتظام ڈاک خانہ کرتا ہے۔ غریب لوگوں کو روپیہ جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کی سہولتیں بھی پوسٹ آفس سیونگ بنک نے پہنچا رکھی ہیں۔ غرض حکومت کا یہ وسیلۂ کار ہزار برکتوں کا موجب بن رہا ہے۔

۱۹۲۳ء میں تیرہ ہزار سات سو پچاس لاکھ خطوط ہندوستانی ڈاک خانوں میں ڈالے گئے۔ اور ایک کروڑ چالیس لاکھ پارسل پہنچائے گئے۔

۱۹۱۴ء سے پہلے ہندوستان میں ڈاک خانہ اور تار برقی کے محکمے الگ الگ تھے۔ اسی سال انہیں ایک دوسرے میں شامل کر دیا گیا۔

سلسلۂ تار برقی کا آغاز ۱۸۵۱ء میں ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں اکانوے ہزار سات سو ساٹھ میل لمبا سلسلہ تار برقی موجود تھا۔ تار برقی کے ضمن میں سلسلۂ ٹیلیفون کا ذکر ضروری ہے۔ اس وقت ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ٹیلیفون رواج پا گیا ہے اب اکثر شہروں کے تاجر ایک دوسرے سے سیکڑوں میل کے فاصلہ پر ہونے کے باوجود گفتگو کر لیتے ہیں اس وقت قریباً تین سو مقامات پر ٹیلیفون کا انتظام ہو گیا ہے۔

الغرض ذرائع آمد و رفت کے لئے ریلوے اور ذرائع خط و کتابت و

پیغام رسانی کے لئے ڈاک خانہ اور تار برقی وغیرہ ایسے وسائل کار ہیں کہ ان کو مدنظر رکھ کر حکومت ہند کی مساعی کو قابل شکریہ ٹھہرا سکتے ہیں. جمہور ہند کا فرض ہے کہ حکومت ہند کے اس احسان کو کسی حالت میں بھی فراموش نہ کریں۔ ان وسائل کار سے پوری طرح مستفید ہونے کی کوشش کریں اور ان کی توسیع کے لئے حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

منظر گورستان

نسیم غفلت کی چل رہی ہے امنڈ رہا ہے، قضا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونیوالے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

دن کا ڈھلنا، سورج کا ڈوبنا، شام کا آنا، تاریکی کا پھیلنا، خفتگان خاک کے لئے آئے دن ایک نئی مصیبت اور ایک تازہ آفت کا سامنا ہوتا ہے۔ آہ، کسی مرادوں والے، کسی ناز و نعم سے پالے اور کسی ہزار منتوں سے پائے ہوئے تعویذ مزار پر ایک چراغ کا ٹمٹمانا جھلملانا، ستم شعار باد مخالف کے جھونکوں سے بجھتے بجھتے رہ جانا مرحوم صاحب مزار کے لئے اگر دل شکن نہیں تو اور کیا ہے،

سورج نے جلدی جلدی سفر کی منزلیں طے کیں، دونوں وقت ملے مگر شان معبود کہ یہ خفتگان خاک اب بھی ذرا اٹھ کر نہ بیٹھے، فراش قدرت نے ظلمت کا سائبان اطراف عالم پر پھیلایا۔ شام غریباں سیاہ پوش، گریباں چاک بادیدۂ غمناک آئی۔ مزار عزیباں پر حسرت و ارمان کی چادریں، اندوہ و حرماں کے پھول چڑھائے اور دلوں سے

داغوں کے چراغ روشن کئے۔ تمام رات بالین مرقد پر ایک چراغ ٹمٹماتا رہا۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم۔ ہاں کبھی کبھی خوفناک خونخوار درندوں کی آہٹ کبھی تند ہوا کی سرسراہٹ اور کبھی درختوں کی سائیں سائیں نے سناٹے کو توڑا۔

جب سپیدۂ سحر نیلگوں ورق مشرق پر نمودار ہوا وہ وحشت خیز خاموشی معدوم اور وہ دہشت ناک آوازیں مفقود ہوئیں، نسیم سحری کا دور دورہ ہوا۔ غنچے چٹکے، کلیاں شگفتہ ہوئیں اور خندۂ گل و گریۂ شبنم نے تصویر زمانہ کے دونوں رخ دکھائے ؎

ہوگئی ثابت دو رنگیٔ گلشن ایجاد کی
گل کو خنداں دیکھ کر، شبنم کو گریاں دیکھ کر

اہل دل خواب غفلت سے بیدار ہوا۔ عدم والوں کی یاد نے دل کو گرمایا۔ اٹھا کہ چند شفیق بزرگوں، چند باوفا دوستوں، چند گم شدہ عزیزوں کی ارواح کو خیر و برکت کے کلمے سنائے۔ ایک دردمند دل پہلو میں لے کر پہنچا مگر آہ ابھی ایک ہی نظر بھر کر دیکھا تھا کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا۔ اور خون کے آنسو رونے لگا ؎

خشک گل، افسردہ سبزہ، شمع چپ، بالیں اداس

جی بھر آیا عالم گور غریباں دیکھ کر

آہ، ڈراؤنی اندھیری رات کے وہ چند لمحے کیسے غم انگیز و عبرت خیز ہو نگے جن میں دو چار جگنوؤں نے جمع ہو کر کسی حسرت نصیب کی قبر پر بیٹھ اس کی بے سروسامانی اور بے بسی کے مضمون کو یوں ادا کیا ہو گا ؎

کچھ نہ کچھ گور غریباں پر بھی ساماں ہو گیا
چار تارے چرخ سے ٹوٹے چراغاں ہو گیا

اے مسجود حقیقی کے مہر بہ لب بندو! ہم کتنی بار تمہارے مشتاق ہو کر آئے۔ گھنٹوں تمہاری تربتوں کے سرہانے بیٹھے رہا کیے، مگر افسوس تمہاری شب ہجر خاموشی توڑے نہ ٹوٹی۔ آہ وہ جانسوز مایوسی وہ دلگداز ناامیدی کیونکر بیان ہو سکتی ہے جبکہ ہم مجبور ہو کر اٹھے اور یہ کہتے ہوئے اپنے غمکدہ کے راہ گیر ہوئے ؎

ملا نہ قافلہ رہروان ملک عدم
بہت تلاش کر آئے، بہت پکار آئے

ساکنان عدم کے مشتاق ہمدم! ناامید ہو کر نہ اٹھ، مایوس ہو کر نہ جا۔ سن مگر گوش ہوش سے سن۔ کہ یہ لب بستہ خاک نشین ان سوراخوں میں سے، ان روزنوں میں سے جو سیل زمانہ کی تباہ کن موجوں

نے جا بجا ان کی قبروں میں پیدا کر دیئے ہیں۔ صبر و رضا اور تسلیم و توکل کے مفہوم کو کس طرح ادا کرتے ہیں۔ وہ دھیمی دھیمی آوازیں ۔۔۔

ہوئی دل سے ہوس راحت دنیا معدوم
راس آیا ہے بہت قبر کا کونا ہم کو
رحمت ایزد غفار پہ کر کے تکیہ
خشت بالیں ہے ہمیں خاک بچھونا ہم کو

اے خودی سے معمور خود سر خاکی پتلے! دل کو درد مند اور کانوں کو نصیحت نیوش بنا لے۔ انسان ہو جا اور بندۂ فرماں پذیر بن جا، قبل اس کے کہ تیری خاک سطح زمین پر جاروب کشی کرتی ہوئی اٹھے اور یہ کہتی ہوئی آسمان کی راہ لے ؎

مر کے یاد آیا کہ تصویر خیالی تھا جہاں
کھل گئیں آنکھیں مری خواب پریشاں ہو کر

ساکنان عدم کی سیدھی سادی زندگی! تیرے جینے کا اندازہ بھی نرالا ہے۔ تیری ضروریات چند، تیری حاجتیں محدود، تیری خواہشیں محدود، مگر آہ! اے آسیا گردار ہستی! پھر بھی تجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔
گھروں کے چراغ گل کر جانے والی ہستیو! تم سیکڑوں امیدوں کا مرکز تھیں۔ ہزاروں ارمان تمہارے دامان حیات سے وابستہ تھے۔

لاکھوں حسرتوں کی زندگی تمہارے دم سے تھی مگر افسوس ایک تمہاری سلک زندگی کا رشتہ ٹوٹتے ہی تمام آرزوئیں، ساری تمنائیں کل امیدیں سب حسرتیں موتیوں کی طرح بکھر کر دانہ دانہ ہوگئیں۔ تم بہت جلد اور بے وقت مقبول خدا ہوئیں۔ دیکھنا اپنی یاد سے ہمیں غافل نہ سمجھنا ہمارے آنسو تم تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہماری آہوں کی رسائی تم تک نہیں ہوسکتی۔ تمہاری تنہائی کا علاج، تمہاری پریشانی کا درمان تمہاری خستگی کا چارہ، ہمارے بس میں نہیں۔ مگر آہ! ہماری تشنہ دیدار آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں۔ اور تمہاری یاد کے ہر قطرہ کے عوض دریا بہا دیتی ہیں ؎

قید میں یعقوب نے گولی نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہوگئیں

بیدرد زمانہ کے ہاتھوں سے مٹی ہوئی سی مورتو! آؤ آؤ ہمارے تصور کے تصویر خانہ کی زینت بن جاؤ۔ ہاتھ پھیلا کر آؤ کہ تمہیں کلیجہ سے لگالیں۔ تادم واپسیں تمہارا کلمہ پڑھیں اور تمہاری ہی یاد سے لبریز دل لئے ہوئے مٹی میں مٹی ہوجائیں۔

مہر و وفا کی مبارک و مقدس دیویو! تمہاری خواب و خیال زندگانیاں تمہاری خستہ و شکستہ قبریں اور تمہاری بوسیدہ ہڈیاں ہمیں انسان بنا

گئیں۔ تم گذر گئیں مگر تمہاری یاد ہم پر واجب اور تمہاری پرستش ہم پر ضرور ہو گی۔

جوش بہار میں خزاں دیدہ پھولو! جتنا تم پر روئیں اتنا ہی کم ہے تم ایک ایسے تبسّم کے ساتھ جو کسی طرح ایک رقص شرر سے زیادہ طویل نہ تھا عالم کے راہی ہو کر خلد آشیاں ہو گئے مگر تمہیں کیا خبر کہ کتنے باغبانوں کی منتظر آنکھیں نرگس آسا کھلی کی کھلی رہ گئیں اور کتنی مصیبت زدہ بلبلوں کے آبگینے چور چور ہو گئے۔ تم دنیاوی حوادث اور کشمکش زمانہ سے چھوٹ کر ہمیں تڑپتا چھوڑ گئے لطف خداوندی کا واسطہ ہماری بیقراری اور ہمارے آنسوؤں کی قدر کرنا جب تک غنچۂ فنا شگفتہ ہو اور ہست و نیست کے وہ ذخار سمندر حکم خدا سے آپس میں بغلگیر نہ ہو جائیں۔

فضائے آسمانی میں پرواز کرنے والی روحو! ہمارے سلام کا تحفہ قبول کرو تم ہمارے لئے شمع ہدایت بنیں۔ تازیانۂ عبرت بنیں۔ خدا تم کو ابد الآباد تک شاد و شاداں رکھے۔ اور رحمت ایزدی کے دشت بے پایاں کا دامن عاطفت تمہاری جائے قرار ہو۔ آمین!

حیات اور موت

کے

(راز کا نظارہ بیسویں صدی کی روشنی میں)

بردلے زاہد خود بیں کہ زچشم من و تو　　راز ایں پردہ نہانست و نہاں خواہد بود

جس طرح یورپ کے جانباز برلن، پیرس اور صوفیہ کے زیر و زبر کرنے میں اپنی مستعدی اور فراست کا ثبوت دے رہے ہیں، کرپ کی توپوں کا تماشا کر رہے ہیں۔ ہوائی جہاز اڑا رہے ہیں۔ بے تار برقی سے کام لے رہے ہیں اور ممالک کو روندے ڈالتے ہیں اسی طرح قیاسات اور خیالات کی دنیا پر بھی ان کی چڑھائی ہے اور نئی نئی موشگافیاں حیرت انگیز ہو رہی ہیں۔ کیسے کیسے تارپیڈو کے جال ڈالے جا رہے ہیں اور کہاں کہاں کی سرنگیں دلیلوں اور تجربوں کی بارود سے اڑائی جا رہی ہیں یہ سب تماشے مغرب کے آئے دن کے حالات میں معلوم ہوتے ہیں۔ حال میں چوتھی ستمبر کو برٹش ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ میں پروفیسر شافر صاحب کی صدارتی تقریر سے علمی دنیا میں ایک ہلچل سی پڑ گئی ہے۔ اس سے حیات اور موت کے راز پر وہ روشنی پڑتی ہے جو بیسویں صدی میں

ہم کو دکھائی دے رہی ہے یہ روشنی کہانتک رہنمائی کرتی ہے اس کا حال آئندہ معلوم ہوگا۔ اس وقت پہلے ہم پروفیسر شافر صاحب کے نوٹ نمبروار لکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر کچھ سرسری اقتباسات اور رائے زنی بھی ہے۔ پروفیسر شافر صاحب فرماتے ہیں:۔

۱۔ زندگی یا حیات کی جامع و مانع تعریف ابتک نہیں ہوئی ہے ہربرٹ اسپنسر سے فلسفی کو اپنی کتاب "اصول علم حیات" میں حیات کی تعریف مرتب کرنے میں بہت دقت پیش آئی۔ یعنی ایسے جامع و مانع الفاظ نہیں ملے جس سے تمام اشیاء نمو حیات کا احاطہ کیا جا سکتا اور ساتھ ہی جتنی چیزیں بیجان مانی گئی ہیں وہ دائرہ ذی حیات سے نمایاں حیثیت سے خارج ہوتیں اور بالکل علیحدہ سمجھی جاتیں۔

۲۔ زمانہ سلف میں جاندار اور بے جان چیزوں جس قدر فرق بین تسلیم کیا جاتا تھا اب اتنا فرق زمانہ حال کی تحقیقات اور موجودہ انکشافات سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔

۳۔ "حیات" کیا چیز ہے؟ یہ دراصل مادہ قدیم کے حل ہونے پر معلوم ہوسکتا ہے کہ جدید تحقیقاتوں سے بیجان اور جاندار چیزیں ایک ہی رشتہ قانون میں منسلک پائی گئی ہیں۔ اس لئے "مادہ" اور "حیات" دو چیزیں نہیں ہیں۔

۴۔ عام خیال یہ ہے کہ سرچشمۂ حیات کی محرک کوئی مافوق العادت قوت ہے جس کی تائید کسی اصول یا مشاہدہ اور تجربہ سے نہیں ہوتی "حیات" کا مخرج وہی بے جان مادہ ہے جس نے رفتہ رفتہ دور ارتقائی کے منازل طے کر کے جاندار اشیاء کی صورت اختیار کر لی ہے۔

۵۔ جاندار چیزوں میں "نقل و حرکت" "نشو و نما" "ہاضمہ و جاذبہ" اور "تخلیق" کی قابلیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہی باتیں اکثر بیجان چیزوں میں بھی دیکھی جاتی ہیں۔ وہ دن قریب ہے کہ جب کیمیائی ترکیبوں سے ہم اپنے ہاتھوں "حیات" تیار کر لیں گے۔ اور مسئلہ تعریف حیات ایک معمائے لاینحل نہ رہ جائے گا۔ تھوڑا سا تیل اگر کاغذ پر گرا دیا جاتا ہے تو وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل و حرکت کر کے پہنچ جاتا ہے۔ بلور کا ٹکڑا نشو و نما کے بدیہی آثار ظاہر کرتا ہے وہ بڑھتا ہے اگر اس کی غذاء کیمیائی کافی طور سے پہنچتی ہے تو دوسرا ٹکڑا بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ مرغی کے انڈے میں بھی کیمیائی حرارت پہنچا کر جان پیدا کر لی جاتی ہے اس لئے ظاہر ہوا کہ مراحل ہست و نیست میں خاص خاص کیمیائی ترکیبیں جاری و ساری ہیں اور جاندار و غیر جاندار میں بمشکل کوئی حد فاصل قائم کی جاسکتی:

ہے۔

۶۔ کچھ زمانہ ہوا علمی تجربے کے واسطے ایک مینڈک پکڑا گیا تھا اور جب اس کو مار ڈالا گیا تو پھر ایک سال بعد دیکھا کہ مینڈک کے خون کے سفید ذرّے یا مینڈک کے خون کی پھٹکیاں "حیات" کے ذرات کے ساتھ باقی رہیں اسی طرح اور تجربوں سے معلوم کیا گیا تھا ایک "حیات" یعنی مادۂ ہیجان کی ایک لطیف اور اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ "صورت" دراصل مجموعہ ہوتی ہے بہت ساری ذی حیات پھٹکیوں کا جن میں سوراخ ہوتا ہے۔ بلکہ دیکھا گیا ہے کہ آدمی کے مرجانے کے بعد اس کے جسم کے اندر یہ جاندار پھٹکیاں مدتوں بیجان نہیں ہوتیں اسیطرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آدمی کا جسم گویا انہی کروڑوں پھٹکیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور یہی "حیات" بخش ذرائع ہستی انسان کے ہیں حیات کے چھتے یا خانہ میں کاربن (کوئلہ کا جزو) ہائیڈوجن (وہ ہوائے لطیف جو پانی کے ترکیبی اجزا سے ہے) آکسیجن (ایک عنصر ہوائی جو زندگی اور روشنی کا ممد ہے) نائٹروجن اور فاسفورس کی آمیزش پائی جاتی ہے اور کولرائڈ سوڈیم (اجزائے سوڈا) میگنیشیا کا نمک کیلشیم کا نمک پوٹاشیم اور لوہا بھی ضمیمہ کے طور پر ممد حیات خانہ ہوتے ہیں۔

۷۔ بعض اہل الرّائے جماعتیں کہتی ہیں کہ کسی سیّارہ کی بدولت "حیات" کا ظہور ہوا۔ لیکن یہ پتہ نہیں کہ کن سیّاروں میں کہاں اور کب ایسے تغیرات واقع ہوئے ہیں اور اب ایسے انقلابات کہاں اور کس طرح جاری ہیں۔ ہاں یہ تو ہے کہ سیّارے بھی مادہ کی ارتقائی صورت جدید ہیں۔

۸۔ اکثر جگہ سوال زیر بحث یہ رہا کہ کیا "حیات" کا لازمی نتیجہ موت ہے۔ بعض محققین کا جواب ہے کہ بیجان ہونے کا فعل ایک بے ضابطگی کا نتیجہ ہے اور کم سے کم اصولاً (اگر عملاً نہیں) تو ضرور کسی حد تک موت سے چھٹکارا بھی ہو سکتا ہے۔ درحقیقت نسلاً بعد نسلٍ ارتقا اور احتیاط کے ساتھ حیات کی بھٹکیاں درازی حیات کی ممد بنائی جا سکتی ہیں مگر حیات انسانی کا زمانۂ غیر محدود تک دراز ہونا کسی صورت سے نہیں پایا جاتا۔ اس لئے کہ حیات کے خانے رفتہ رفتہ بوسیدہ ہو جاتے ہیں اور موت کے پیامی بن جاتے ہیں۔ ہاں پیش بندیوں اور استعمال ادویات سے اوسط عمر میں کچھ ترقی حاصل ہو سکتی ہے بالآخر یہ قانون اٹل رہے گا کہ "تمام چیزیں جو زندہ ہیں یا پائی جاتی ہیں ان کو مرنا ضروری ہے اور نظام قدرت سے گزر کر قدامت اور ابدیت میں انہیں جانا ہے"۔

۹- ابھی وہ زمانہ بہت دور ہے کہ ترکیب کیمیائی سے ایک جیتا جاگتا آدمی بنا لیا جائے مگر آغاز حیات اور سرچشمۂ حیات کی ابتدائی صورت کے اجزا نہایت صاف اور آسان ہیں جن سے رفتہ رفتہ موجودات کی گوناگوں ساخت دور ارتقائی کی بھٹی میں پڑ کر ہمیں نظر آتی ہے اور یہ اجزا صرف حیات ہی نہیں بلکہ قابلیت رکھتے ہیں کہ اور جاندار چیزیں بھی ان سے جسم اور رنگ و بو اختیار کر سکیں۔

ایک سرسری نظر

میان او کہ خدا آفریدہ ست از ہیچ دقیقہ الیست کہ ہیچ آفریدہ نکشادست

ایک زمانہ کے فلسفی اور محقق اس گتھی کو سلجھانا چاہتے ہیں کہ زندگی کیا چیز ہے؟ روح کیا شے ہے؟ اور موت کیا جاودانی معدومیت کا نام ہے یا ایک عارضی خواب شیریں کو موت کہتے ہیں جس کی صبح خنداں وادی فردوس میں بقا کے رنگ میں نمایاں ہوگی۔ ہاں اقوام عالم نے اس خارستان میں اپنے اپنے وقت میں بڑی بڑی کاوشیں کی ہیں۔ ہزاروں گھاٹیاں لاکھوں منازل اور کروڑوں بحر ذخار طے کر کے رکھ دیئے ہیں لیکن جب بغور دیکھا تو یہ مسائل سراب ریگستان کے مانند دور اور بہت دور منزل منزل کامرانی سے پڑے ہیں اور اپنی طرف پہلی سی نایابی اور دلکشی

سے پھر متلاشیوں کو اپنے قریب بلا رہے ہیں۔ افسوس کہ یہ لوگ پھر اس طائر خستہ جان کی طرح اپنا سر دھنتے اور اپنی جان گنواتے ہیں جو لاکھوں کوس سمندر بے پایاں کا سفر کر کے شام کو دور سے روشنی کے مینار سے گزر کر اس جانب وادی سکون کے واسطے بیتاب رہتا ہے مگر اس کا کام یہیں تمام ہو جاتا ہے اسی طرح آج پھر زمانۂ حال میں سائنس کے جامہ میں آکر محققوں اور فلسفیوں نے راز حیات اور راز موت کی اصلیت دریافت کرنے میں غیر معمولی جد و جہد کا ثبوت دیا ہے وہی مسائل ہیں جو لاکھوں مرتبہ زیر بحث رہ چکے ہیں۔ وہی دلیلیں ہیں جن کو سنتے سنتے جی گھبرا گیا ہے گو الفاظ اور مطالب کے ظاہر کرنے کا اسلوب دوسرا ہے۔ لیکن باتیں سب وہی ہیں جو ہم سے پہلے کی نسلیں ہم کو گونگو طریقہ سے وراثت میں دے گئی ہیں ؎

گرچہ قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس ورثۂ علمی کے زور اور بل پر ہم بھی اس پردۂ اسرار کو چاک کرنا چاہتے ہیں جو حیات اور موت کے درمیان واقع ہے تازہ اُپج یہ ہے کہ اجزاء بیجان سے مادہ حیات پیدا کیا جائے اور قدرت کا راز بستہ فاش کر دیا جائے۔ وارفتگان حقیقت اشیاء کو ڈارون کا وہ زمانہ یاد

ہے کہ جب اس نے مسئلہ ارتقا کو دنیا کے سامنے پیش کر کے کہا تھا۔ کہ انسان کا ہیولیٰ حیوان کے ترقی یافتہ ڈھانچہ سے بنا ہے اس وقت سے اس وقت تک یہ امر کہ جاندار اور غیر جاندار میں کونسا آخری رشتہ یا سلسلہ ہے جس کے ٹوٹنے کے بعد فنا پذیر حیوان انسان کے جامہ میں نمودار ہو جاتا ہے دریافت نہ ہو سکا اور مسئلہ ارتقا ایک قیاس قریب المحال نظر آرہا ہے اس وقت حیات کا ایک غیر جاندار شے سے پیدا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابھی تو اشیاء میں کیمیائی اور برقی آثار کا صرف وجود ہم کو معلوم ہوا ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ حیات ان اجزاء کیمیائی کے اتصال سے پیدا ہو جاتی ہے یا ایک دوسری چیز ہے جو روح بن کر کام کرتی اور منبع اسرار گوناگوں ہے کسی حکیم مطلق کے اشارہ سے حلول کر جاتی ہے۔

ہم مان لیتے ہیں کہ جاندار اور غیر جاندار میں حد فاصل حائل نہیں ہے اور دونوں صورتوں میں حیات کے خانے اور اجزاء ترکیبی یکساں ہوتے ہیں لیکن پھر بھی حیات کیا چیز ہے اس کا جواب نہیں ملتا۔ کیونکہ انسان کے مرجانے کے ۱۸ اور ۲۴ گھنٹے بعد تک بھی حیات کے خانے جسم کے اندر جاندار پائے گئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "حیات" کوئی اور چیز ہے۔ جو ان نام نہاد فرضی زندگی بخش خانے کے علاوہ جاری و ساری رہتی ہے اور اس کے جاتے ہی انسان بیجان رہتا ہے چاہے اس کے جسم کے اندر یہ

دریافت شدہ حیات خانے بیشمار کیوں نہ پائے جائیں۔
پروفیسر شافر کا یہ کہنا کہ غیر جاندار سے ہم حیات کیمیائی بنالیں گے محض ایک دعویٰ کی صورت رکھتا ہے ابھی ہمیں اس دعویٰ کی دلیل اور اس کی کامیابی کا امتحان کرنا ہے کیونکہ جسے عام طور سے زندگی یا حیات کہتے ہیں اس کی خاصیت سے ہے کہ وہ نشوو نما کی قوت بھی رکھتی ہے۔ اور اس سے سلسلہ مزید پایا جاتا ہے ابھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس مصنوعی کیمیائی حیات کو یہ بات نصیب ہو گی یا نہیں۔ عالمان سائنس کا تو یہ معمول ہے کہ :۔ "جب ایک دلیل یا سبب انہیں مفید مطلب مل جاتا ہے تو پھر وہ ایک ہی واقعہ کے واسطے دو دلیل یا دو سبب کبھی نہیں تلاش کرتے"۔ اب اس وقت نیا قیاس تخلیق حیات کا پیدا ہو گیا ہے تو اس وجہ سے جو بات ملے گی وہ اسی طرف توڑ مروڑ کے پھیری جائے گی۔ اور کچھ زمانہ تک اس چکر میں عقل، فلسفہ اور مشاہدہ کو حیران کرنے پر تلے رہیں گے جس طرح اس سے پہلے بھی یہ خبط تھا کہ انسان ذرات سے مرکب ہے اس زمانہ میں ہر چیز میں ذرات دکھائی پڑتے تھے پھر ایک قیاس یہ روشن کیا گیا کہ ہر مرض، ہر حیات نما چیز کے کیڑے اور کیڑیاں ہیں اور اب کچھ زمانہ تک ہر چیز میں کیڑے اور کیڑیاں تلاش کی گئیں جب اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو روس کے پروفیسر کے تجربہ فاگو سائٹ (یعنی انسان

کے جسم میں صحت کی سفید کیڑیاں بےشمار ایک چھتے کی صورت میں حرکت کرتی اور مرض کی کیڑیوں کو ہضم کرتی جاتی ہیں، پر دماغ سوزی ہونے لگی۔ غرض یہی الٹ پھیر پہلے بھی تھا اور اب بھی وہی ہے۔ جس رنگ کی بحث ان صفحات میں پیش نظر ہے اس قسم کی بحث کئی بار یورپ میں دیکھی اور سنی گئی ہے۔ مثلاً لارڈ کلون نے بیان کیا کہ میں اس کو نہیں مانتا۔ کہ سائنس ایک خالق کے وجود کے بارہ میں ہاں یا نہیں کچھ نہیں کہتی بلکہ سائنس صریحاً تسلیم کرتی ہے کہ ایک پیدا کرنے والی قوت یا طاقت ہے

اب ہم "موت" پر ایسٹ اینڈ وسٹ کے ایک فاضل نامہ نگار کی تحریر کا یہ فقرہ کہ :-

"موت سے ہم کیا مراد لیتے ہیں۔ اس کا فیصلہ اس پر ہے کہ ہم پہلے زندگی سے کیا مراد لیتے ہیں"۔ پیش کر کے پروفیسر شافر کے مذکورہ بالا بیانات کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حیات خانے بوسیدہ ہوتے ہیں تو موت واقع ہوتی ہے حالانکہ موت کے بعد بھی حیات خانے جسم کے اندر گرم پائے گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیات خانے گو اجزاء حیات کے ممد و معاون ہوں لیکن صرف وہی حیات کے قائم رکھنے والے نہیں ہیں بلکہ کچھ اور پوشیدہ قوت یا روح ہے جو جسم کو زندہ رکھتی ہے پروفیسر شافر خود مانتے ہیں کہ جتنی چیزیں ہیں وہ ضرور فنا ہونگی۔ اگر

مادۂ قدیم کا سارا ظہور کائنات میں مان لیا جائے تو سوال ہوتا ہے کہ مادہ کی عادت میں قدامت داخل ہے اور وہ فنا نہیں ہوتا تو پھر اس کی ساختہ پرداختہ چیزوں کو بھی فنا نہیں ہونا چاہیئے اور چونکہ وہ فنا ہوتی ہیں یعنی صرف ہیئت ہی نہیں بدلتیں بلکہ اصلیت تک جوان سے انسان میں منتقل ہو کر مبدل ہو جاتی ہے تو اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مادہ مجبور ہے اور وہ اسی مٹی کی طرح ہے جو کمہار کے چاک کے پاس پڑی رہتی ہے جس سے وہ برتن اور کھلونے بنا بنا کر پھینکتا جاتا ہے اگر برتنوں کو علم بھی ہو جائے کہ فلاں مٹی کے بنائے جا رہے ہیں تو کیا ان کی مجال ہے کہ چاک سے سرتابی کر سکیں۔

ٹینیسن لکھتا ہے کہ ہمارا علم مثل اس ابابیل کے ہے جو اوپر سے جھیل کو دیکھتی ہے صرف اس کے سطحی سایہ کو دیکھتی ہے لیکن وہ پانی کے عمق میں کبھی نہیں ڈوبی ہے یعنی اسرار کے عمق در عمق میں کبھی نہیں چونچ ڈبوئی ہے ایک دوسرا فلسفی لکھتا ہے کہ کیا انسان کی جیاسی آنکھ اس قابل ہے کہ وہ خالق کی قدرت اور حکمت کو تمام و کمال دیکھ سکے کیا اس نے بہت سی چیزیں ایسی نہیں بنائی ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکتے. کیا سب ہی چیزیں ہم پر آشکارا کر دی ہیں بے شمار قوتیں ہماری دنیا میں اور ہمارے ارد گرد کام کر رہی ہیں جن کا علم ہم کو مطلق نہیں ہے. غرض

ہر صبح سائنس کے لئے ایک محشر ستان اسرار لامتناہی ہے ہر مشاہدہ اور تجربہ کاہل ایک قوت عجیبہ کے گوناگوں احکام اور اس کے طرز و انداز کا مظہر بن کر انسان کی بے بضاعتی کے نشان بنانے والا ہے لاکھوں سورج، کروڑوں چاند اور پدموں کرۂ ارض ہماری نظروں سے اوجھل اس کی قدرت سے ترساں اور لرزاں چکر میں ہیں اور خود ہر انسان کی زندگی ایک ضابطۂ حکمت نامعلوم ہے جس کے راز سے کسی کو خبر نہیں۔ مغرب اور مشرق اب بہت جلد سائنس اور علوم عینیہ سے دیکھنے والے اور یقین کرنے والے ہیں کہ ایک عالم اور ہے جہاں من و تو کی قید، وقت ساعت اور زمانہ کی بندش مربع مستطیل اور مسطح کی صورت، گرم و سرد اور باد و باراں کی مجبوری اور تمام مادی نفس کے عارضی دکھاوے اور تماشے بالکل ہیچ اور لچر و پوچ ہیں اور وہ عالم روحانی ہے اور وہیں دور ارتقائی سے بھی ہمیں جانا ضروریات سے ہے ؎

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل

گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

اخوّت و مُساوات

دَورِ حاضرہ اور مسئلہ مساوات

انسانی مساوات آج تمام مہذّب دنیا میں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ سیاسی ارباب صحافت انسان اور اس کے حق مساوات پر بلند آہنگی اور شعلہ خیزی کے ساتھ اپنا زور تحریر و خطاب صرف کر رہے ہیں۔

امریکہ کے مشہور صدر جمہوریہ ولسن نے ۱۹۱۸ء کے صلحنامہ ورسیلز میں ایک فقرہ یہ بھی بڑھایا تھا کہ :-

"بنی نوع انسان کو متمدّن و شائستہ بنانا تہذیب کا مقدّس فرض ہے اور یہ اسی وقت بوجہ احسن ہو سکتا ہے جبکہ ان کو مساوات اور حرّیت کے حقوق سے روشناس کرایا جائے"۔

جوں جوں دنیا کے بین الاقوامی تعلقات میں وسعت پیدا ہو رہی ہے مدبّرین مساوات عامہ کے اصول کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اس وقت دنیائے تہذیب جدیدہ کی بھی وہ فضا ہے جسے دیکھ کر انگلستان کے

مشہور ادیب اور نقاد برنارڈ شا کو تمام یورپ کے مشرف باسلام ہونے کی پیشینگوئی کرنی پڑی۔ ممالک یورپ کی موجودہ تاریخ سیاست کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کے سکون وجمود کا اس وقت خاتمہ ہوا جبکہ لوتھر نے اسلامی اصول مساوات کو ایک حد تک عیسوی تعلیم میں داخل کیا اور اس کا یہ اعلان کہ حکومت کے لئے موروثی بادشاہت کی اور کلیسا کے لئے مخصوص اسقف کی ضرورت نہیں، تمام یورپ میں شور محشر ثابت ہو گیا۔ جبر و استبداد کے خلاف انقلاب فرانس کا وہ خونیں اور جگر خراش ہنگامہ جس نے تمام عالم میں سنسنی پیدا کر دی وہ روسو اور والٹیر کے اسلام سے اخذ کردہ اصول ثلاثہ حریت، اخوت، مساوات کی اشاعت کا نتیجہ تھا۔

اہل روس کو زار کے جبر سے اس وقت نجات ملی جبکہ لینن نے ان کو تقاضائے مساوات پر ابھارا۔ یورپ کے علمبرداران حریت جس مساوات کی آج تبلیغ کر رہے ہیں تمام دنیا جانتی ہے کہ آج سے تیرہ سو سال قبل اسلام نے اس سے بہتر نصب العین کو پہلے پہل دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کیا۔

انسان اور مساوات

فطرت انسانی مساوات کی متقاضی ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق

مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ گو نوع انسانی میں ایک بین فرق قوم، رنگ، مذہب، زبان کا بظاہر نظر آتا ہے مگر حقیقتاً انسان کا نشو و نما اس کے دماغی محرکات اور اس کی فطرت ہر مکان میں ہر زمان میں ہے ایک ہی رہی ہے۔ ظاہری اختلافات جن کی وجہ سے ان کو مخصوص فرقوں اور گروہوں میں منقسم کر دیئے ہیں ان کی فطرت ہرگز نہیں بدل سکتے اب تک جس قسم کا ارتقا انسان کی جسمانی حالت میں ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ موجودہ گروہ انسانی پوری طرح متاثر ہوئے۔ انسان کی فطری و دماغی حالت یکساں واقع ہوئی ہے اگر کوئی شخص کسی چیز کا موجد ہے اور دوسرا نہیں ہے تو یہ اس کے دماغ کی فطری و پیدائشی قابلیت کا قصور نہیں بلکہ خارجی عوارض یا اثرات کی وجہ سے ہے۔ اگر بیرونی اثر و ماحول کی وجہ سے کسی کا دماغ کوئی کام نہیں کرتا تو اس کو انسان کی قابلیت و عدم قابلیت پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی دوسری وجوہات ہیں پس انسان کی زندگی یکساں ہے اور یہاں جو اصول کارفرما ہے وہ وقت و مقام کا فرق ہے۔

غرض ہر انسان ناطق و باشعور ہے محتاج اکل و شرب ہے، لباس و مکان کا ضرور تمند ہے اجتماعی طریقہ پر اپنی ضروریات کے حصول پر مجبور ہے اپنی مدافعت ذاتی کا تجربہ رکھتا ہے خواہ وہ افریقہ کا سیاہ

فام حبشی ہو یا یورپ کا سفید فام گورہ علم و تہذیب و دولت اکتسابی امور ہیں اور ہر انسان مساوی طور پر ان کا مدعی ہے اسلام نے اسی اصول مساوات کا اعلان کیا ہے۔

دوسرے مذاہب حقیقی مساوات سے خالی ہیں

تمام دنیا کے مذاہب نے مساوات کا کوئی قطعی اصول پیش نہیں کیا یہودیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے عیاں حقوق و مراتب مل جانا نسل و خون قائم ہیں مثلاً یہودا کی نسل سے جو لوگ ہیں ان کا مرتبہ بلند تر ہے دوسرے خاندان کے اسرائیلیوں سے۔ چنانچہ معابد و کلیساؤں میں نشستوں کی تخصیص بلحاظ مراتب ہے عیسائیوں میں بھی جو طبقہ خالص اسرائیلیوں کا ہے ان کے مراتب و حقوق بھی بلند تر ہیں دوسرے خاندان کے مسیحائیوں سے واضح رہے کہ ان دونوں مذاہب کے مقدس بانیوں نے اعلان کیا تھا کہ ہم صرف بنی اسرائیل کے نجات دہندہ ہیں جن مذاہب کا مطمح نظر صرف ایک قوم یا ملک کے لئے محدود ہو تو پھر انسانی مساوات ہی معدوم ہو جاتی ہے ایران کے زرتشتی مذاہب کو دیکھئے جو خود ایک ملک کے لئے نازل ہوا اس کے متبعین میں بھی ۱۲ ذاتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے

سے مراتب و حقوق میں کم و بیش ہیں پس یہاں بھی مساوات اور اخوتّ کا کوئی نظریہ قائم نہیں رہتا۔

ہندوستان کی حالت بھی ارباب نظر و بصیرت سے پوشیدہ نہیں یہاں بھی عالم انسانیت کی تقسیم چار ذاتوں میں محدود کر دی گئی ہے اور ہر ذات کے مقررہ مراتب ہیں سب سے نیچ ذات والے یعنی اچھوت ہر قسم کے لحاظ و امتیاز سے محروم ہیں۔ بدھ نے البتہ مساوات کی تعلیم پیش کی مگر وہ اس قدر وسیع اور شدید تھی کہ جیسے آج کل بالشویزم کے اصول مساوات ہیں اسی لئے وہ قانونِ فطرت کے مقابلہ میں ہزیمت کھا گئی اور اب پیروان بدھ میں بھی مدارج و مراتب قائم ہو گئے ہیں۔

اسلام اور اصول مساوات

یہ شرف اسلام اور فقط اسلام ہی کو حاصل ہے کہ جس کے مقدّس بانی و مبلغ علیہ التحیۃ والتسلیم نے سب سے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ میں تمام بنی نوع انسان کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔

عالمگیر مساوات بنی نوع انسان میں صرف وہی مذہب قائم کر سکتا ہے جو تمام دنیا کے لئے آیا ہو۔ جس طرح اسلام عرب جیسے ریگ زاروں کے لئے آیا اسی طرح وہ لہلہاتے ہوئے میدانوں، شاداب وادیوں اور

سردترین برفستانوں کے لئے بھی مبعوث ہوا تھا جس نے اس جامع و مانع تعلیم کا نشرو ابلاغ کیا جو ہر قوم، ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے موزوں تھی۔ اس کی ہمہ گیر تعلیم نے نسلی، قومی، و ملکی امتیازات کو نزاع لفظی قرار دیا جو انسان کی ہلاکت کا باعث ہو جاتا ہے۔ اسلام نے پوری قوت کے ساتھ اعلان کیا کہ انسانی فطرت تمام موجودات سے بلند ہے چنانچہ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اس حقیقت کا شاہد ہے۔

واضح رہے کہ گناہ کے لغوی معنی حدود سے متجاوز ہونے کے ہیں انسان ہر شے کے محل اور موقع استعمال سے واقف نہیں اس لئے خالق کائنات کا فرض ہے کہ ہم کو ان کے محل و حدود سے اطلاع دے چنانچہ قرآن کریم میں اطلاع دیتا ہے کہ جس خالق نے یہ اشیا اور جذبات بنائے ہیں ان کے صحیح اندازے بھی مقرر کئے ہیں اور ان اندازوں سے انسانوں کو مطلع کر دیا اور ان کا نام حدود اللہ رکھا۔ ان حدود الہیہ پر چلنے کا نام اسلام ہے۔

گویا اس طرح اسلام نے ہر فرد بشر کے لئے بلا کسی امتیاز کے خدا تک پہنچنے اور ترقی کا راستہ صاف کر دیا۔ قرآن کریم اس مسئلہ پر اصولی حیثیت سے ارشاد کرتا ہے "انّ اکرمکم عند اللہ اتقکم"۔

اسی اصول کے ماتحت اسلام ایک نہایت ہمہ گیر اور وسیع قانون

مساوات کی بنیاد رکھتا ہے جس میں تمام انسان ذکور و اناث خواہ وہ کسی قبیلہ، خاندان و ملک سے تعلق رکھتے ہوں سب مساوی حقوق سے متمتع ہو سکتے ہیں اور کسی کو اپنے حقوق و امتیاز سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی عبادات و فرائض میں نماز و حج خصوصیت سے قابل لحاظ ہیں۔ نماز میں ایک غلام محتاج اپنے آقا و امیر کے دوش بدوش خدا کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے اور نسلی و قومی امتیازات کے تمام بندھنوں کو کلیتہً توڑ دیتا ہے نماز کی فلاسفی اور مساوات کی تشریحات کے متعلق ان اشارات ہی پر اکتفا مناسب ہے۔ یہ ہی شان اسلام کے فریضہ حج میں نظر آتی ہے

انسداد غلامی اور اسلام

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی نے دنیا سے غلامی کا انسداد کیا چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ غلاموں کو اسلام نے آقاؤں کی صف میں کھڑا کر دیا دنیا جانتی ہے کہ امام نافع حضرت عبداللہ بن عمر کے غلام تھے مگر وہ علم و عرفان کی بدولت مسلمانوں کے شہرہ آفاق مجتہد حضرت امام مالک رح کے استاد بننے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔ دور نہ جائیے ہندوستان میں

غلاموں کے ایک خاندان نے مستقلاً حکومت کی، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن کی مثالیں ہمارے پیش نظر ہیں یہ سب غلام تھے مگر اسلام نے ان کو مساوات کی دولت عطا فرما کر لاکھوں ذی مرتبہ اور خاندانی گردنوں کا مالک بنا دیا۔ اہل یورپ جو آج بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے غلامی مٹا دی ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ غلامی تو مٹا دی مگر اپنے حقوق ومراتب کو اب بھی سب سے ممتاز کئے ہوئے ہیں اسی یورپ کے مہذب فرزند ماتحت ممالک کے ساتھ کتوں سے بھی زائد سلوک کرتے ہیں۔

انگلستان، فرانس اور اٹلی کی تاریخیں پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کہ حکمرانوں اور سرمایہ داروں نے غلاموں اور مزدوروں کے ساتھ کیا کچھ مظالم نہیں توڑے۔ امریکہ کی تاریخ استعماریت بتاتی ہے کہ ناچار وبکس غلام ان کے تشدد اور بربریت، انسان سوزی کا ہر وقت شکار رہتے ہیں۔ آج کل کی اشتراکیت جیسا کہ بالشویک روس میں رائج ہے، اور جس کے اصول عام وخاص لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں بلاشبہ وہ قانون فطرت سے کلیتہً مغائر ہے ابھی حال ہی میں ان قوانین کے اندر ترمیم کا مسئلہ پیش ہوا۔

اقبال کی شاعری پر قیام یورپ کا اثر

قیام یورپ کے دوران میں اقبال کی اردو شاعری ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کی نفسی کیفیات کا پتہ چلتا ہے اس اعتبار سے بانگ درا کے حصہ دوم کی نظمیں ایک غیر معمولی دلچسپی رکھتی ہیں یہ نظمیں اقبال کے شاعرانہ ماضی کی یادیں ہیں اور اس کے شاعرانہ مستقبل کا پیش خیمہ ہیں سوامی رام تیرتھ کی وفات پر جو نظم لکھی گئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال پر ابھی تک تصوف کے ارزاں خیالات کا اثر باقی تھا ؎

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا   لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

مگر دوسری نظموں میں یہ اثر معدوم ہے اگر ان نظموں پر ایک غائر نگاہ ڈالی جائے تو ان میں ذیل کی خصوصیات نظر آتی ہیں :-

۱- زندگی کا شدید احساس جو ایک حد تک ابیقوریت تک جا پہنچا ہے حسن اور خصوصاً انسانی حسن سے وابستگی جو عشق کے مترادف ہے۔

۲- جذبات کی غیر معمولی نزاکت اور محبت کا لطیف مضمون، ایک ہلکا سا قنوطی انداز جو حساس نوجوانوں سے مخصوص ہے۔

۳۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کی ترجمانی، یعنی اقبال کے دل ودماغ سے بتدریج اس خیال کا ظہور کہ زندگی کوشش پیہم کا نام ہے۔ اقبال کی پیغمبری کا آغاز۔

یورپ میں جہاں ہر شے سے زندگی کے آثار اُبلے پڑتے ہیں جہاں تہذیب و تمدن کے لاکھوں رنگین کھلونے آنکھوں کو فریب دینے کے لئے موجود ہیں ایک نوجوان کے دل میں "عشرت امروز" کی تمنا پیدا ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں مگر ہم اس احساس زندگانی کو ابیقوریت کہنے میں شاید حق بجانب نہ ہوں کیونکہ اقبال کو کائنات کی ہر ایک چیز اسی عشرت سے لبریز نظر آتی ہے اور وہ خود بھی اس میں شریک ہو جانا چاہتا ہے ؎

ہے گرم خرام موج دریا | دریا سوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اڑا رہی ہے | شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے
لذت گیر وجود ہر شے | سرمست مئے نمود ہر شے
کوئی نہیں غمگسار انساں | کیا تلخ ہے روزگار انساں

اقبال کے لئے یہی احساس، حسن کا احساس بھی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حسن کا جتنا وسیع احساس اقبال کو اس زمانے میں ہوا پھر کبھی نہیں ہوا حسن سب سے پہلے اقبال کو مناظر قدرت میں دکھائی دیتا ہے ؎

ہے تختِ لعلِ شفق پر جلوسِ اخترِ شام ‏ ‏ ‏ ‏ بہشتِ دیدۂ بینا ہے حسنِ منظرِ شام
شکستہ گیت ہیں چشموں کے دلبری ہے کمال ‏ ‏ ‏ ‏ دعائے طفلکِ گفتار آزما کی مثال

مگر اس حسن کی انتہا انسانی حسن میں جھلکتی ہے ؎

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اس کا

حسن ارتقائے کائنات کی آخری منزل مقصود ہے اس کا احساس انسان سے خاص نہیں۔ نظام عالم کا ہر جزو حسن کی تکمیل میں کوشاں ہے اسی کوشش کا نام عشق ہے۔

مگر اس حسن بے پایاں کا جو تمام کائنات کا منتہا ہے کائنات کی موجودہ منزل ارتقا میں کامل جلوہ نہیں ملتا۔ حسن ناپائدار ہے "حقیقت حسن" میں اقبال نے انگریز شاعر ہیرک کی طرح اس ناپائداری کا نوحہ کیا ہے کبھی کبھی اسے یہ بھی شک ہوتا ہے کہ وہ حسن جس کی تمنا میں انسان بیتاب ہے کہیں محض انسان کے بیقرار دل کا ایک وہم رنگین ہی نہ ہو ؎

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بیتاب ‏ ‏ ‏ ‏ پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

"کلی" میں بھی شاعر اسی حسن کی تلاش میں ہے مگر ان سب جذبات کا عطر "عاشق ہرجائی" ہے میرے خیال میں یہ نظم اقبال کی نفسیات شباب

کی زندہ تصویر ہے ایسی نظم کوئی شاعر چالیس سال کی عمر کے بعد نہیں لکھ سکتا۔ شاعر کی وسعت طلب کا اندازہ ایک شعر سے ہو سکتا ہے ؎

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ وہ کامل تجلّی مدّعا رکھتا ہوں میں

اس آتشیں تمنّا کے ساتھ ساتھ ایک اور نفسی کیفیت مایوسی کا پیدا ہو جانا بھی ناگزیر ہے کیونکہ ایسی آرزوئیں پوری ہونے کے لئے نہیں پیدا کی گئیں۔ حقائق زندگی میں کبھی وہ لطافت اور کمال پیدا نہیں ہو سکتا جس سے وہ انسان کے اس تخیل کی پرواز کو جا لیں ؎

فیض ساقی شبنم آسا ظرف دل دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں
مجکو پیدا کرکے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلا رکھتا ہوں میں
محفل ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن
پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں

"نوائے غم" میں کم و بیش یہی قنوطی انداز قائم ہے "ایک شام" میں اس اداسی کے ازالے کے لئے فطرت کے سکون سے سبق لیا ہے یہ نظم ورڈز ورتھ کی شاعری کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ایک اور جگہ کہا ہے ؎

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

اس صنف کی اداسی یورپ کے رومانی شعرا کا خاصہ ہے اقبال کا انداز اس زمانہ میں شعرائے مغرب کی اسی جماعت سے ملتا ہے۔

اگر اقبال کے قیام ولایت کی شاعری کی دوسری خصوصیت کو دیکھنا ہو تو "حسن و عشق" "حقیقت حسن" "کلی" "فراق" ہر ایک نظم میں اس کی جھلک نظر آئے گی۔ یہ خصوصیت کوئی انوکھی چیز نہیں۔ احساس حسن اور احساس محبت دو الگ چیزیں نہیں جس سے وابستگی ہی کا نام عشق ہے۔ اور عشق جب وارد ہوتا ہے تو اپنے اظہار کی قوت بھی ساتھ ہی لیکر آتا ہے ؎

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمین قمر نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم موجۂ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیل محبت میں یونہی دل میرا

میرے خیال میں یہ بند بجائے خود دنیا کی بہترین نظموں میں سے ہے محبت کا دائرہ اقبال نے مجنوں و لیلیٰ کے معاملات ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اسے نظام عالم کی روح سمجھا ہے جب عالم بالا میں محبت کا نسخہ مختلف اجزا سے تیار ہو چکا تو ؎

مہوس نے یہ پانی ہستی نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کار عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

شیلے کا فلسفۂ محبت بھی یہی تھا یعنی وہ اجزائے عالم کی باہمی وابستگی کو محبت سے تعبیر کرتا تھا اور محبت کے بغیر کائنات کا وجود ناممکن خیال کرتا تھا۔ اقبال کہتا ہے ؎

شیشۂ دہر میں مانند مئے ناب ہے عشق
روح خورشید ہے خون رگ مہتاب ہے عشق
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

اس زمانے میں اقبال کی طبیعت پر ایک خاص قسم کی رقت چھائی ہوئی تھی اکثر نظموں میں ایک سوز ہے جو کسی میٹھے راگ کی لے کی طرح دل میں بس جاتا ہے ؎

نغمۂ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے — اشک کے قافلے کو بانگ درا اٹھتی ہے
سکوت شام جدائی ہوا بہانہ مجھے — کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

بلاشک و شبہ قیام ولایت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی پیغمبرانہ شان کا آغاز ہے اس سے پہلے کا اقبال شاعر محض ہے۔ مگر اس کے بعد کا اقبال دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ایک حیات تازہ کا پیغام دینے کے لئے بیتاب ہے اور اس پیغام کو ہزاروں طریق سے دہراتا ہے یہ بہت ممکن ہے کہ اگر اقبال ولایت نہ جاتا تو اس کی شاعری

بلکہ اس کی زندگی کا رخ کچھ اور ہوتا۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ اقبال کے روحانی ارتقا کی اہم ترین منزل ہے اس عرصہ میں اقبال کو تہذیب مغرب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا اس کے ساتھ ہی اقبال نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے سلسلے میں اسلامی فلسفہ اور اسلامی علوم کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور اسے تہذیب اسلام اور تہذیب مغرب کا موازنہ کرنے کا موقع ملا اس موازنہ کا اثر یہ تھا کہ اقبال کی زندگی کا عظیم الشان نصب العین یعنی اسلام کے اصولوں کی علمبرداری اس کے سامنے معین ہو گیا اور اس کے تخیل اور جذبات نے اپنے لئے ایک راہ مقرر کر لی۔

اس سے قبل کہ اقبال کی زندگی کا نصب العین معین ہو۔ اس کے فلسفۂ زندگی کی تشکیل ہوئی جو اس کے پیغام کے ہر پہلو میں مضمر ہے اور جس کی بنیاد ذوق تپش اور ذوق عمل پر رکھی گئی ہے یہ فلسفہ ولایت جانے سے پہلے کلام میں بھی جھلکتا ہے ؎

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمن دل کو
کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

مگر ولایت کی چند نظموں مثلاً طلبہ علی گڑھ کے نام، چاند، تارے وغیرہ میں اس فلسفے نے باقاعدہ صورت اختیار کر لی ہے ؎

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے — زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اس فلسفے نے اقبال کو اس کی "پیغامی" شاعری کی راہ دکھائی۔ سب سے پہلے اقبال مغرب کی سرد روحانیت سے بیزار ہوا ؎

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں مجکو تو خانہ ساز دے

پھر "عبدالقادر کے نام" میں اس کے پیغام کا دھندلا سا آغاز ہوا ؎

رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھالیں اپنا — سب کو محو رخ سعدی و سلیمی کردیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

اور مارچ ۱۹۰۷ء کی نظم میں اقبال نے مکمل طور پر اپنے شاعرانہ ماضی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ؎

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

اس نظم میں اقبال نے طلوع اسلام کی پیشینگوئی کی ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے میں نے یہ قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

تہذیب مغرب کی زر پرستی اور انسانی ہمدردی کے فقدان کی تنقید مخالفانہ بھی پہلے پہل اسی نظم میں ہوئی ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہی زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس سلسلے میں اقبال کی ایک اور غزل کے دو شعر بھی اہم ہیں جن سے مغربی قوموں کا مطالعہ اور اسلام اور وطنیت کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے ؎

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے
مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

اقبال کے دل کی یہ کیفیت تھی جب سسلی کے نظارے نے اس کے ملی جذبات میں آگ لگا دی۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے قدیم مسلمانوں کی عظمت کا نقشہ پھر گیا۔

اگر اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش ہوتی تو میں چند اور چھوٹی چھوٹی

خصوصیات کا بھی ذکر کرتا۔ مثلاً اقبال کا انداز بیان سچنتہ اور اس کے کلام کا مغربی عنصر بہت نمایاں ہو گیا۔ جیسے ؎

یہ کیفیت ہے مری جان ناشکیبا کی   مری مثال ہے طفل صغیر تنہا کی
سو تو نکو ندیوں کا شوق، بحر کا ندیوں کو عشق   موجۂ بحر کو تپش ماہ تمام کے لیے

مزید برآں اکثر نظمیں ایسی ہیں جن کو یورپ کے نقاد "الادب للادب" سے تعبیر کریںگے یعنی جو محض شاعری کا نمونہ ہیں۔

اگر اقبال کے قیام ولایت کی شاعری کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس میں ایک حساس، بیقرار اور آتشیں شباب نوجوان کی تصویر نظر آتی ہے اقبال کا شعر ہے ؎

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

یورپ کی دلفریب دنیا ایک پُر بہار گلستاں کے مانند تھی جہاں سے اقبال ایک جوئے نغمہ خواں ہو کر گزرا مگر جب زندگی کے کوہ و بیاباں اس کی نظروں کے سامنے آئے تو وہ ایک سیل تند رو بن گیا اور ایک دنیا کو اپنے طوفان محشر خیز میں بہا کر لے گیا۔

(ختم)

کلامِ اقبال کی ادبی خوبیاں

اقبال ایک فلسفی شاعر ہے اس کے فلسفہ نے مذہب اسلام اور اس کی مقدس روایات کی آغوش میں پرورش پائی ہے اس کے تخیل کی وادیاں سرزمین حجاز کی ہواؤں کی آبیاری کی شرمندۂ احسان ہیں ان کے کلام کا اکثر اور بیشتر حصہ خالص اسلامی نقطۂ نگاہ کو پیش کرتا ہے وہ ہر شے کو مذہب کی عینک سے دیکھتا ہے اور اسی پابندی میں روح کی آزادی کے خواب دیکھتا ہے۔

باایں ہمہ اقبال کے کلام میں جو ادبی خوبیاں ہیں وہ عہد حاضرہ کے دوسرے شعرا کے حصہ میں کم آئی ہیں۔

ایک مصور کے لئے انتہائے کمال یہ ہے کہ وہ جس چیز کی تصویر کھینچے ہوبہو اسی کی شکل پیش کردے اگر ایک خوبرو جوان کی شبیہ بنائے، تو اس کے کشیدہ قامت، بھرے بھرے بدن، چوڑے چکلے سینے، مضبوط گردن اور قوی ہاتھ پاؤں، اس کی خاص وضع کی انگلیوں، پھر سبزۂ خط اور لباس کی مناسبت تک کا پورا پورا نقش صفحۂ قرطاس پر ثبت

کر دے تصویر کو دیکھ کر وہی رعب اور اثر دیکھنے والے کے دل پر ہو۔ جو فی الواقع ایک خوبرو اور وجیہ جوان کے دیکھنے سے ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔

کوہ و وادی کا نقشہ ہو تو اس میں ہر وہ چیز دکھائے جس سے ایک عظیم الشان پہاڑ کی صولت اور وادی کی نظر فریبی میں سر مو فرق نہ آئے۔

ادبی مصوّر اور معمولی آرٹسٹ میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے، اس نامور دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح موقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں لیکن اس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوشنما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال چہچہا کر دیتا ہے بغیر بوند پانی اس میں ڈالے ایک ہی بات میں اسے ایسا کر دیتا ہے کہ کبھی نارنجی، کبھی گلناری، کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اسی طرح بوقلموں اور زنگار رنگ اور پھر سرتاپا عالم نیرنگ' اس کے مرقع آنکھوں کانوں کے رستے سے دنیا جہان کے دلوں کو تازہ کر دیتے ہیں۔

اپنے موڈل کی صحیح شبیہ کرنے کے لئے ادبی مصوّر کو جن ضروری امور کا لحاظ کرنا پڑتا ہے انکا یہاں ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دینا بے موقع

نہ ہو گا۔

۱۔ اسے اس امر میں خاص احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ اس کی زبان اس قدر ثقیل، اس کے محاورے اس درجہ غیر مستعمل اور اس کے استعارات و تشبیہات اس حد تک دوراز کار نہ ہوں کہ سننے والے کا دماغ محض لفظی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جائے اور اصل مطلب تک پہنچنا اس کے لئے جوئے شیر لانے کے مرادف ہو نہیں تو اس کی تصویر دھندلی اس کا نقش بے رنگ اور اس کا بیان بے لطف ہو گا۔

۲۔ اس کے خیالات اور اس کے طرز بیان میں وہ اجنبیت نہ ہو، جو دونوں کے یکجا ہونے اور ان سے ایک مفہوم کی ادائیگی میں سدّ راہ نہ ہو۔ نہیں تو اس کی تمام کوششیں اس بت ساز سے مشابہ ہونگی جو سنگ سیاہ سے ایک مرمریں مجسمہ تیار کرنے میں منہمک ہو اور ہر بار قطرات حسرت و یاس اس کی پیشانی پر نمودار ہوں۔

۳۔ اس کی تصاویر اس قدر صاف اور اس کے نقش اس درجہ روشن ہوں کہ دیکھنے والے کو نقل پر اصل کا دھوکا ہو مگر نقل اصل کی نسبت زیادہ واضح اور زیادہ جاذب نظر ہو۔

۴۔ اس کے لئے فلسفیانہ طریق استدلال ضروری نہیں اور نہ ہی ناصحانہ طرز نگارش اس کا کام ہے اسے تو جذبات کی صحیح ترجمانی کرنا ہے

اور ضروری ہے کہ وہ جذبات کو جوں کا توں بیان کرے۔ لگی لپٹی نہ رکھے اور یہ پروا نہ کرے کہ فلاں جماعت کیا کہے گی اور فلاں طبقے میں میری نسبت کیسے خیالات پھیلیں گے ؎

بے لاگ بات بال برابر لگی نہ رکھ

۵۔ چونکہ ایک ہی طرح کی تصاویر دیکھ دیکھ کر ناظرین کی طبیعت اکتا جاتی ہے اس لئے اچھے ادبی مصوّر کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی تصاویر میں جدّت پیدا کرے۔ جہاں تک ہو سکے فرسودہ طرزِ نگارش سے اجتناب اور بیہودہ راہ عمل سے احتراز کرے۔

اقبال نے بہت کم نظمیں ایسی لکھی ہیں کہ جن کی زبان "روزمرّہ" اردو کے عین مطابق، بہت زیادہ فارسی تراکیب سے پاک، اور عام اذہان کے لئے سریع الفہم ہو لیکن جب وہ سہل انگاری پر اترتا ہے تو سلامت بیان اور روانی خیالات میں اس کا نظیر ملنا مشکل ہو جاتا ہے اور جیسا کہ مولانا حالیؔ نے یادگار غالبؔ میں مرزا کے کلام پر ریویو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ شاعر کا مرتبہ اس کے بہترین کلام سے پہچانا جاتا ہے۔ ہم بھی یہاں اقبال کی ادبی مصوّری کو اس کی سریع الفہم اور اس کے خاص فلسفیانہ رنگ سے مبرا نظموں میں دکھائیں گے۔

ایک مشہور نظم "ایک آرزو" میں شاعر خدا سے یہ دعا مانگتا ہے کہ اے

خدا! مجھے اس شور و غل کی دنیا سے الگ ایک مکان پر سکوت عطا ہو جائے، جہاں کی فضا نہایت دلکش ہو، پہاڑ ہوں، ندی ہو، سبزہ زار ہوں اور فطرت کی ہر دلفریبی وہاں موجود ہو اور اس کے علاوہ :۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن بن اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
پھولوں کو آئے شبنم، جس دم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

ندی کے کناروں کا جو عکس پانی پر پڑتا ہے اس کو شاعر کس خوبصورتی اور کس بے تکلفی سے بیان کر گیا ہے۔

پانی کی موجوں کے بلند ہونے کا باعث پانی کے کوہسار کے نظارے کی دلفریبی کو دیکھنے کی خواہش قرار دینا صنعت حسن تعلیل کی نہایت اچھی

مثال ہے شاعر نے اس شعر میں کئی خوبیاں بھر دی ہیں۔

پھول کی ٹہنی کے سطح آب پر جھکنے کو ایک حسینہ کے آئینہ دیکھنے سے تعبیر کرنا کمال شاعری ہے اور نزاکت تشبیہ کا معراج ہے واقعی اس ایک تشبیہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کا دماغ کتنا ندرت آفریں اور جدّت پسند ہے۔

غروب آفتاب کے وقت شفق کی سرخی کو عروس شام کی مہندی لکھنا بھی حضرت اقبال ہی کا حصّہ ہے یہ تشبیہ بھی نہایت نادر ہے اور اس وقت ہر پھول کی قبا کا سرخی لئے سنہرا ہو جانا بھی شاعر کی سلامتی مشاہدہ پر دال ہے۔

وقت سحر جب کوئی بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہوتا ہے شاعر کو پھول پر پڑی ہوئی شبنم آب وضو معلوم ہوتی ہے پاکیزہ خیال ہے۔

نادر اور اچھوتی تشبیہات ایک ادبی مصوّر کے لئے ایسی ہی ضروری ہیں جیسے ایک مصوّر کے لئے مختلف موقلم۔ ان ہی سے اس کے کلام کا رنگ جمتا ہے اور کلام حقیقت سے زیادہ نزدیک آجاتا ہے جس قدر تشبیہات ایک مشبّہ کی نسبت دی جائیں۔ اس کی اصلیت اتنی ہی واضح ہو جاتی ہے اقبال کے چند اشعار میں اچھوتی اور نازک تشبیہات کی کس قدر فراوانی ہے۔ جس سے بلاشبہ اس کی رسائی ذہن کا پتہ چل

سکتا ہے ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑکر کوئی ستارہ
یا جان پڑگئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

ایک جگنو کے لئے پھولوں کی انجمن کی شمع، آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ، جاندار کرن مہتاب، سفیر روز بہ سلطنت شب، مہتاب کی قبا کا تکمہ، ذرہ بہ پیرہن آفتاب، انتہی تشبیہات، لاریب اقبال کو تخلیق تشبیہات میں کمال ہے۔

تجنیس لفظی ومعنوی میں بھی ایک ادبی مصور کے کمال فن کا مظاہرہ ہوتا ہے اقبال اس میدان میں بھی کبھی کبھی اشہب قلم کو ایک آدھ جولانی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

اپنے استاد داغ کے مرثیہ میں امیر مینائی کی وفات پر ان الفاظ میں ماتم کرتا ہے ؎

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر

چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

شکستِ مینائے امیر کا واقعہ کس قدر آشوبناک اور ترکیب کیسی فرحناک ہے۔ مشہورِ عالم نظم "شکوہ" کو ان اشعار سے شروع کرتا ہے:۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں | فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں | ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

"میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں" اس ایک مصرعہ میں ضرورت فریاد کو کس خوبصورتی سے ادا کر دیا ہے۔

ادبی مصوّر کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کرے اس کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جائے۔

دیکھئے اقبال نماز کی تصویر کس خوبی سے کھینچتے ہیں کہ آنکھوں میں کاروانِ حجاز کی فریضہ گزاری کا نقشہ کھنچ جاتا ہے اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے نماز پڑھ رہے ہیں ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز | قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز | نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اللہ اللہ! مسدس کے ایک بند میں ایک تصویر کھینچ کے دکھا دینا

یہ کمال مصوری نہیں تو اور کیا ہے؟

اور اگر کوئی مصور بھی نمازیوں کی تصویر ہو بہو کھینچ دے اور اس میں محمود و ایاز تک بھی دکھا دے لیکن اس حقیقت کا بیان "نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز" اس کے موقلم کے احاطۂ نقاشی سے بعید ہو گا۔

واقعی ایسے ہی ایک دو بندوں کی وجہ سے اہل نظر کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے کہ اے اقبال! اس میں کچھ شک نہیں ؎

شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

"خضر راہ" میں موج مضطر کے ساکن ہونے کو ایک طفل شیر خوار کے گہوارے میں سو جانے سے تشبیہ دی ہے ؎

جیسے گہوارہ میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

اقبال کو اظہار خیالات کے لئے اکثر فارسی کی مدد لینی پڑتی ہے۔ اور یہی زبان اس کے اپنے قول کے مطابق اس کی رفعت تخیل کی متحمل ہو سکتی ہے اس لئے وہ جو مطلب چاہتا ہے چند الفاظ کے ہیر پھیر سے اس زبان میں یا اردو میں فارسی اضافتوں کو خلط ملط کر کے ادا کر دیتا ہے

اور کہیں ناکام نہیں ہوتا اس طرح اس کے اکثر مطالب ایک آدھ لفظ میں اس خوبی سے ادا ہو جاتے ہیں کہ "خالص اردو" کے کئی فقرات میں ان کو ادا کرنا ممکن نہیں۔

بہر حال اقبال اس امر میں غالبؔ سے زیادہ خوش نصیب ہے، کہ اس بیچارے کو اکثر فارسی تراکیب بھی کام نہ دے سکیں۔ اور بیشتر مطالب یوں الجھ کے رہ گئے۔ جیسے ایک بلبل نازک اندام خار دار اور گھنی جھاڑیوں میں جا چھپے اور پھڑ پھڑا بھی نہ سکے۔

"آفتاب صبح" میں مسدس کے ایک بند کا مصرع اوّل ہے:۔

نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر

اب اس ایک چھوٹی سی ترکیب "دامان نظر" کو تصور کی آنکھوں سے دیکھیں تو اس میں ایک مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ اسی طرح ؎

گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا

عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

"میکدۂ بے خروش" یہ ترکیب اس شعر کی جان ہے گھٹا کا میکدے کی مثل ہونا اور پھر اس کا خموش ہونا۔ آنکھوں میں ایک تصویر آجاتی ہے جسے شاید مصوّر کا قلم نہیں کھینچ سکتا۔

نظم "پرندہ اور جگنو" کا یہ شعر ؎

لباس نور میں مستور ہوں میں　　　پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں

اور اس میں "پتنگوں کے جہاں کا طور" ٹکڑا ملاحظہ ہو شاعر نے جو کچھ محسوس کیا ہے ان الفاظ میں ادا کر گیا ہے اور اس کے الفاظ اور خیالات میں کوئی تصادم نہیں ظاہر ہوتا ہے

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

جزیرۂ سسلی میں صقلیہ کو دیکھ کر شاعر اسے تہذیب حجازی کا مزار کہتا ہے جو اس کے خیالات کا آئینہ ہے اور ایک المناک حقیقت ہے۔ سکوت شب میں جب ہر شے محو خواب ہوتی ہے دریا بھی چلتا چلتا تھم گیا معلوم ہوتا ہے اقبال اس منظر کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب

مصرع ثانی میں ایک پوری تصویر آ گئی ہے اور اس کا اثر کانوں کے رستے دل پر جو کچھ ہوتا ہے وہ ایک تصویر میں ناممکن ہے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

دیو استبداد کے ناچنے کے لئے اگر لفظ "ناچنا" مستعمل ہوتا تو مصرع

میں وہ شوکت اور ہیبت پیدا نہ ہوتی جواب موجود ہے اگلے مصرع میں جو نزاکت ہے اس نے پہلے مصرع کی قوی ہیکلی کو اور بھی بڑھا دیا ہے یہی شعر اس بات کی کافی دلیل ہے کہ فارسی تراکیب اقبال کو اپنے رخش خیالات کے ساتھ ساتھ چلنے میں کامیاب کر دیتی ہیں اور شاید اگر اقبال "خالص اردو" میں لکھنا شروع کرتا تو ایسے ایسے اچھے اشعار اس کو نصیب نہ ہوتے۔

ماہ نو کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل

یعنی آفتاب کے دریائے نیل میں سورج کی کشتی ٹوٹ گئی اور اس کا ایک ٹکڑا جو نظر آرہا ہے وہ ماہ نو ہے۔

جواب شکوہ میں اس مطلب کو کہ جب میں نے شکوہ سرائی کی تو ملاء اعلیٰ میں سرگوشیاں ہونے لگیں کس خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے واقعی اس بند کو پڑھ کر پیر گردوں، سیاروں، چاند اور کہکشاں کی سرگوشیاں آنکھوں کے سامنے اور کانوں کے نزدیک معلوم ہونے لگتی ہیں ؎

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی
بولے سیارے سر عرش بریں ہے کوئی

چاند کہتا تھا نہیں اہل زمیں ہے کوئی　　کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا

مجکو جنّت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

ایک خاص بات جو اقبال کے کلام کو ادبی مصوّروں سے جدا کرتی ہو یہ ہے کہ اس کے کلام میں موسیقی کو بڑا دخل ہے اس کے اکثر اشعار پڑھ کر ناچنے کو جی چاہتا ہے اور یہ صفت کبھی اس کے کلام سے دل اُچاٹ نہیں ہونے دیتی۔ اقبال کے بعض اشعار کو تو ترنّم پڑھا ہی نہیں جاسکتا مثلاً ؎

زمانہ آیا ہے بیحجابی کا عام دیدار یار ہوگا

سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے اقبال ایک فلسفی شاعر ہے، اکثر اشعار میں اس کا فلسفیانہ رنگ غالب ہے وہ اشعار میں تلقین کرتا ہے اور رواداری کا سبق دیتا ہے، تڑپ، سوز و گداز کا علمبردار ہے اس کے نزدیک حیات کشمکش کا نام ہے

—— (۴) ——

جہدِ حریّت

(لارڈ میکالے کے ایک مقالہ کا ترجمہ)

اکثر انقلابات کی ابتدا نہایت خراب دیکھی جاتی ہے۔ مگر قوم جب تک آزادانہ زندگی بسر نہ کرے آزادی کے صحیح استعمال سے واقف بھی نہیں ہو سکتی۔ انگورستانوں کے باشندے عموماً شرابی نہیں ہوتے بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ جہاں انگور نایاب ہوتے ہیں، وہاں بادہ خواری کی زیادتی ہوتی ہے تو آزادوں کی حالت اس لشکر کی سی سمجھو جو ایسے مقام پر خیمہ زن جہاں شراب کی بھٹیوں کے سوا کچھ نہ دکھائی دے کہتے ہیں کہ جب فوجی سپاہیوں کی بے روک ٹوک ایسے نایاب اور گرانبہا وسیلۂ تعیش پر دسترس ہوتی ہے تو شراب نوشی ان کا آٹھوں پہر کا مشغلہ بن جاتا ہے انہیں نشہ پرستی اور بدمستی کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ آخر پھر رفتہ رفتہ سرور خمار سے بدلتا اور افراط و کثرت، تمیز و ہوش کی آنکھوں کو کھول دیتی ہے جب شراب مہینے دو مہینے تک روزانہ صبح و شام کی غذا ہو چکتی ہے تو وہ اپنے قیام وطن کے ایام

سے بھی زیادہ محتاط ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یقین کرنا چاہیئے کہ حریت کے آخری اور مستقل ثمرات تمیز، اعتدال اور رحم ہوتے ہیں لیکن وقتی اثرات بالعموم وحشیانہ اقدام، ناسزا غلطیاں، اظہر من الشمس معاملات میں شک و اشتباہ، بہایت نازک معاملات میں خود رائی اور بسا اوقات ہٹ دھرمی ہوا کرتے ہیں۔

ایسے ہی نازک وقت میں دشمنان حریت کو روڑے اٹکانے کا موقع ملتا ہے اور وہ حریت کے معائب اور آزادی و غلامی کی درمیانی کشمکشوں کی قہرناکیاں گنوانے لگتے ہیں یعنی پورے دو چار روپئے بھی رکھے نہیں گئے یا ڑھیں بدھنی شروع ہوئی ہیں کہ شکستگی کے خطرات سامنے لا ڈالے یا تعمیر ابھی ادھوری ہی ہے کہ مچان کھول ڈالنے پر آمادہ ہیں۔ گرد و غبار کے اوپر سے گزرنے، کوڑے کرکٹ کے اٹے ہوئے کمرے اور تمام مکان کی وحشت انگیز بے ترتیبی کا رونا لے بیٹھے۔ یہی نہیں بلکہ طنز سے پوچھا جاتا ہے کہ جس شان و شوکت اور جس امن و جمعیت کا وعدہ تھا وہ کہاں ہے؟ اگر ایسی ہی افسوس ناک اور غلط منطق پھیل جائے تو دنیا میں کبھی کوئی نفیس مکان یا عمدہ حکومت تیار نہ ہو سکے۔

اریوسٹر ایک اطالوی شاعر نے ایک پری کی کہانی لکھی ہے وہ اپنے سحر و طلسم کے زور سے خاص زمانوں میں نہایت کریہہ منظر اور زہریلی

ناگن کی شکل میں نکلا کرتی تھی جو لوگ اس ہیئت میں اس کو تکلیفیں پہنچاتے، اس سے دور بھاگتے، اسے مار ڈالنے کی فکر کرتے وہ ان تمام راحتوں سے محروم کر دیئے جاتے جن پر اس پری کا اختیار تھا اور جو بعد میں لوگوں کو پہنچایا کرتی تھی مگر جو لوگ باوجود اس کی مکروہ صورت کے اس پر رحم کھاتے اس کی خاطر اور حفاظت کرتے انہیں وہ بعد از اں اپنے اصلی حسن و جمال کے درشن دیتی ان کے سامنے اپنی دلربائیاں دکھاتی اور ان کے ساتھ رہتی۔ ان کی تمام خواہشیں پوری کرتی ان کے گھروں کو دولت سے بھر دیتی، عشق میں ان کو فائز المرام اور جنگ میں فتحمند بنا دیتی۔

حریت بھی ایک ایسی ہی پری ہے بعض اوقات یہ اس کہانی کی پری کی طرح کسی نفرت انگیز دو موہنی سانپن کی صورت اختیار کر لیتی ہے، رینگتی ہے، پھنکارتی ہے، نیش زنی کرتی ہے اور ڈراتی ہے حیف ہے ان کی قسمت پر جو بدحواسی میں سر کچل دیں اور مبارک ہیں وہ جو اس کے ذلیل اور ہیبت ناک ظہور کو بھی مبارک سمجھیں اس کا جوش و احترام سے خیر مقدم بجا لائیں اور پھر اس کے حسن کے زمانے میں اپنی ان دور اندیشیوں کا ثمر پائیں۔ اور اجر عظیم حاصل کریں۔

تازہ حریت کے پیدا کردہ نقصانات کا ایک ہی علاج ہے اور وہ خود حریت ہی ہے جب کوئی قیدی پہلے پہل تنگ و تاریک تہ خانے سے چھوٹتا ہے تو روز روشن کی چمک اس کی آنکھیں برداشت نہیں کر سکتیں. نہ وہ رنگوں میں تمیز کر سکتا ہے نہ سامنے آنے والوں کے چہرے اس کی پہچان میں آتے ہیں تو کیا اس کا علاج اس کو پھر تہ خانے میں بند کر دینا ہے ؟ اسے الٹے قدموں جیل کی اندھیری کوٹھڑی میں دھکیل دینے سے سورج اس کی آنکھوں میں نہیں بس جائیگا وہ رنگ شناس نہیں بن سکتا بلکہ اس کا علاج اسے آفتاب کی شعاعوں سے مانوس بنانا ہے۔

حق اور حریت کی تابش اس قوم کو پہلے پہل خیرہ نظر کر کے اندھا بنادیا کرتی ہے جو قید غلامی میں رہتے رہتے فضائے عالم کو دھندلا دیکھنے لگی ہے جن کی نگاہیں رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں کوئی تمیز نہیں کر سکتیں. لیکن ذرا ان کی آنکھیں کھلی رہنے دو ان کے سامنے سورج تھوڑی دیر چمکتا رہے وہ بہت جلد اس کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

جانوروں تک جب ماحول کا اثر قبول کر سکتے ہیں تو انسان تو پھر اشرف المخلوقات ہے ناجائز روک ٹوک نہ کرو، ڈراؤ دھمکاؤ نہیں

آج جنہیں تم وحشی اور ناسمجھ کہتے ہو کل وہی مہذّب اور شائستہ ہو سکتے ہیں۔ الٹا علاج نہ کرو چند ہی روز میں لوگ عقل سے کام لینا سیکھ جاتے ہیں۔ رایوں کی پرجوش تیزی معتدل ہو جاتی ہے متضاد خیالات مل جل کر ایک دوسرے کو صحیح کر دیتے ہیں، صداقت اور رواداری کے منتشر عناصر باہمی مناقشات اور مخالفانہ جدوجہد چھوڑ کر ایک راہ پر آ لگتے ہیں اور آخر کار انہی پریشان اجزا سے انصاف اور اصلاح کا نظام تشکل پذیر ہوتا ہے۔

ہمارے زمانے کے اکثر مدبّر اس امر کو ایک مسلّمہ اور ناقابل شکست مسئلہ کی حیثیت سے پیش کر دیا کرتے ہیں کہ کسی قوم کے لئے اس وقت تک آزاد ہونا مناسب نہیں جب تک وہ اپنی حریت کے صحیح استعمال کے لائق نہ ہو جائے یہ بات اس احمق کی زبان سے زیادہ موزوں معلوم ہو گی جو پرانی روایات کے مطابق سیکھے بغیر پانی میں قدم رکھنا نہیں چاہتا تھا اگر کوئی قوم حریت کے لئے اتنے دن تک انتظار کرے کہ پہلے حالت غلامی ہی میں پوری عاقل اور ذی ہوش بن جائے تو اسے ناابد صرف انتظار ہی کھینچنا پڑے گا وہ دریا میں اترنے کے لئے شناوری سیکھنے کی راہ دیکھتی رہے گی اور شناوری بغیر دریا میں اترے قیامت تک نہیں آ سکتی۔

حقیقتِ وطنیّت

انسان دنیا میں پیدا ہو کر سب سے پہلے غذا کا محتاج تھا، اور اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے اس کو ہمیشہ ہی بدل ما تحلیل یعنی غذا کی ضرورت لاحق رہتی ہے انسان کو یہ ضروری چیز زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے اور بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ اس لیے زمین کو ماں بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ نسل انسانی ابتداءً زمین کے جنگلوں کو شکار کے لئے استعمال کرتی رہی، پھر زمین کے فراخ میدانوں کو کاشتکاری کے لئے استعمال کرنے لگی اور تمدّنی ضروریات نے بستیوں اور شہروں کی اقامتگاہیں بنا کر زمین کے الگ الگ قطعات کو الگ الگ انسانی جماعتوں کے لئے مخصوص کر دیا اور اس طرح قطعات زمین کے ساتھ خصوصی تعلق نے وطنیت کی خصوصیات پیدا کر لیں۔ قومیّت اور وطنیت میں زیادہ فرق نہیں ہے دونوں چیزیں انسان کے ایک ہی جذبہ سے تعلق رکھتی ہیں اور آپس میں بہت کچھ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں ایک

جگہ یا ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے اور تمدّنی تعلقات کے سبب دو یا زیادہ شخصوں یا قوموں میں جو دوستی یا محبت قائم ہو سکتی ہے وہ مختلف اقوام کے افراد کو ایک قوم کے افراد کی مانند متحد بنا دیتی اور ایک قوم کے دو حصوں کی بیگانگی جو دو مختلف ملکوں میں ایک دوسرے سے جدا اور بے تعلق ہو کر سکونت اختیار کر لینے کے سبب پیدا ہوتی ہے دو مختلف اجنبی قوموں کی حالت میں تبدیلی کر سکتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ وطنیت اپنا اثر قومیت پر اور قومیت اپنا اثر وطنیت پر ڈالتی رہتی ہے انسان کو جس طرح اپنے اہل خاندان ماں باپ اور بہن بھائی وغیرہ سے محبت ہوتی ہے ایسی ہی اپنے گھر اور محلہ اور شہر سے بھی ضرور ہوتی ہے اور یہ انسانی فطرت ہے اور اسی لئے جس طرح انسان پر اپنے قریبی رشتہ دار دل اور اپنی قوم کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اسی طرح وطن کے بھی اس پر حقوق واجب ہوتے ہیں اور ان حقوق سے انکار کرنا گویا انسانیت کے دائرے سے خارج ہونا ہے۔ "حب الوطن من الایمان" محبت وطن کا بھی سبب وہی پرورش و مربیّت ہے جو محبت قوم کا موجب ہے اس محبت وطن کی بھی ایک حد ہے اس سے بالاتر انسانوں کو اپنی جان کی محبت ہوتی ہے جن لوگوں کی جان کے لئے وطن میں خطرات پیدا ہو جاتے ہیں وہ اپنی جان بچانے کے لئے بخوشی ترک وطن پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور غریبی و غربت کے

شدائد و مصائب برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن اپنی جان سے بھی بڑھ کر خدائے جان آفرین کا درجہ ہے ایمان باللہ یعنی محبت باری تعالیٰ کے مقابلے میں انسان اپنی قوم وطن اور اپنی جان سب کو قربان کر سکتا ہے اسلیئے کہ یہ دنیوی زندگی اور اس کے متعلقات چند روزہ اور ختم ہو جانے والی چیزیں ہیں اور اس دوسری فنا نہ ہونیوالی اور باقی رہنے والی زندگی میں دائمی راحت و مسرت اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان کا ایمان خدائے تعالیٰ پر مضبوط ہو اور خدائے تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضامندی ہر چیز پر مقدم رکھی جائے۔ یہی عقل کا بھی تقاضا ہے اور اسی میں انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

پس جبکہ خدائے تعالےٰ کے ساتھ محبت کا تعلق تمام تعلقات سے بالاتر ہے تو انسان کی سعادت اسی میں ہے کہ وطن کی محبت کو رضائے الٰہی پر فائق اور غالب نہ رکھے عقلمند اور باخدا انسانوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا اور قدیم سے قدیم زمانے کے جو حالات معلوم ہو سکے ہیں ان میں باخدا لوگوں کے اس صحیح طرز عمل کی مثالیں موجود ملتی ہیں ابو الانبیا حضرت ابراہیمؑ کو محض خدا کے لئے اپنا وطن چھوڑنا پڑا حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے حالات میں بھی یہ چیز موجود ہے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگیوں میں بھی یہ ہجرت وطن موجود ہے، آنحضرت

محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی کو بھی محض لوجہ اللہ ہجرت اختیار کرنی پڑی ہندوستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ کرشن جی مہاراج کو برج کے سرسبز و شاداب وطن سے دوار کا میں جاکر سکونت اختیار کرنی پڑی۔ مہاراجہ رامچندر جی نے بھی چودہ سال تک وطن سے جدائی اختیار کی گوتم بدھ کو بھی یہی صورت پیش آئی ایراں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ شت دخشور زردشت نے بھی آذربائیجان کے علاقے سے بلخ میں ہجرت اختیار کی تھی۔ عہد آخر کے حالات میں بھی خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ علی ہجویری، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، خواجہ نصیر الدینؒ وغیرہ ہزار ہا مثالیں موجود ہیں کہ محض مصالح اُخروی اور رضائے الٰہی کے لئے لوگوں نے وطن اور محبت وطن پر لات ماری اور کوئی چیز زنجیر پا نہ ہوسکی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے خلاف بھی بیجا حبّ وطن کی مثالیں ہر زمانے میں موجود ملتی ہیں اور وہی بیجا حبّ قوم کی مثالیں بھی کہی جاسکتی ہیں۔ حبّ وطن کے بیجا جوش و خروش نے اخلاق فاضلہ کے برباد کرنے میں کمی نہیں کی۔ تعجب ہے کہ افلاطون جیسے یگانۂ روزگار حکیم نے حبّ وطن کے جوش میں اپنی کتاب نظام ریاست میں محض اس لئے کہ وطن پرستوں کی تعداد و قوت میں اضافہ ہو۔ تعلقات زوجیت اور شادی بیاہ کا ایسا شرم

انگیز طریقہ تجویز کیا جس کو انسانی شرافت کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی ارسطو کی کتاب ریاست بھی یونانی و غیر یونانی کے امتیاز پر مبنی نظر آتی ہے سسرو کہتا ہے کہ فضیلت اخلاق کا اعلیٰ ترین مرتبہ یہ ہے کہ انسان حبّ وطن کے جوش میں سب کچھ کر گزرے۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی دیدے، حالانکہ اس سے بڑھ کر بداخلاقی بلکہ حیوانیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان حبّ وطن کے جوش میں عدل کو ظلم سے تبدیل کر دے اور خدائے تعالیٰ کی محبت و عظمت کو فراموش کر دے لیکن اسی سسرو کی زبان سے ایک دوسرے موقع پر یہ سچی بات بھی نکل گئی ہے کہ "ہر انسان کو دوسرے انسان کا اس لئے ہمدرد ہونا چاہئے کہ وہ بھی انسان ہے۔ خواہ وہ کیسا ہی اجنبی کیوں نہ ہو" حکمائے یونان و اٹلی نے عموماً علم السیاست کی بنیاد بیجا وطن پرستی اور خلاف عدل حبّ وطن پر رکھی تھی۔ منوسمرتی اور چانکیہ کے قانون میں بھی یہی چیز موجود ہے مہ آبادی و زردشتی حکماء بھی اسی وطن پرستی کے مجوز نظر آتے ہیں۔

ہمارے اس موجودہ زمانے میں کہ تجارت کی وسعت ذرائع آمد و رفت کی افراط، سامان رسل و رسائل کی افزونی اور اخبارات کی کثرت کے سبب ساری دنیا ایک ملک اور ایک وطن کی حیثیت میں تبدیل ہو

چکی ہے یا ہو رہی ہے امتیاز وطنیت کو بہت کچھ برطرف اور کم ہو جانا چاہئے تھا مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ لوگوں نے وطنیت کے امتیاز کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر حب وطن کو حب الٰہی پر فضیلت دے رکھی ہے حالانکہ ساری زمین اور تمام ممالک کا حقیقی مالک خدائے تعالیٰ ہے اور تمام بنی نوع انسان خدا تعالیٰ ہی کے بندے ہیں۔

عالم انسانیت پر ضرور ایسا زمانہ گزرا ہے کہ اقوام و ممالک ایک دوسرے سے بے تعلق تھے اور وطن کی محبت خدائے تعالیٰ کی محبت کے مخالف نہ تھی اس زمانے میں حب وطن سب سے بہتر اور ضروری عقیدہ اور اپنے وطن کی فوقیت و برتری میں کوشاں ہونا حسن عمل ہوگا اور ممکن ہے کہ اس زمانے میں ایران کے رہنے والے کو پاک اور معزز اور ان کے مقابلے میں ہندوستان کے رہنے والوں کو چور اور ناپاک خیال کرتے ہیں اور ہندو آریہ ورت یا دیو بھومی کے رہنے والوں کو پاک اور دکن کے رہنے والوں کو ملیچھ اور دلسیو یعنی ناپاک سمجھنے میں یا سمندر کے سفر کو گناہ قرار دینے میں گنہگار نہ ہوتے ہوں اور یہی چیز نوع انسان کی سود و بہبود کا موجب ہو اور اسی میں رضائے الٰہی بھی شامل ہو لیکن اس موجودہ زمانے میں وطنیت کو جو اہمیت دی جا رہی ہے اور وطن پرستی و وطن دوستی کے نام پر لوگوں کو جس طرح فریب خوردہ بنایا جا رہا ہے یہ تو بلا خوف تردید

شیطانی عمل اور دھوکہ باز خود مطلب لوگوں کی کارستانی ہے۔ جس میں للّٰہیت اور خدا پرستی کا کہیں شائبہ تک بھی نہیں پایا جاتا جو لوگ سلطنتوں اور حکومتوں پر فائز، اور حقوق عوام کے غاصب اور عوام اور رعایا کو ہمیشہ اپنا غلام اور خدمت گزار بنائے رکھنے اور آپ حکومت وسرداری کے مزے اڑانے کے خواہاں ہیں انہوں نے اسی حبّ وطن کو سب سے زیادہ چلتا ہوا جادو محسوس کیا ہے اور اسی لیے اس سے کام لینے میں انتہائی طاقت وہمت صرف کی جارہی ہے جو لوگ حب وطن کے ڈھنڈورے پیٹتے ہیں ان کے دل میں عموماً حب الٰہی اور خدا ترسی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا اس حب وطن کے جادو کی ہمہ گیری نے نہ صرف عوام بلکہ علماء و فضلاء سب کو مسحور بنا رکھا ہے ہندوستان میں بھی آجکل یہ بیماری بہت ترقی کر رہی ہے یورپ کی تقلید میں افغانستان، ایران، چین، جاپان وغیرہ ممالک ایشیا میں جذبۂ وطنیت روز بروز جذبۂ قومیت پر غالب ہوتا جاتا ہے مذہبی پیشوا کہلانے والے بھی اسی سیلاب میں بہے چلے جارہے ہیں اور کم وبیش تمام دنیا جذبات وطنیت کی لعنت سے پُر ہوتی ہے ہر شخص اپنے اور اپنے وطن میں رہنے والے لوگوں کی صلاح وفلاح کو مقدم رکھنے میں دوسروں کو گھٹانا، ہٹانا، مٹانا، نقصان پہنچانا ثواب اور نیکی کا کام سمجھتا ہے اسی حب وطن کے نام پر جنگی ٹیکس باآسانی وصول ہو

جاتے اوراسی حب وطن کے نام پر دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کو برباد کرنے، دوسروں کے سامان آسایش پر قابض ہونے اور دوسروں پر ہر قسم کے مظالم روا رکھنے کے جواز کا فتویٰ حاصل ہو جاتا ہے۔ نہ صرف جواز بلکہ ان تمام ظالمانہ حرکات کو قابل تعریف اور موجب فخر بھی سمجھا جاتا ہے مدارس کی کتابوں میں عام صحبتوں اور مجلسوں میں تقریروں اور تحریروں میں، اخباروں اور تصنیفوں میں ہر جگہ حب الٰہی اور شفقت علیٰ خلق اللہ کا نام و نشان نہیں مگر حب وطن کی عزت وعظمت اور خوبی موجود ہے اور اس کی لے یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ بچپن سے سنتے سنتے حب وطن ایک ایسی مسلمہ اور ثابت شدہ حقیقت بن گئی ہے کہ کسی کو بھول کر بھی اس کا خیال نہیں آتا کہ آخر اس حب وطن اور حب خدا اور شفقت علیٰ خلق اللہ میں کوئی فرق مراتب بھی ہے یا نہیں ہر ایک ظالمانہ سے ظالمانہ فعل، ہر ایک بری سے بری حرکت اس حب وطن کے دامن میں پناہ لے کر ثواب، نیکی اور فخر کا کام بن جاتی ہے، اپنے وطن کی عزت اور بھلائی کے لئے دوسرے کے وطن پر حملہ کرنے والی اور دوسرے ملک کو خاک سیاہ بنا دینے والی فوج کا ہر ایک سپاہی مجاہد فی سبیل اللہ سمجھا جاتا ہے اور اس بات کا جواب طلب کرنا کہ دوسروں کو نقصان پہنچانا اور دوسروں کو اس طرح برباد کرنا آیا ضروری بھی تھا، یا

نہیں ؟ اور اس کے ضروری اور جائز ہونے کے کیا دلائل ہیں ؟ کوئی بھی ضروری نہیں جانتا اور اگر یہ فوج کشی ظالمانہ اور ناجائز بھی ثابت ہوجائے تو اس گناہ عظیم اور ظلم کو وطن پرست لوگ عموماً قابل نفرت اور قابل مواخذہ نہیں سمجھتے ؎

دست گلچیں قتل عام لالہ و گل مے کند
باغباں در پائے گلبن مست خواب افتادہ ہست

وطن پرستی کے اس طوفان نے صاحب حکومت، صاحب دولت اور صاحب اقتدار لوگوں کے اختیار و اقتدار کو ہر ملک میں محفوظ کر دیا ہے غاصبوں اور ظالموں کو یہ ایک زبردست امن مل گیا ہے اور وہ بآسانی محافظ وطن اور نگہبان قوم کے خطابات حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو اہل وطن کی نگاہوں میں محبوب بنائے ہوئے ہیں عوام کو اس قدر سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملتا اگر وطن پرستیوں کا یہ تصادم بر طرف ہو کر تمام اقوام و ممالک رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو جائیں، اور ساری زمین نوع انسان کا مشترکہ وطن قرار پا جائے تو کسی قوم اور کسی ملک کو دوسری قوم اور دوسرے ملک کے ہاتھوں برباد اور غارت ہونے کا اندیشہ نہ رہے اور نہ خود فوج کشیوں اور لڑائیوں میں مبتلا ہونے کی نوبت آئے اور اطمینان و سکون کے ساتھ نوع انسان اپنے

مفید اور راحت رساں مشاغل میں مصروف ہو سکے یہ اتحاد توحید باری تعالیٰ اور محبت الٰہی کے ذریعہ ہی قائم ہو سکتا ہے نوع انسان میں اتحاد اور مساوات کا قائم ہونا ممکن ہے لیکن یہ مساوات برسرِ حکومت لوگوں کو ان کی محبوب فرمانروائیوں اور دوسرے انسانوں کی غصب کی ہوئی چیزوں سے جدا کر کے بلندی سے پستی کی طرف لائیگی اور جو لوگ اپنے جائز مقام سے نیچے پستی میں دھکیل دیئے گئے ہیں۔ ان کو اونچا کر دے گی لہذا صاحب اقتدار طبقہ کو یہ انقلاب کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا اور وہ وطن پرستی کی حمایت میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگانے پر آمادہ ہیں لہذا بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ صاحب دولت اور صاحب اقتدار لوگ جو دنیوی زندگی کی دلچسپیوں پر فدا ہو رہے ہیں توحید الٰہی کے حقیقی دشمن، شرک کے حامی اور فساد و بد امنی کو دوست رکھنے والے اور مذہبی سلطنت کے سخت مخالف ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ دوستی وطن اس حد تک کہ تعظیم لامر اللہ اور شفقت علی الخلق اللہ اور محبت الٰہی کے مخالف نہ ہو ایک خوبی اور لازمہ انسانیت ہے لیکن ایمان باللہ کے بغیر ایک لعنت اور محبت الٰہی کی مد مقابل ہو کر اس دنیوی زندگی میں بھی کوئی راحت و آسائش نہیں پہنچا سکتی جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج کوئی

ملک اور قوم اپنی حالت پر قانع اور دوسری قوم دوسرے ملک کی حملہ آوریوں کے خطرے سے مطمئن نہیں ہے اور نامعقول وطن پرستی کے عام و تام ہونے کی حالت میں ہرگز کسی کو اطمینان میسر نہیں ہو سکتا۔ وطنی اور قومی سلطنتیں جب تک دنیا میں قائم ہیں عالم انسانیت میں عدل و مساوات و آزادی جو انسان کا فطری حق ہے قائم ہی نہیں ہوسکتا اور سلطنت انسان کو اس کے فطری حقوق نہیں دلا سکتی اس لئے کہ غیر ملک اور غیر قوم کے لوگ جو قومی و ملکی سلطنت کے ماتحت نہیں ہیں اس لئے دشمن ہیں کہ ان کو اپنی آزادی عزیز ہے اور وہ غیر ملکی اور غیر قومی لوگ جو محکوم و مغلوب ہو چکے ہیں اس لئے دشمن ہیں کہ ان کو اپنی ذلت و محکومی پسند نہیں۔ ایسی سلطنت کو فطری سلطنت کسی طرح بھی نہیں کہا جاسکتا۔

(مقتبس از "نظام سلطنت")